سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۲)

تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام

جس میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے پرسکون اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور تعلیماتِ اسلام کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دلائل و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرازیاں اسلامی تعلیمات ہی کے تدریجی آثار کا نتیجہ ہیں اس سلسلہ میں موجودہ تمدن کے انجام پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ کہ اسوقت کی ترقی یافتہ قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں پھر کسی تقریب سے جابجا ضمنی مباحث آگئے ہیں جن سے کتاب کی افادی حیثیت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے

تالیف

مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

"تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام"

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

دیباچہ

دورِ حاضر میں مادی تمدن کی چمک دمک اور ظاہری کرشمہ آرائیوں کے سراب نے دنیا کی نگاہوں کو اس درجہ فریب خوردہ بنا دیا ہے کہ حقیقت کی روشنی نہ صرف نگاہوں سے اوجھل ہو گئی بلکہ دنیا اُس سے بالکل مستغنی اور بےفکر ہی ہو بیٹھی ہے۔ قومیں اور حکومتیں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے آج اپنی بقاء و ترقی کا راز صرف ان ہی وسائل تمدن میں پوشیدہ سمجھنے لگی ہیں۔ اور مدنیت حاضرہ کی اس سطحی آب و تاب نے نہ صرف قوموں کی معاشرتی زندگی کو اپنے دامِ فریب کا شکار کر لیا ہے بلکہ وہ اُن کی ذہنیتوں کو بھی اپنا غلام بنا چکی ہے۔ یہاں تک کہ اس مادی زندگی کے سامنے وہ حیات روحانی جو دائمی لذتوں کا سرچشمہ اور ابدی منفعتوں کا سرمنشا تھی آج دنیا کے لیے قطعاً ناقابل التفات ہو چکی ہے۔

اوروں کو جانے دیجیے خود مسلمان جنھوں نے اپنے روحانی اور اخلاقی نظام کی حقیقی تاثیر اور آب و تاب سے دنیا کے تمام رسمی تمدنوں کی چاندنیاں پھیکی کر دی

تھیں۔ تمدن حاضر کی بکر چیا تدنی سے اُن کی نگاہیں بھی اس درجہ خیرہ ہو چکی ہیں کہ خود
اپنی صبح صادق کی روشنی کی طرف آنکھ اُٹھانے کی بھی اُن میں صلاحیت نہیں رہی
تمدن کے اس خانۂ رنگین پر اُن کی فریفتگی کی حد ہے کہ آج مسلم تصانیف اور اسلامی
مضامین میں کہیں ان تمدنی ایجادات اور سائنس کے حیرت انگیز کارناموں کو مدار
زندگی قرار دیا جا رہا ہے۔ کہیں ان وسائل معاش کو اسلامی مقاصد کا نچوڑ کہا جا رہا
ہے اور کہیں اسٹیم کی طاقت کے استعمال اور برقی آلات معیشت کو عین منشا خداوندی
اور مقصد قرآنی باور کرایا جا رہا ہے حتیٰ کہ بعض اصحاب کی غلامی، مرعوبیت اور فریب
خوردگی اس حد پر پہونچ چکی ہے کہ آج نہ صرف ان ظاہر آرائیوں کے سامنے
اسلامی ترقیات اور مسلمانوں کے روشن کارناموں کی اُن کے خیال میں کوئی
وقعت و عظمت ہی باقی نہ رہی۔ بلکہ اسلامی حقائق کو تحقیر آمیز عنوانات سے یاد کرنا
ہی گویا اُن کے نزدیک موجودہ ترقیات کی داد تحسین رہ گیا ہے ؂

نئی روشنی نے اندھیرے میں ڈالا غضب ہے کہ ظلمت کو سمجھے اُجالا

اندریں حالات ضرورت تھی کہ جو لوگ حقیقت کے پس پردہ رہ جانے سے
محض پردہ کے نقش و نگار میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں انھیں اس ورطۂ تاریکی سے نکال کر
حقیقت کا جمال جہاں آرا دکھلایا جائے اور پردوں کے رنگ آمیز دام فریب سے
رہائی دلا کر درون پردہ بارگاہ حقیقت میں باریاب کیا جائے یعنی عقل و نقل اور تجربہ
کی روشنی میں بتلایا جائے کہ اس مادی تمدن کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے ان

چمکتے ہوئے اور روشن آثار کی سنہری زنجیروں کی گرفت نے دنیا کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے؟ نیز خود اس تمدن کے عقیدتمندوں بلکہ موجدوں نے تجربوں کے بعد بالآخر اس کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے دنیا کی چار بڑی قوموں مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مسلمین کی قومی ذہنیتوں اور اُن کے طبعی اسباب و علل پر حکمۃ شرعیہ کے ماتحت تبصرہ کرتے ہوئے نتیجۃً یہ ثابت کیا ہے کہ ان تمام قوموں میں صرف دو ہی قومیں (مسلمان اور مسیحی) ہو سکتی تھیں جن کے ہاتھ ہمہ گیر ترقیات کا میدان لگنا چاہئے تھا۔ اور یہ کہ مسلمانوں کا دائمی مقابلہ اگر کسی سے ہے تو وہ صرف مسیحی اقوام ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دکھلایا گیا ہے کہ اُمت اسلامیہ اور اُمت نصرانیہ میں باہمی نسبت اور کاروباری توازن کیا ہے؟ اور ان دونوں میں سے حقیقی ترقی کس نے کی؟

اسی ذیل میں اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ نصرانی تمدن کا حقیقی تقابل صرف اسلامی تمدن سے ہے۔ اور یہ کہ آج کی تمدنی فکریات اور سائنٹفک ایجادات کو اسلام کے اخلاقی نظام سے کیا نسبت ہے؟ پھر یہ کہ ان میں سے کونسا نظام ہے جس میں دنیا کو امن و سکون کی زندگی میسر آسکتی ہے نیز واضح کیا گیا ہے کہ موجودہ تمدن کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ اور اسلامی نظام کس نتیجہ پر پہونچنے والا ہے؟ ان مباحث کو سامنے رکھکر اگر اس کتاب کو "فلسفۂ ذہنیت اقوام" کے عنوان سے بھی تعبیر کیا جائے تو بے محل نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ موضوع بحث بہت دقیق اور فلسفیانہ ہے اور اُس کی

فکری پہلو نہایت پُر پیچ ہیں۔ موقع نہ تھا کہ مجھ جیسا کم سواد طالب علم اس دشوار گذار وادی میں قدم رکھے۔ اور وہ بھی سارے زمانہ کے خلاف تمدن کی انتہائی ترقیوں کے بالمقابل۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ تحریر میرے ذہن کی کسی ارادی اور فکری کاوش کا نتیجہ نہیں۔ میں اپنے فکر نارسا سے بھی واقف ہوں اور اپنی ناقص استعداد سے بھی ارادہ و فکر سے اس موضوع کی چند سطریں بھی میرے بس کی نہیں تھیں حقیقت یہ ہے کہ ذہن نارسا میں مضمون کی اس نوعیت کا وُرود جس نہج سے ہوا میں نے اسی نہج پر سپردِ قلم کر دیا۔ اس لئے یہ جو کچھ بھی ہے میرا کچھ نہیں ہے۔ ہاں جو کچھ جادۂ صواب سے ہٹا ہوا نظر آئے وہ یقیناً میرے نفس کی لغزش ہے جس کے لئے اہل کرم سے سامحت واصلاح کی توقع رکھتا ہوں۔ اور مؤدبانہ دعاءِ صلاح و فلاح کا ملتجی ہوں۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا   ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہوا۔ ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

العبد الضعیف المہین

محمد طیب غفرلہٗ ولوالدیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

غرۂ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیمات اسلام

اور

مسیحی اقوام

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

کوئی انسان پیدائشی طور پر کمالات کا مالک نہیں

اس ظلمتکدۂ سفلی میں خیر و خوبی کی جو شعاع بھی کہیں نظر آتی ہے خواہ وہ انبیاء کے کمالات ہوں یا اولیاء و صلحاء کے حکماء کے ہوں یا فلاسفروں کے سب عطاء خداوندی ہے۔ کوئی انسان اپنی ذات سے حکمت و کمال کا مالک نہیں بنایا گیا کہ بطن مادر سے ہنر اور حکمت لیکر آیا ہو۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ کسی انسانی فرد پر عالم ازل ہی میں نگاہ انتخاب ڈال لی گئی ہو اور اُس میں فطرۃً کمالات کے لیسے قوٰی ودیعت رکھدیئے گئے ہوں کہ وہ بلا کسی کسب و مجاہدہ کے ابتداء ہی سے اُن درجات کمال کی بام رفیع پر عروج کر جائے اور ایک مافوق العادۃ طریقہ پر اپنے اقران و امثال سے بازی لے جائے۔ لیکن اس وہب و کسب کے فرق سے کمالات کے عطاء الٰہی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں فرق ہے تو صرف یہ کہ کسی کو کمالات بذیل اسباب عطاء کئے جاتے ہیں اور کسی کو بلا توسط اسباب بیکدم بام کمالات کی سب سے اُونچی چوٹی پر

فائز کردیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ہر صورت میں بے غبار رہتا ہے کہ عالم میں تمام کمالات عطاء خداوندی ہیں اور انسان اپنی ذات سے کسی ہنر اور کمال کا مالک بنکر نہیں آیا۔

کمالات کے مختلف اور اہل کمال کے متفاوت ہونیکی ایک واضح مثال

لیکن انسانی کمالات اور دنیا کی باکمال ہستیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمالات کی انواع مختلف اور اہل کمال کے درجات متفاوت ہیں کسی میں حسن و جمال ہے تو کسی میں فضل و کمال کسی میں زور و قدرت ہے تو کسی میں عقل و فراست کسی میں جود و سخاوت ہے تو کسی میں زہد و قناعت کسی میں ایثار و تواضع ہے تو کسی میں وقار و تمکنت۔ غرض کمالات کی بے انتہاء انواع اور خوبیوں کی بے تعداد شانیں ہیں جو خدا کی فیاض حکمت نے اپنے بندوں میں حسب استعداد تقسیم فرمائی ہیں اس صورت حال کو سامنے رکھکر خدا اور اس کے باکمال بندوں کی مثال اس طرح سمجھو کہ کسی جامع فنون استاد کے پاس مختلف فنون کے طالب آئیں اور جدا جدا فن میں فیضیاب ہو کر اپنے اپنے کمالات دکھلائیں یہ بات خود ان شاگردوں کے آثار و احوال سے کھل جائیگی کہ یہ شخص کونسے فن میں استاد مذکور کا شاگرد ہے اگر اس شاگرد سے فیض منقول جاری ہے۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ فن منقول میں استاد مذکور کا شاگرد ہے اور اگر فیض معقول جاری ہے تو کہا جائیگا کہ اس نے استاذ موصوف سے تخیلات کا استفادہ کیا ہے۔ گر بیماروں کا علاج کرتا ہے تو استفادہ طب کا پتہ چلیگا۔ اور اگر شاعرانہ نغز نوائی کرتا ہے تو تحصیل شعر و سخن کا سراغ نکلیگا غرض ان شاگردوں کے احوال و آثار خود بتلادیں گے کہ استاذ کے کونسے کمال نے ان میں ظہور کیا ہے؟

انبیاء علیہم السلام تلامیذ حق ہیں اور ان کی مختلف شانیں

انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے اولین تلامذہ ہیں جن کی تعلیم و تربیت براہ راست بارگاہ صمدیت سے کی جاتی ہے اور پھر انہی کے واسطے سے

انسانی دائرہ علم و فضل سے آشنا اور مستفید ہوتا ہے اُن کے گوناگوں کمالات و کرامات پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو تمام انبیا علیہم السّلام میں ساری ہی صفاتِ کمال اپنے اپنے درجہ میں جامعیّت کے ساتھ موجود ہیں پر ہر ایک نبی کے کمالات کا ایک مخصوص رنگ اور اُس کی پاکباز زندگی کی ایک نئی شان ہے جو اُسے دُوسرے انبیاء علیہم السلام سے ممتاز کر رہی ہے۔ کسی کی نبوّت سطوت و شوکت اور سلطنت و حکومت کی قباءیں نمایاں ہوئی اور کسی کی درویشی اور فقر و فاقہ کی کملی میں کسی میں جاہ و جلال کا ظہور ہے اور کسی میں محبوبیت و جمال کا کسی نے خلوت و انقطاع کی صورتوں میں اعلان حق کیا ہے اور کسی نے جلوتوں اور تعلقات کی کثرت میں بنی نوع کی تربیت کی ہے۔ غرض تمام صفات کمال کی جامعیّت کے باوجود ہر نبی میں کوئی ایک صفت ضرور غالب رہی ہے۔ جو اس کے لئے مابہ الامتیاز بنی رہی ہے اور جبکہ اُن کی تمام صفاتِ کمال عطار حق اور صفاتِ ربانی کا پرتوہ ہیں تو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ ہر نبی کے لئے اصل منبع فیض کوئی خاص صفتِ ربّانی ہوئی ہے جس کے ماتحت اُس نبی کے افعال و اعمال اور خصوصیات اخلاق نے تربیت پائی ہے رہی اُس صفت کی تشخیص و تعیین کہ یہ نبی خداوند حکیم کی کونسی صفت سے مستفید ہے اور اُس کی کونسی شان اِس نبی کی مقدس زندگی میں ظہور کر رہی ہے؟ سو یہ خود اُس مقدس طبقے کے آثار اور کاروبار سے ہویدا ہو جاتی ہے۔

ابراہیم علیہ السّلام کی مخصوص شان قدوسیت و سلامیت ہے	مثلاً انبیاء اُولوالعزم میں ابراہیم علیہ السّلام کے حالات و معجزات کو سامنے لانے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنکی ہر ہر شان میں حق تعالیٰ کی صفت قدوس و سلام

ظہور کر رہی ہے جس کا حاصل آفت ظاہر و باطن اور عیوب و نقائص سے منزہ اور مبرا رہنا ہی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام میں تقدس اور سلامتی کا یہ عالم ہے کہ باطن تو ہر عیب و شر اور آفت و مصیبت سے مبرا ہے ہی ظاہر سے بھی کوئی بیرونی آفت و مصیبت ذاتِ اقدس تک آنا چاہتی ہے تو پاس نہیں پھٹک سکتی یا پاس آجاتی ہے تو باقی نہیں رہ سکتی اور باقی رہ جاتی ہے تو ہزاروں خیرات و برکات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے جس سے ذاتِ مقدس کے حق میں کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی آفت کا کارگر نہیں ہوتا۔ گویا بجائے اس کے کہ وہ ذات پر غالب آتی خود ذات کی خیر اُسے مغلوب کر دیتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام آتش نمرود میں ڈالے جاتے ہیں آگ کی آفت ذات تک رسائی پا لیتی ہے لیکن دفعتاً ہی آتشیں مصیبت، بردو سلام بن جاتی ہے اور ذات اقدس اسی طرح منزہ رہتی ہے۔

ذبح ولد کا حکم پہونچتا ہے اور چھری لیکر بیٹے کو ذبح کرنے بیٹھ جاتے ہیں جو شفقت پدری کے لحاظ سے ایک عظیم الشان مصیبت ہے لیکن عین وقت پر چھری کند کر دی جاتی ہے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ ایک جنتی مینڈھے کی قربانی سے دیدیا جاتا ہے۔

مکہ کی بے آب و گیاہ وادیوں میں بیوی اور نوزائیدہ بچہ (اسمٰعیل علیہ السلام) کو تنہا چھوڑ کر چلے جانے کا حکم ملتا ہے اور چلدیتے ہیں جو حقیقتاً معیشت منزلی کے لئے ایک بھاری آزمائش اور شدید ترین مصیبت ہے۔ لیکن زن و دنوں بیکسوں زچہ بچہ کی قدرتی سلامتی کے ساتھ ساتھ یہی مصیبت، کتنے ہی شرعی اور تکوینی انعامات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ کہیں ہاجرہ علیہا السلام کی خود فردہ بھاگ دوڑ سے سعی صفا مروہ کا شرعی حکم قائم ہوتا ہے۔ کہیں اس

بے مونس میدان کی تشنہ لبی ہی چاہ زمزم کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور کہیں ان مقدس ہستیوں کی یہ بے خانمانی خانۂ خدا کی تعمیر اور اُس کے ارد گرد ایک مقدس شہر (بلد امین) کی عمارت کا وسیلہ قرار پاتی ہے۔

غرض آفات و ابتلا آت آلِ ابراہیم کے ارد گرد ہجوم کرکے آتے ہیں مگر شانِ مبتلیٰ یہ ہے کہ پاس نہیں پھٹکتے اور آبھی پہنچتے ہیں تو اُن میں سے مصیبت ہونے کی شان نکل جاتی ہے بلکہ چند در چند نعمتوں اور کرامتوں کا منبع بنجاتے ہیں جس سے خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی میں اللہ کی شانِ قدوسیت و سلامیت جلوہ گر تھی اور وہ اسی اسم پاک کا مظہر اتم تھے اسلئے اُن تک کسی ظاہری و باطنی برائی کا پہنچنا ہی محال تھا یا پہنچکر برائی کا باقی رہنا ناممکن تھا۔

یا مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی پاک زندگی کے مختلف کارنامے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں اللہ کی شان تقلیب و تبدیل جلوہ گر تھی یعنی مالک الملک	موسیٰ علیہ السلام کی مخصوص شان تقلیب و تبدیل انواع ہے

کی یہی شان ہے کہ وہ لیل کو نہار میں اور نہار کو لیل میں تبدیل فرماتا رہتا ہے یُقَلِّبُ اللّٰہُ اللَّیْلَ وَالنَّہَارَ۔ یا سیئات کو حسنات بنا دیتا ہے فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ یا قلوب بنی آدم کو کفر سے ایمان کی طرف اور ایمان سے کفر کی طرف پلٹ دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ بقولے حدیث۔

اَلْقُلُوْبُ بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ یُصَرِّفُہَا کَیْفَ یَشَآءُ۔ بنی آدم کے دل رحمان کے قبضۂ قدرت میں ہیں جس طرح چاہتا ہے اُن میں تصرف کرتا ہے۔

اُس کی یہی شان تبدیل نوع بنوع بہ انداز تقلیب اشیاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات و حالات اور عام کاروبار میں غالب نظر آتی ہے۔

عصائے موسوی کو دیکھو تو کبھی سانپ بن جاتا ہے اور کبھی لاٹھی۔ ظاہر ہے کہ لکڑی کا سانپ ہو جانا۔ نباتات کی نوع سے نکل کر حیوانات کی نوع میں چلا جاتا ہے جو ایک نوعی تبدیلی ہے۔ اسی طرح عصا کے آثار کو دیکھو تو وہاں بھی یہی انقلاب نوع بہ نوع نمایاں ہے یہی عصا جب ایک پتھر پر پڑتا ہے تو اُس کی زیر تہہ خاک کو بہتے ہوئے چشمے بنا دیتا ہے اور وہی عصا جب ایک مَوجزن دریا پر مارا جاتا ہے تو اُس کے بہتے ہوئے پانی کو جامد سڑکوں کی صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خاک کی نوع کو جس کی اصلیت جمود و کثافت ہے پانی کی نوع کی طرف منتقل کر دینا جس کی اصلیت سیلان و لطافت ہے یا بالعکس وہی تبدیل نوع بہ نوع اور تقلیب ماہیت ہے۔

یدِ بیضا کو دیکھو کہ گریبان موسوی سے باہر ہے تو ایک گوشت پوست کا ہاتھ ہے جس میں مادی کثافت موجود ہے لیکن وہی ہاتھ جب گریبان میں ڈالکر نکالا جاتا ہے تو اُس سے سورج کی سی روشنی عالم میں پھیلنے لگتی ہے ظاہر ہے کہ یہ عنصریات کا علویات کی نوع میں منتقل ہو جانا وہی نوعی تبدیلی اور ایک زبردست انقلاب ماہیت ہے۔

غرض موسیٰ علیہ السلام کے کاروبار اور کمالات و کرامات میں اللہ کی شانِ تقلیب اور صفتِ تبدیل کی کارفرمائی ہے اور یہی اسم پاک اُنکا مربّی ہوا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصی شان مصوّری اور جان بخشی ہے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کمالات اور عام حالات پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلیگا کہ اُن کی حیات طیبہ میں اللہ کی شانِ مصوّری اور صفتِ اِجبار جلوہ فرما ہے۔ ہر کمال میں تصویر سازی اور جان آفرینی

کی رُوح موڑتی نظر آتی ہے۔

پرندوں کی ہیئت بنانا اور قُم باذن اللہ کہکر ہوا میں اُڑا دینا۔ مدفون مردوں کو اللہ کے نام پر پکارنا اور زندہ کر کے قبر سے اُٹھانا۔ مایوس حیات مریضوں پر ہاتھ پھیرنا اور بھلا چنگا کر کے کھڑا کر دینا۔ مادر زاد اندھوں کو نگاہ مسیحائی سے دیکھنا اور سوانکھا بنا دینا۔ مبروص کو لانا اور صاف جلد کر دینا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام معجزات میں مصوّری و صورت سازی۔ صورت آرائی حسنی زیبائش اور پھر انہی صورتوں کے مناسب اُن میں جان بخشی اور حیات آفرینی کا پورا پورا مظاہرہ ہے۔ کہیں صورت سازی ہی خود فرما کر اُس صورت کو حیات سے متحرک کیا ہے۔ جیسے پرندہ کی ہیئت بنانے سے واضح ہے کہیں بنی بنائی صورت کو جان بخشی سے آراستہ کر کے اُس میں حس و احساس کی خوبی پیدا کی ہے جیسے مُردہ کو زندہ کرنے سے نمایاں ہے کہیں زندہ پیکروں میں ہیئت کے بگاڑ کو درست کر کے تزئین ہیئت کی ہے۔ جیسے اندھے پن کو دور کر کے چہرے کی خوبی اور برص کو دُور کر کے جلد کی خوبصورتی کو واپس لے لینے سے ہویدا ہے۔ غرض اس نوع کے تمام معجزات کا خلاصہ مادی نمائش کی خوبی اور حسی خوبصورتی کا ابقاء وارتقاء نکلتا ہے اور ظاہر ہے کہ صورت کا تعلق جسم اور مادہ سے ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تمام کار فرمائی مادہ و صورت اور اُسی کی مادی جاں بخشی تک محدود نکلتی ہے اور نمایاں ہو جاتا ہے کہ اُن کی پاک زندگی اللہ کی صفت مصوّر اور صفت محیی کا مظہر اتم تھی۔

حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص شان علم و حکمت ہے

اب اس پاک سلسلہ کی سب سے آخری کڑی اور قصر نبوّت کی سب سے آخری خشت جس نے ابدی طور پر قصر نبوّت کو مکمل کر دیا یعنی حضرت

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی اور آپ کے اقوال و اعمال اور حق ملت و احوال پر نگاہ ڈالو تو ذاتِ اقدس کے احوال و آثار اور امتیازی کاروبار خود شہادت دینے لگے کہ آپ کی ہر ہر شان میں علم و معرفت ادراک و بصیرت کشف و انجلاء اور وقوف و باخبری کی کارفرمائی ہے جو چیز سامنے لاکر رکھی علم و حکمت سے لبریز جو اصول پیش کئے وہ داناؤں کا خزانہ ہر حکم خود ہی مستقل علم اور سینکڑوں علوم تک پہنچا دینے کا راستہ جس سے علم کی کتنی ہی منزلیں دکھائی دیں۔ احکام کی جامعیت یہ کہ جہاں ان سے حاکمانہ جلال ٹپکتا ہے جہاں مربیانہ شفقت ٹپکتی ہے وہیں مدبرانہ حکمت بھی برس رہی ہے جس حکم شرعی کو دیکھو کسی نہ کسی علت و حکمت پر مبنی ہر نقل کے باطن میں عقل پوشیدہ اور ہر باطن کے غیب میں اسرار مکنون ہیں ہر جزئی میں کلی مستور اور ہر کلی ہزارہا جزئیات کا مخزن۔ پھر تعلیل احکام میں وہ ہمہ گیری کہ قیامت تک نئے سے نئے پیش آنیوالے حوادث اُن سے باہر نہوں اور جزئیات میں وہ تشخص کہ اس کا دقیق سے دقیق پہلو بھی ممتاز اسقدر نمایاں کہ بے تکلف عمل کے دائرہ میں لایا جاسکے جزئیات کو اصول سے وہ ارتباط کہ ہر جزئیہ کسی نہ کسی نوع سے منسلک ہر نوع کسی نہ کسی جنس کے ماتحت اور ہر جنس کسی نہ کسی صفتِ الٰہی سے وابستہ اور کلیات میں وہ انبساط کہ جزئیات سے لبریز ہو کر نشر جزئیات کیلئے چھلکی پڑتی ہیں۔ غرض ساری شریعت منظم اور اس درجہ منظم کہ اہل بصیرت کے سامنے تمام جزئیات کلیات کی طرف سمٹتی ہوئی نظر آتی ہیں اور تمام کلیات جزئیات کی طرف پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شریعت کو اوپر سے نیچے تک علم نے گھیر رکھا ہے اور ساری ہی شریعت کو علم مجسم بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ کا سب سے بڑا اور دائمی معجزہ ہی علمی ہے جو قرآن کریم کی صورت میں ۱۱۴ سورتیں ہی بڑے سے بڑے

چیلنجوں کے ساتھ اُمت کے سامنے جلوہ فرما ہے اور قیامت تک انہی تحدّیوں کے ساتھ اپنا اعجاز دکھاتا رہیگا۔ کوئی حکمت و دانائی کی بات نہیں جو اس میں معجزانہ طریق پر موجود نہو۔ انسانی زندگی کا کوئی کھلا اور چھپا ہوا شعبہ ایسا نہیں جس کے شائستہ بنانیکا نہایت مکمل اور ناقابل ترمیم دستور العمل اس میں نہ پیش کیا گیا ہو۔ قوانینِ دیانت، آئینِ سیاست، دستورِ ملکی، تدبیرِ منزل، تہذیبِ نفس، علوم معاش و معاد، اخبارِ امم، اسبابِ عروج و زوالِ اقوام، پند و مواعظ، عبر و امثال، حِکَم و اسرار، قصصِ ملوک، سوانح انبیاء وغیرہ کچھ ایسے بے نظیر عنوانوں کیساتھ اس کتابِ مبین میں پیش کئے گئے ہیں کہ دُنیا کے عقلاء و علماء وہاں تک پہونچنے سے تھک گئے فصیحوں اور بلیغوں نے سپر ڈالدیئے اور بالآخر قرآن کی بلاغت بیانی نے اُن ذہنیتوں کو فتح کر لیا۔

اُدھر قرآن کی اوّلین تفسیر و شرح یعنی حضرت اعلم الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی ہدایات جو فن حدیث کے دائرہ میں مدوّن شدہ اُمت کے سامنے ہیں پیش نظر رکھو تو آپکی علمی شان کا اور واضح اندازہ ہوگا کہ وہ ماضی اور مستقبل کے مہمات پر کس طرح چھائی ہوئی ہے آپکے علم محکم نے ادھر تو ماضی کے وہ سر بستہ راز آشکارا کر دیئے جنہیں چشم تاریخ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گذشتہ اقوام کی تاریخیں اور مقبول و مردود قوموں کی عبرتناک داستانیں کچھ ایسی جامعیت اور ایجاز بیانی سے پیش کی ہیں کہ اُن سے واقعات الگ منکشف ہوتے ہیں فلسفۂ تاریخ جُدا کھلتا ہے احکام اور فلسفۂ احکام پر جُدا روشنی پڑتی ہے اور ماضی سے مستقبل کے متعلق عملی پروگرام مرتب ہو کر الگ سامنے آجاتا ہے۔ مستقبل کے واقعات لو تو قیامت تک کے وہ اہم حوادث جن کو اُمت کی کسی ہدایت و ضلالت کا تعلق تھا اتنی تفصیل کیساتھ پیش فرمائے کہ ایک جویائے علم

ماضی کے دائرہ میں رہ کر سارے مستقبل سے باخبر اور دنیا میں رہتے ہوئے ختم دنیا تک کے سارے ہی اہم حالات سے واقف ہو جائے۔ آنے والے فتنوں کی خبریں فتنہ پردازوں کے اسماء اور حالات کی تفصیل۔ اُمّت میں تیس دجالوں کی فساد انگیزی، گمراہ کن لیکچراروں کی کثرت، خطباء کا بڑھ جانا اور فقہاء کا کم ہو جانا، اُمت مرحومہ کا غیر اقوام کی پیروی کرنا پھر مجددانِ دین کی بشارت اُن کی فتوحات، خلافت و سلطنت کا چند قریشی لڑکوں کے ہاتھ پر تباہ ہو جانا، خلافت نبوت کی مدّة بقاء، خلفاء راشدین کی شہادت کی خبریں، اسلامی سلطنت کے انقلابات، خوارج کا خروج، روافض کی تعدیاں، یاجوج ماجوج کا پھیلنا، دجّال اعظم کا خروج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور اُمّت کے عام مذہبی اور سیاسی جزر و مد کی پیشنگوئیاں ایسے کھلے لفظوں میں فرمائیں کہ گویا علماء کی نظروں میں یہ آنے والے واقعات ابھی گذر رہے ہیں اور گویا پوری اُمت اپنے سارے مستقبل کو حال بنائے بیٹھی ہے۔ خبر کے بعد انشاء کے میدان میں آؤ تو احکام معاش و معاد کا وہ جامع پروگرام پیش کیا در ایسی لطیف و خفیف عبادتوں کی تعلیم فرمائی کہ ضعیف سے ضعیف انسان کیلئے خدارسی سہل ہو گئی، عادۃً عبادت ہو گئی تدین ہی کے راستہ سے تمدن کے فوائد ہاتھ لگنے لگے۔ بندے اور خدا کے درمیان تعلقات کے اتنے پہلو کھولے کہ ابتک کسی اُمّت پر واشگاف نہوئے تھے مکارم اخلاق کے دقائق کھولے۔ محاسن اعمال کے حقائق واضح کئے۔ عجائب احوال کے الوان نمایاں کئے غرض احکام دین جامعیت، سہولت، برکت اور ساتھ ہی عمل کی خفت اور اجر کی کثرت کے لحاظ سے ایسے عمیق علوم کا پتہ دے رہے ہیں جنکی گہرائی ابتک ناشناسا۔ ورنارسیدہ تھی اور یہ انوکھے لطائف و معارف ایک کھلی دلیل ہیں کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر شان علم وحکمت کا خزانہ اور

عقل و دانائی کا مخزن تھی۔ اور آپ کی ذات مقدس اللہ کی صفت عَلِیم و خَبِیر کی بارگاہ میں باریاب تھی یعنی اسم عَلِیۡمٌ و خَبِیۡرٌ آپ کا مربّی تھا اس لئے آپ پر علم کے تمام مراتب بھی ختم ہو گئے اور آپ کی غالب شان علم و حکمت ثابت ہوئی۔

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ۔

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں اُن ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھکر سناتا اور اُنکو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں۔

حضور کے عملی معجزات عدد و عُدد میں معجزات سابقین سے بدرجہا فائق ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو قرآن کا علمی معجزہ دیکر وہ عملی معجزات اور خوارق عطا نہیں ہوئے جو انبیاء سابقین کو دئے گئے نہیں بلکہ عملی معجزات کے دائرہ میں بھی وہ خوارق عطا ہوئے جو عدد کے لحاظ سے بھی خوارق انبیاء سے زائد ہیں اور اپنی باطنی خصوصیات کے لحاظ سے بھی معجزات انبیاء علیہم السّلام پر بدرجہا فائق ہیں اگر عصاء موسوی کی بدولت پتھر سے چشمے بہے۔ تو آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے جاری ہوئے اگر موسیٰ علیہ السّلام کو ید بیضا دیا گیا تو آپ کے صحابہ کی انگلیوں سے اندھیرے جنگلوں میں روشنی ہوئی اگر عیسیٰ علیہ السلام کی بدولت انسانی لاشیں زندہ ہوئیں تو آپ کی برکت صحبت سے کھجور کے تنے زندہ ہو کر انسانوں کی طرح بولنے لگے۔

اگر حضرت یوشع ابن نون کی خاطر آفتاب روکا گیا تو آپ کی انگشت مبارک کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

اگر حضرت داؤدؑ کے زمزمے سننے کیلئے جانور اکٹھے ہوتے تھے تو آپکو شجر و حجر سلام کرتے تھے۔

غرض جس نوع کے علمی معجزے حضرات انبیاء سابقین کو عطا ہوئے اس نوع میں ہزار ہا درجہ بڑھ چڑھ کر آپ کو بھی عطا ہوئے اور ان معجزات کا شمار بیان سے باہر ہے جو آپ ہی کو مخصوص طریقہ پر دئیے گئے۔ مثلاً قلیل مقدار کھانا جو ایک دو کو بھی مشکل سے کفایت کرے ہزاروں کیلئے کافی ہو کر بچ رہنا۔ کنکریوں کا دست مبارک میں تسبیح پڑھنا۔ جانوروں کا علی الاعلان فصاحتِ کلام کے ساتھ شہادتِ رسالت دینا۔

لیکن ہمیں اس مختصر تحریر میں معجزاتِ نبویؐ کی نوعیت یا اُن کی خصوصیت پر بحث کرنا نہیں موضوع بحث صرف یہ ہے کہ کونسی صفت ربانی کس نبی کی مربی رہی ہے اور شئون الٰہیہ میں سے کونسی شانِ غلبہ کے ساتھ کس نبی کی زندگی پر چھائی رہی ہے اس لئے ہم صرف اُس شانِ الٰہی سے بحث کرتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال۔ اعمال۔ احوال۔ مقامات اور عام کیفیات زندگی پر حاوی تھی اور وہ صفت علم، حکمت، خبر، بصیرت کی تھی جس سے آپ کی معرفت دائرۂ خلق میں انتہاء کو پہونچی ہوئی تھی اور آپ پر نازل شدہ کتاب (قرآن) علم و حکمت میں تمام کتب سابقہ پر بازی لے گئی۔

اُوتیت علم الاولین والاٰخرین۔	مجھے اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے
علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی۔	میں اور میرے متبع کامل اذعان و بصیرت رکھتے ہیں۔
لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین۔	نہ کوئی تر اور خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں
ونزلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شئ	اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام باتوں کا بیان کرنیوالا ہے اور
وھدی ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین	خاص مسلمانوں کیلئے بڑی رحمت اور خوشخبری سنانیوالا ہے

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فوقیت وفضیلت تمام انبیاء علیہم السلام پر

بہر حال یہ واضح ہوگیا کہ آپ کی مربی اللہ کی صفت علم ہے اور آپ بارگاہ علمی میں باریاب ہیں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ تمام انبیاء علیہم السلام پر فائق اور درجات میں سب سے بڑھکر ہیں کیونکہ علم تمام صفت کمال میں نہ صرف برتر اور اونچی صفت ہے بلکہ ایسی چوٹی کی صفت ہے کہ بقیہ تمام صفات کمال مثل ارادہ۔ قدرت۔ کلام نیز تمام صفات، فعال وغیرہ اپنی کارگذاری میں علم کی محتاج ہیں پر علم اپنی کارفرمائی میں کسی صفت کا محتاج نہیں کون نہیں جانتا کہ ارادہ و قدرت وغیرہ بغیر علم کسی کام کے نہیں۔ روٹی کھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو پہلے یہ جانکر کہ یہ روٹی ہے پتھر نہیں۔ پانی کا قصد کرتے ہیں تو پہلے یہ معلوم کرکے کہ یہ پانی ہے شراب نہیں اور یہ جان لینا ہی علم ہے۔ پس روٹی کھانا اور کھانے کا ارادہ کرنا اور پھر کھانے کی قدرت کو عمل میں لانا روٹی کے علم صحیح پر موقوف ہے۔ لیکن روٹی کو روٹی جاننا اور پانی کو پانی سمجھنا ارادہ و قدرت پر موقوف نہیں۔ اگر روٹی یا پانی سامنے سے گذر جائے تو بلا ارادہ و اختیار بھی آدمی اُسے لامحالہ روٹی اور پانی ہی سمجھیگا یہ نہیں کہ روٹی سمجھنے کا ارادہ کرے تب تو روٹی سمجھے ورنہ پتھر سمجھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ علم کو اپنی کارفرمائی میں کسی صفت کی حاجت نہیں اور باقی تمام صفات علم بغیر بیکار ہیں۔ پس علم تمام صفات میں اول بھی نکلا اور اول درجہ کی صفت بھی ثابت ہو۔ اس لئے یہ باور کرلینا کچھ دشوار نہیں کہ جو نبی اللہ کی صفت علم کا پروردہ اور شان علمی و خبیری سے تربیت یافتہ ہو وہ اُن تمام انبیاء علیہم السلام پر فائق بھی ہوگا جو حق تعالیٰ کی دوسری شانوں سے مستفید ہیں اور ساتھ ہی دوسرے اہل کمال تو اُس کے محتاج ہوں گے پر وہ کسی کا محتاج نہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم خاتم الکمالات ثابت ہوا تو اس کا بنایا ہوا نبی خاتم النبیین

بھی ہوگا کہ اس پر تمام مراتب کمالات ختم ہوں گے۔ پس ایسا جامع اور خاتم نبی اگر سب کے آخر میں لایا جائے اور وہ پچھلوں کے شرائع میں تصرف کرکے ان میں اپنے کمال علم سے ترمیم و تنسیخ بھی کرے اور اضافہ و بیشی بھی کرے اور اس پر تمام ارباب شرائع پہلے ہی سے اپنی رضا کا اظہار کردیں تو کونسی جائے تعجب ہے؟ بلکہ فطرۃ کا تقاضہ ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

حضورؐ جامع کمالات سابقین تھے | بہرحال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر باوجود جامع کمالات ہونے کے کسی ایک صفت ربانی کا امتیازی شان کیساتھ غلبہ رہا ہے اور انہوں نے اسی مخصوص صفت و شان سے اپنی اپنی اُمتوں کی تربیت کی ہے ابراہیم علیہ السلام میں تنزہ کی شان غالب تھی کہ ہر ظاہری و باطنی آفت و عیب سے ذات مبرا رہتی تھی اور ذات اقدس کے بچاؤ اور حمایت کے لئے تمام قوائے عالم ہر وقت کمربستہ تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کی شان تھی کہ خود بجکر مختلف انواع میں تبدیل و تقلیب کا تصرف کردینا اور موجود شدہ، نواع میں ایک کو دوسری کی طرف پلٹ دینا۔

عیسیٰ علیہ السلام کی شان تھی کہ مستقل انواع ہی کو خود بنا لینا مادہ میں تصرف کرکے ہیکلیں تیار کرنا اور ان میں جان ڈالدینا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی شان تھی کہ کمال علم و معرفۃ اور دانائی سے ہر نوع کو اُس کی حد کمال پر پہونچا دینا اور ہر نوع کے مناسب حال اس کی تربیت کرنا۔

اس علمی تربیت عامہ کے لحاظ سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام انواع کا علم اور ان کے اوصاف و خواص کی معرفت عامہ آپ کو حاصل ہو وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ علم چونکہ جامع صفاتِ ہی

اس لئے آپ کی شان تربیت میں سارے ہی انبیاء کی شانیں جمع ہوں۔ اور اپنے علم کامل کی روشنی میں آپ تمام شانوں سے مختلف انواع میں ان کی استعدادوں کے مطابق مربیانہ تصرف فرمائیں اور مختلف حالات میں ان شانوں سے ظاہر ہوں۔ کہیں تنزہ ابراہیمی سے کام لیں کہیں تقلیب موسوی کو استعمال فرمائیں اور کہیں احیاء عیسوی کو بروئے کار لائیں۔ مثلاً تنزہ ابراہیمی کا رنگ تو یہ ہے کہ ذات اقدس نبوی تک اول تو کوئی شر و آفت پہونچتی ہی نہیں ہجرت کے موقع پر آدھی شب میں ہجرت کرائی جاتی ہے جس میں کفار مکہ قتل نبوی کی آخری اور حتمی تدبیر کر لیتے ہیں غار ثور میں مکڑی کے جال کا پردہ ذات اقدس کا بچاؤ کرتا ہے جبکہ متلاشی غار کے منفذوں کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں سراقہ ابن مالک گھوڑے سمیت زمین میں دھنسنے لگتا ہے جبکہ اس مہاجر مقدس کا سراغ لگا کر آپہونچتا ہے اور کفار مکہ کو حضور کی خبر دینے کیلئے واپسی کا قصد کرتا ہے۔ غرض شر اور آفات اُمنڈ اُمنڈ کر آتے ہیں اور پاس نہیں پھٹک سکتے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اور اگر ترک وطن کی مصیبت ہجرت کی صورت میں آہی جاتی ہے تو یہ ہجرت ہزارہا خیرات و برکات اور فتوحات کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور ان خیرات سے کتنے ہی سعید ازلی ایمان قبول کر لیتے ہیں گویا اس شان ابراہیمی کے ماتحت حضور کتنوں ہی کی روحانی تربیت و تکمیل فرما دیتے ہیں۔

پھر جب ذات اقدس میں شان موسوی یعنی تبدیل و تقلیب ظہور کرتی ہے تو عصاء موسوی کی طرح کھجور کا ایک خشک تنہ نوع نبات سے نکل کر نوع حیوان کی طرف منتقل ہوتا ہے زندوں کی سی حرکات اُس میں ظاہر ہوتی ہیں اور نہ صرف حیوانی حرکات ہی کرتا ہے بلکہ اُس کی زندگی انسانوں اور کامل انسانوں کی زندگی کو بھی مات دینے لگتی ہے کہ فراق نبوی میں عالم و عارف انسانوں

کی طرح روشن ہے جھلکتا ہے ٹپکتا ہے اور اِس شان کے ماتحت کتنے ہی انسانوں کو ایمان کی دولت نصیب ہو جاتی ہے گویا شانِ موسوی جب ذاتِ محمدی میں جلوہ گر ہوتی ہے تو کمالِ علم و معرفت کے ساتھ ہوتی ہے اور تربیتِ عالم کا زبردست ذریعہ بنجاتی ہے۔

پھر اِس ذاتِ مقدس میں جب شانِ عیسوی آتی ہے تو نہ صرف انسانوں بلکہ جمادات کو بھی زندگی عطا کر دیتی ہے اور نہ صرف حیات بلکہ حیاتِ جاوید دیتی ہے دستِ مبارک میں کنکریاں آتی ہیں تو تسبیح پڑھتی ہیں۔ مرثیے اپنا نشان بتلاتے ہیں گویا صرف اِحیاءِ موتٰی ہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ موتٰی کی وہ تعلیم بھی ہے کہ وہ معرفتِ الٰہیہ سے لبریز ہو کر اُس کا نام بھی لینا شروع کر دیں اور پھر یہ شان کتنے ہی تشنگانِ ہدایت کیلئے ذریعہ ہدایت ہو کر تربیتِ ایمانی کا موجب بنجاتی ہے۔

غرض علم جامعِ صفات تھا تو شانِ اقدس بھی جامعِ شئون تھی کہ بارگاہِ علمی سے تکمیل یافتہ تھی اِس لئے تمام انبیاء علیہم السّلام کے تمام کمالات کو آپ کی ذاتِ اقدس نے خود ہی جذب کر لیا اور اپنے ذاتی علوم و معرفت سے اُن کی چمک کو اور دوبالا کر دیا۔

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ہر اُمت کی ذہنیت اپنے نبی کی ذہنیت کا عکس و پرتو ہوتی ہے۔

اِس قدر واضح ہو جانے کے بعد اب یہ حقیقت بھی سہولت سے واضح ہو جائے گی کہ جس نبی کی جو شان غالب ہو گی اُسی شان کا غلبہ اُسکی اُمت میں بھی ہو گا۔ اور جس رنگ کی ذہنیت مقتدائے اعظم کی ہو گی وہی رنگ اُس ساری ملت کی ذہنیت میں رچا ہوا ہو گا۔ بالفاظِ دیگر رسولِ برحق اللہ کی جس صفت سے خصوصی استفادہ کرتا ہے اُسی صفتِ غالبہ سے وہ اپنی اُمت کو افادہ بھی کرتا ہے۔ اور اُمت کی مجموعی ذہنیت نبی کی ذہنیت کا عکس اور پرتو ہوتی ہے

قومِ ابراہیم کے اعمال میں بھی شانِ تنزہ غالب ہے

اگر ابراہیم علیہ السلام پر شانِ سلامتیت وتنزہ (بچاؤ اور حرز و احتراز) کا غلبہ تھا تو اُن کی اُمت مشرکین مکہ یا براہمہ (ہنود مشرکین وغیرہ) میں بھی یہی رنگ چھایا ہوا ہے گو اُس رنگ کو اُنہوں نے ناجائز طریق پر استعمال کیا اور از راہ توہمات پڑ گئے بچاؤ کی صورت اختیار کرنا شگون بد ہوگیا تو اُس راستہ سے ہٹ گئے۔ سفر میں جاتے وقت کوا اُڑتا ہوا سامنے آگیا تو وہیں سفر ملتوی کر دیا کسی توہم یا حادثہ سے ڈرے تو ایام میں نحوست مان لی اور اُس دن امور سے کرنے سے رُک گئے ہر کام کرنے سے پیشتر فال اور ٹوٹکے کرنا تاکہ احتمالی مضرت سے سابقہ نہ پڑ جائے بات بات پر کھٹکنا اور خوفزدہ ہو کر بچاؤ کے حیلے اختیار کرنا۔ عملیات۔ تعویذات اور سحر وغیرہ سے بچاؤ سوچنے میں غلو اور انہماک رکھنا۔ عناصر سے ڈرنا اور آگ پانی وغیرہ کو اوتار مانکر اُن سے اپنی خیر مانگنا۔ اُن کے خوش رکھنے کیلئے حیلے نکالنا تاکہ اُن کے شر سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح ہر وہمی اور احتمالی مضرت سے بچاؤ کی کوشش کرنا۔ کوئی نئی بات سامنے آگئی تو وہیں اپنی فکر دامنگیر ہو گئی۔ کوئی عجیب چیز کھل گئی تو وہیں ڈر کر اُسے ڈنڈوت کرنی شروع کر دی۔ بتوں سے اپنی خیر مانگنا۔ عناصر سے پناہ مانگنا۔ سادھوؤں کے سامنے ہاتھ جوڑنا۔ ہیاکل کے ذریعہ دفع ضرر کرنا۔ وہمیات سے خوفزدہ رہنا وغیرہ وہی تنزہ اور بچاؤ کی شان کا مسخ شدہ مظاہرہ ہے گویا صرف بچاؤ اور دفع مضرت یا احتیاط کا جذبہ تو رہ گیا اور اُس کی وہ ابراہیمی حقیقت گم ہوگئی جس سے یہ بچاؤ حقیقی تقدس اور تنزہ ثابت ہوتا تھا بلکہ یہ تنزہ کی ذہنیت ہی اُن کی انواع شرک کا حقیقی سبب ہوئی ہے جبکہ اُس میں سے اصلیت گم ہو گئی اُس کی حدود نا شناختہ ہو گئیں اور صرف تنزہی ذہنیت باقی رہ گئی جو مربیٔ اول کی ذہنیت کا ثمرہ تھی۔

قوم موسیٰ کے خیال و احوال میں بھی شان تقلیب ہی کا غلبہ تھا

اسی طرح اگر موسیٰ علیہ السلام میں مثلاً شان تقلیب انواع اور تبدیل ماہیات کی شان کا غلبہ تھا تو یہود کی حرکات وسکنات میں بھی اُس شان کی جھلک موجود رہی گو انہوں نے اپنے نبی کی طرح اس شان کو بجائے صحیح اور جائز مصرف میں استعمال کرنے کے باطل اور ناحق مصرف میں صرف کیا۔

یہود پر مردار کی چربی کا استعمال حرام کیا گیا تھا حکم تھا کہ لَا تَأْكُلُوْا شُحُوْمَهَا مردار کی چربی مت کھاؤ۔ اُنہوں نے چربی کو پگھلا کر بیچ لیا اور اس کے درم کھانے شروع کر دیئے۔ اور کہا کہ دیکھو ہم نے چربی کہاں کھائی؟ پس چربی کی نوع زر و مال کی نوع میں منتقل کر کے کھانے کا جواز نکالنا ہی تقلیب نوع بنوع کی شان رکھتا ہے۔ مگر اُسے اطاعت کیلئے استعمال نہیں کیا بلکہ بغاوت کے لیئے کیونکہ چربی کا استعمال مطلقاً حرام کیا گیا تھا نہ کہ صرف بصورت چربی ہی اُسکا کھانا حرام تھا یا مثلاً یہود پر یوم سبت میں مچھلی کا شکار حرام کیا گیا اور آزمائش و ابتلاء کے طور پر یوم سبت ہی میں منجانب اللہ مچھلیوں کی برآمد اس قدر افراط کیساتھ ہونے لگی کہ دریا کے تمام کنارے مچھلیوں سے پر ہو جاتے تھے۔ یہود نے گڑھے کھود کر یوم سبت میں تو مچھلیوں کو اُن میں جمع کرنا شروع کیا اور دوسرے ایام میں اُنکا شکار کرنا شروع کر دیا اور کہا دیکھو ہم نے یوم سبت میں مچھلیوں کا شکار کہاں کیا؟ بلکہ اُن کو جمع کیا ہے۔ اور یہ شکار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم الٰہی کے مفہوم کی تغییر تھی اور ساتھ ہی اپنے عمل سے شکار کو جمع کی نوع میں منتقل کر کے ہی تبدیل نوع بہ نوع کا استعمال تھا۔ حالانکہ حکم الٰہی کا مقصد اُس دن سرے سے مچھلیوں کا شغل ہی روکنا تھا خواہ وہ شکار سے ہو یا اُن کو گھیر لینے سے۔ درانحالیکہ یہ گڑھوں میں جمع کر لینا بھی شکار ہی کیلئے تھا۔ پھر یہود کا مچھلیاں جمع کر کے یہ کہنا کہ ہم نے آج شکار نہیں کیا محض فریب

اور دھوکا دہی تھی پس پہلی صورت میں اگر ماکول میں تبدیل نوع کی گئی تھی تو اس صورت میں مفہوم میں تقلیب کی شان قائم تھی۔

اسی طرح نیل سے پار ہوکر یہود اگر بت پرستی میں مبتلا ہوئے تو اسی شان تقلیب کی بدولت سامری نے قوم سے سونا چاندی جمع کرکے اُس سے ایک بچھڑا تیار کیا اور پھر اُس میں ایک مخصوص خاک کی پوڑیہ کے ذریعہ (جو اسپ جبرئیل کے سموں کے نیچے کی خاک تھی جس کا اثر حیات آفرینی تھا) روح حیوانی پھونکدی جس سے یہ بچھڑا بولنے اور حرکت کرنے لگا گویا سونے چاندی کو گؤسالہ کی صورت میں تبدیل کیا اور پھر اس جماد گؤ کو حیوان گؤ کی نوع میں منقلب کردیا جس سے قوم مفتوں ہوکر لگی اُسے خدا سمجھنے اور پُوجا پاٹ کرنے گویا مخلوق کو خالق کی جہت میں تبدیل کردیا پس یہاں بھی وہی تبدیل نوع بہ نوع کی شان کھلے طور پر موجود تھی اور یہود کا اسلام سے کفر کی طرف ارتداد خود اُن کے اندر تبدیل نوع بہ نوع کا مظاہرہ تھا ہاں اس شان تقلیب کو جو ایک صفت ربانی تھی یہود نے کسی جگہ بھی خیر میں استعمال نہیں کیا، جو شان موسوی تھی بلکہ تقریباً ہر جگہ بے محل اور ناجائز طریق پر استعمال کیا اور اپنی نفسانی خواہشات کا آلہ کار بنایا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قوم موسیٰ پر جس قدر مصائب اور سماوی عذاب آئے بکثرت اسی شان تقلیب اور تبدیل نوعی کے رنگ میں نازل ہوئے ہیں۔ فرعون اور قبطیوں کے واسطے پانی کا خون بنجانا۔ اُن کے بدن کے روئیں روئیں کا جوؤں کی شکل میں تبدیل ہوجانا۔ اُن کے سامانوں کا مینڈکوں کی صورت اختیار کرلینا۔ اُن کے غرق کیلئے نیل کے جامد ہوجانے کے بعد سیال اور بہتا ہوا کردیا جانا۔ پھر یہود کے مستکبروں کے سروں پر جامد پہاڑ کا حیوان پرندوں کی طرح متحرک بناکر

لاغر کیا جاتا۔ یوم سبت کی بے ہمتی پر انہیں انسانوں سے بندر بنا دیا جانا وغیرہ ایسے مصائب و آفات ہیں کہ سب میں وہی تبدیلی نوع بہ نوع کا رنگ صاف نظر آرہا ہے کہیں ایک جامد نوع سے بدل دیا گیا ہے کہیں جامد کو حیوان کی نوع میں منتقل کیا گیا ہے کہیں ایک شرف حیوان کو ارذل حیوان کی صورت میں پلٹ دیا گیا ہے غرض قوم کے عمل اور جزائے عمل انعام و انتقام اور مہر و قہر میں یہی صفت تقلیب سرایت ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ ان کے مربیٔ اعظم کی شان غالب بھی یہی صفت تقلیب تھی۔

قوم عیسیٰ علیہ السلام کے قول و عمل میں تصویری و ایجادی شان غالب ہے

اسی اصول کے ماتحت چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان غالب مصوری اور احیاء اجسام تھی اور اسی شان کے ماتحت انہوں نے اپنی اُمّت کی تربیت کی اس لئے اُمّت مسیحیہ کی ذہنیت بھی اسی تصویر سازی اور ایجاد اجسام کی طرف چلی۔ آج عیسائی اقوام کی ساری ذہنی طاقتیں مادّیات کی صورتیں بنانے نئی سے نئی ہیئت اختراع کرنے اور ہر سامان کے نئے سے نئے نمونے اور ڈیزائن تیار کرنے میں مصروف نظر آرہی ہیں بلکہ صورت سازی کے اس فن کو اس درجہ پر پہنچا دیا گیا ہے کہ آج مسیحی سلطنتوں کی بنیادیں ہی اس تصویر سازی اور صورت آرائی کی تجارتوں پر قائم ہیں۔ غور کرو تو عیسائی اقوام کی اس حکمت عملی میں عیسوی ذہنیت کے وہی دو اُصول کارفرما ہیں مادّیات کی ہیئتیں بنانا اور پھر ان کی شان کے مناسب انہیں زندگی کی روح پھونکنا۔

ہیئت سازی

اگر حضرت مسیح علیہ السلام پرندوں کی شکلیں بنا کر اُڑا دیتے تھے تو یہ ٹین کے پرندے اور کھلونے بنا کر انہیں اسپرنگ کی رُوح سے اُچھلتا کودتا بنا رہے ہیں۔ اور دوڑتی ہوئی ریل اور اُڑتی ہوئی جہاز دکھا

ہیئت کے پرندے تیار کرکے پٹرول گیس کی طاقت سے انہیں ہواؤں میں اُڑا رہے ہیں۔

احیاء | اگر انہوں نے مردہ لاشوں کو زندہ کیا تو انہوں نے لوہے کے پتلے تیار کرکے اُن میں برقی رووڑا دی کہ وہ یورپ و امریکہ کے ہوٹلوں میں بجلی کا ایک سوئچ دبانے سے زندہ انسانوں کی طرح کام کاج کرتے پھر رہے ہیں بھاری بھاری انجنوں اور مشینوں میں اسٹیم کی روح پھونک کر انہیں دوڑتا بھاگتا بنا دیا۔ تیل کی روح سے بھاری بھاری موٹروں کو دوڑا دیا۔ اگر انہوں نے بے جان لاشوں کو روح پھونک کر بلوا دیا تھا تو انہوں نے گراموفون کے ریکارڈوں کو ایک سوئی کے ذریعہ بولتا اور گاتا ہوا کر دیا۔

تزئین ہیئات | اگر انہوں نے مایوس العلاج مریضوں، اندھوں اور مبروصوں کو اچھا کر دینے کی باذن الٰہی گارنٹی کی تو آج کے دور میں عیسائیوں کی طرف سے بھی مریضوں کی شفا بخشی کے اعلان و اشتہار پروپیگنڈوں اور گارنٹیوں کی کوئی انتہا نہیں کوئی صحت کی گارنٹی دے رہا ہے کسی ہسپتال کے اشتہار میں اندھوں کے اعادہ بصارت کی گارنٹی کی جا رہی ہے کہیں ازالہ برص کی شرطیہ دوائیں شائع کرکے صفائی جلد کی گارنٹی کی جا رہی ہے کوئی ڈاکٹر اعادہ شباب کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ کوئی عمر بڑھا دینے کی تدابیر شائع کر رہا ہے حتیٰ کہ بعض مہمل فلاسفرانہ قسمت شناس ڈاکٹر احیاء موتیٰ پر بھی غور کر رہے ہیں پس کہیں ایجاد حیات کا ادعا ہے اور ایجاد مراتب حیات کا دعویٰ اور یہ سب حضرت مسیح علیہ السلام کی اسی شفا کارانہ اور احیائی قوت کا نمائشی مظاہرہ ہے جو بطور معجزہ آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی۔

ایجاد | اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام نے معجزانہ طریق پر مادیات سے پرندوں کی ہیئتیں اور جاندار

کی تصویریں بنائی تھیں تاکہ انہیں پیٹھ پیچھے بت پرستی کے لیے کھڑا کر دیں تو وہی تصویری ذہنیت مسیحی امت میں بھی نمایاں ہوئی۔ اور اس درجہ افراط کے ساتھ کہ آج صورت آرائی صورت پرستی کا درجہ اختیار کر چکی ہے مادیات کے نئے نئے ایجادات اور تصویری جدتوں نے چشم دنیا کو غرق حیرت کر دیا ہے۔ بھاری بھاری مادوں کو موم کی طرح پگھلا کر ان سے کیسی عجیب و غریب شکلوں کی مشینیں، ورکیسی نئی نئی صورتوں کے سامان ایجاد کیے جا رہے ہیں۔ لوہے لکڑی اور پیتل کے خوبصورت اسباب راحت بدن کے نئے نئے وسائل مثلاً تیز رو سواریاں، ریل، موٹر، آگبوٹ اور ہوائی جہاز وغیرہ خبر رسانی کے عجیب عجیب آلات۔ ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور وائرلیس تکثیر اشاعت کے ذرائع مطابع اور پریس وغیرہ۔ انعکاس صور و اشکال کے وسائل فوٹوگراف کیمرے۔ برقی روشنی اور زرق برق سامانوں کی اختراعات۔ نظر فریب متحرک تصاویر اور ان کی بول چال مادی ایجادات کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں کہ عالم رنگ و بو اور جہان صورت ورو اس ایجادی پیداوار پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔

تصویر ایجاد کے بعد تصویر اور صورت سازی کو لو تو آج تصویر سازی فنون لطیفہ میں داخل ہو کر انکا طغرائے امتیاز ہو چکی ہے تصویروں اور مجسموں نے بازاروں اور درباروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ فوٹو سازی کیلئے مشینیں ہیں اُس کی اشاعت کے لئے بلاک ہیں اور پھر تصویر بینی یا تصویر نمائی کیلئے لاکھوں روپیہ کی بلڈنگیں۔ ہسپتال ہیں۔ سینما ہال محض اس لئے لاکھوں روپیہ کھینچ رہے ہیں کہ چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں دکھلائیں کوئی شہر شہر نہیں جب تک کہ اُس میں سینما کی متعدد سر بفلک عمارتیں کھڑی ہوئی نہ ہوں۔ آج مسیحی اقوام کی فکریات سے تصویریں متحرک بھی ہیں بول بھی رہی ہیں اور گانی ناچتی بھی ہیں اور شب کے ملاح تصویر ساز اپنی اصل کو چھوڑ کر

اپنی ہی نقل پر اس قدر فریفتہ ہو چکے ہیں کہ اپنے قلب و دماغ کی ساری کائنات نقالوں کے حوالے کر کے خود کورے ہوتے جاتے ہیں۔

پھر تصویر کی فتوحات دیکھو تو سکہ اور تمغہ پر تصویر ٹکٹ اور اسٹامپ پر تصویر۔ چاقو اور ہتھیار پر تصویر۔ دوات و قلم پر تصویر۔ پنسل اور نب پر تصویر۔ کپڑے اور برتن پر تصویر۔ اخبار و رسائل کے صفحات پر تصویر۔ کاغذوں کے جگر میں تصویر۔ آتشبازی کی شعلہ باریوں میں تصویر۔ گھڑی اور چین پر تصویر۔ اسٹیشنری کا ہر سامان مصور۔ کتابیں مصور۔ طرز تعلیم مصور۔ مکانوں کی زینت تصویر۔ پردوں کی آرائش تصویر۔ اور بالآخر ہر شے کی صورت پر اس کی تصویر۔ گویا شے محض اپنی صورت سے نہیں پہچانی جاسکتی جب تک کہ اس کی بھی ترجمان یہ مصنوعی تصویریں نہ بنیں۔ غرض تمدن کے جس گوشہ پر نگاہ ڈالو صورت پسندی اور تصویر آرائی کا تسلط و اقتدار نظر آئیگا۔ خود اصلی انسان کی وہ عظمت نہیں ہے جو اس کی بناوٹی صورت کی ہے۔ اور اس نقالی پر قوم کی قوم ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ حتیٰ کہ (حسب بیان اخبار وحدت دہلی ۳ اپریل ۱۹۳۶ء)

"آج تصاویر اور فوٹوگرافی کے شوقین کیمروں اور ان کے لوازمات پر پندرہ کروڑ روپیہ صرف کر رہے ہیں۔"

تصویری جدت پھر اس صورت آرائی کیساتھ صورتوں میں جدت طرازی کا یہ عالم ہے کہ یکساں ہی شے نوبہ نو شکلوں اور نوع بہ نوع صورتوں کا لباس ہر روز بدلتی رہتی ہے ہر ہر استعمالی سامان کے خوشنما نمونوں اور مختلف الالوان صورتوں کی اس قدر کثرت ہے کہ غالباً انسانی سامانوں کی ایسی بنت نئی صورتیں کبھی بھی چشم فلک نے نہ دیکھی ہوں گی۔ آج ہزار ہا اشیاء کی خریداری محض

اُن کے مختلف نمونوں اور صورتوں کی بدولت ہو رہی ہے۔ مکانات کا سلسلہ لو تو انجنیروں کا طبقہ محض کوٹھی بنگلوں کے نئے نئے نمونے نکالنے میں لگا ہوا ہے ہر جدید بلڈنگ اپنے رنگ و رُوپ کے لحاظ سے قدیم کو شرمائے دیتی ہے۔

فرنیچر کو لو تو محض میز کرسی اور الماری وغیرہ کی نئی سے نئی شکل ایجاد کرنے کیلئے بڑے بڑے کارخانے کام میں مشغول نظر آرہے ہیں۔

ملبوسات کو دیکھو تو خوشرنگی خوش وضعی اور نقش و نگار کے سلسلہ میں نباتات حیوانات اور جمادات کا کوئی نقشہ اور رنگ ایسا باقی نہیں رہا جو کپڑے کی سطح پر یا اُس کی بناوٹ میں نمایاں نہ کیا گیا ہو۔ لباسی فیشن دیکھو تو لباسی صورتوں کی جدت اس درجہ غالب آچکی ہے کہ روزانہ نہ صرف نئے نئے فیشن نکالکر پیکر آرائی کی نمائش کرتے رہتے ہیں بلکہ بدنی سنگار اور خوش لباسی کا کوئی عقلی احتمال ایسا نہیں رہا جو واقعات کی صورت اختیار نہ کر چکا ہو حتیٰ کہ تقلیل لباس کی صورتوں میں عریانی تک کی آرائش بھی واقعہ بن چکی ہے۔

لباس کی سلائی اور فیشن کے اختراعات کا یہ عالم ہے کہ اُس کیلئے لاکھوں کے سرمایہ کی مستقل کمپنیاں قائم ہیں۔ رینکن کمپنی جس کا ہیڈ آفس انگلستان میں ہے اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اُس کی شاخیں ہیں اور امرائے ہندوستان میں سے کتنے ہی ہیں جو اُس کے لاکھوں کے قرضدار ہیں محض سلائی اور خیاطی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اسکا نظام ایک مستقل حکومتی نظام کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ بیلر نگ شاپوں کو جو کمپنیوں کی صورتیں ہیں چھوڑ دو انگلینڈ میں محض ایک ڈیزائنر جو نئے ڈیزائن کے کپڑوں کا محض خاکہ اُتارتا ہے سالانہ ڈیڑھ لاکھ پونڈ کما لیتا ہے۔

(وحدت اخبار ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء)۔

ماکولات کو تو موجدوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے کتنے ہی کارخانوں کے ساتھ انہی کی تشکیل و تصویر میں لگا ہوا ہے۔ بسکٹ روٹی اور مٹھائیاں نازک مشینوں کے ذریعہ عجیب عجیب صورتوں کا لباس پہن رہی ہیں۔ کیک پیسٹری گلدستوں اور پرندوں کی شکل میں ڈھالے جا رہے ہیں بڑی بڑی کمپنیاں محض اسلئے قائم ہیں کہ ماکولات کی ان نئی نئی شکلوں سے ان کی تجارت کو فروغ دیں نارٹن کمپنی اور اس جیسی اور کمپنیاں اسی مہم کی سرانجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

مشروبات کے سلسلہ میں پانیوں، اور شربتوں کو دیکھو تو عمدالوان اور رنگ برنگ کے شیشے دوکانوں پر جاذب نگاہ نظر آئیں گے حتیٰ کہ ان کھانے پینے کی اشیاء کو میزوں پر خوشنما ہیئت اور خوبصورت نقشوں کے ساتھ چننے اور اس طرح سجانے کیلئے کہ کوئی میز باغ و بہار نظر آئے کوئی عظیم الشان بلڈنگ اور کوئی پرندوں کا عجائب خانہ مستقل علوم ہیں تعلیمی اسکول ہیں بھاری بھاری اجرتیں ہیں اور مستقل اسٹاف کام کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تمدنی سامانوں کے رد و قبول کا معیار آج ضرورت و عدم ضرورت نہیں بلکہ محض خوشنمائی یا بدنمائی رہگیا ہے ہر نئی وضع کا سامان قابل قبول ہے اگرچہ غیر ضروری ہو اور ہر قدیم وضع یا سادہ شے ناقابل قبول ہے اگرچہ ضرورت اور راحت کی ہو۔

پھر ان سامانوں کے پیکنگ اور اس کی خوشنمائی اصل سامان سے بھی زیادہ قیمتی و قابل توجہ سمجھی جاتی ہے کہ شے کی پہلی نمائش اس کا پیکنگ ہی ہے۔ ایک معمولی غذا یا دوا یا کھلونے اور رہائشی سامان کیلئے اس کا ڈبہ یا بندھن یا کاغذی اور آہنی تھیلی کی خوشنمائی پر بعض دفعہ اسقدر

لاگت لگائی جاتی ہے کہ اصل سامان سے وسائل قیمتی ثابت ہوتے ہیں اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مضمون ہو جاتا ہے غرض قوم کی قوم اسباب تمدن اور مادیات کی نئی سے نئی شکلیں تجویز کرنے میں اپنی تمام ذہنی قابلیتوں کے ساتھ اس درجہ لگی ہوئی ہے کہ صورتوں کے جو نمونے سنہ حال میں رواج پکڑتے ہیں سنہ آئندہ میں اُن کی صورتوں کی جدت، پچھلے ڈیزائن کو ناقابل التفات بنا دیتی ہے۔

اقوال و ہیئات میں صورت آرائی

سامانوں کو چھوڑ کر اس قوم کی قولی اور عملی زندگی دیکھو تو وہی صورت آرائی اور جدت طرازی کی جھلک اُسمیں بھی قائم ہے۔ لفظی خوش ادائی بہت کچھ اور نیچے حقیقت کا نشان نہیں۔ لفظی ہمدردیاں بہت زیادہ مگر قلبی ہمدردی کم نہ زیادہ۔ کلام میں تصنع بناوٹ اور عبارت آرائی کی کمی نہیں لیکن بے تکلف اور حقیقت خیز کلام کا کہیں وجود نہیں۔ بناوٹی عمل اور اس کے ساتھ دکھلاوا بے حد لیکن حقیقی اور مخلصانہ سادگی عمل عنقا۔ رسمی اخلاق اور بناوٹی تبسم کی انتہا نہیں لیکن حقیقی طلاقت وجہ خندہ روئی جس میں قلبی شفقت کی جلوہ گری ہو یکسر مفقود۔ ظاہر بن جائے گو باطن اُجڑ جائے۔ ظاہری صفائی ہر چیز میں نمایاں رہے گو حقیقی طہارت کا کوئی شمہ بھی نہ ہو۔ غرض اس قوم کی ساری زندگی نمود۔ صورت آرائی۔ اختراع۔ نمائش اور دکھلاوے کی حرکات سے پُر ہے۔ اور اس کے ردّ و قبول کا معیار محض صورت و رسم ہے نہ کہ حقیقت و اصلیت۔

اُمت مسیحی کی جس پرستی اور اُس کی چند مثالیں۔

تھی کہ اس صورت پسند ذہنیت کے ماتحت یہ اُمت اس درجہ حسیات و تصویرات کی خوگر ہوئی کہ اب اگر اس کے سامنے کلیات بھی پیش کی جائیں تو وہ انہیں بھی صورتوں

اشکال کی تمنی رہکر مشاہدہ ہی کی خواستگار ہوتی ہے۔ قلبی امور تلاؤ تو ماننے کے بجائے دیکھنے کے خواہشمند الٰہیات کے انوار پیش کرو تو ان میں بھی حسی دید کے طالب۔ حتیٰ کہ کلی الکلیات اور جامع الجوامع ذات بابرکات حق کو بھی اگر وہ ماننے کیلئے تیار ہوتے ہیں تو اسی شرط پر کہ اسکی کوئی صورت سامنے کرکے ان کو آنکھوں سے مشاہدہ کرادیا جائے۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً — ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے یہانتک ہم دیکھ لیں کو کھلا طور پر

اسکو کی منکر خدا انجمن کی بنیاد بھی اسی نظریہ پر ڈالی گئی ہے کہ خدا ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟ گویا ان کے نزدیک کسی چیز کے ہونیکے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے دکھلائی بھی دے۔ اسی نظریہ کے ماتحت ان خفیف العقول کے نزدیک شاید ہوا بھی معدوم ہوگی کہ آجتک نظر نہیں آئی۔ روح بھی معدوم ہوگی کہ آنکھ کو اس پر دسترس نہیں۔ کیفیات نفسانیہ مثل بھوک پیاس اور حظ و کرب بھی سب اس لئے معدوم ہیں کہ آنکھ کے احاطہ سے بالاتر ہیں حتیٰ کہ اگر کسی وقت انکا کوئی بھائی بند یا سامان ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو اسے بھی اسدم معدوم ہی سمجھنا چاہیئے کہ نگاہ سے اوجھل ہے۔ یا للعجب۔ افسوس کہ ہوشمندوں کو صور و اشکال کے انہماک نے آنکھوں کا اس درجہ غلام بنادیا ہے کہ عقل و فراست کے کوچہ ہی سے نابلد اور معنویات و حقائق سے کلیۃً بے بہرہ ہو کر رہگئے۔

اُمت نصرانیہ کیفیت کے بجائے کمیت کی دلدادہ ہے

اسی طرح عموماً تمام حقائق غیبیہ اور اعتقادات حقہ مبدأ و معاد جنت و نار۔ ملائکہ و جنات۔ لوح و قلم۔ وقائع قبر و حشر۔ یا خارق عادت واقعات معجزات و کرامات وغیرہ سے محض اس لئے انکار کر بیٹھے ہیں کہ وہ سردست ان کی آنکھوں سے

غائب ہیں اور اُن کی کوئی شکل وصورت سامنے نہیں۔

غرض جہاں بھی صورت وشکل کا دخل نہ ہوگا خواہ وہ علوم ہوں یا کلّیات معقولات ہوں یا غیبیات اُمّتِ مسیحیہ وہاں کھڑی نظر نہ آئے گی۔

وہ سب سے زیادہ اپنے نفس کے قائل اور دلدادہ ہیں اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ قریب اور بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اور سب سے زیادہ بعید حق تعالیٰ سے ہیں کہ وہ حقیقی طور پر سب سے زیادہ غائب اور غیب الغیب ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ اس خود بینی کے سبب خود غرضی اور خود مطلبی کے جال میں بھی سب سے زیادہ یہی اُمّت گھری ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قومی خود غرضی عصبیت اور حمیت جاہلیت پر منتج ہوتی ہے۔ اور پھر اس تعصب کے مختلف قدرتی معیار وطنیت نسل اور لون وغیرہ کی طرف متعصب طبیعت خود بخود چل پڑتی ہے۔ اس لئے تعصب وطنیت نسلیت اور لون و رنگ وغیرہ کے خود مطلبانہ جال میں بھی سب سے زیادہ یہی صورت پرست اُمّت پھنسی ہوئی ہے اور اس طرح گرفتار ہے کہ گویا تعصب و وطنیت اس کا مایۂ امتیاز شعار ہے۔ مثلاً ہندوستان میں جو حقوق ایک یورپین کے تسلیم کئے گئے ہیں وہ کسی ہندوستانی کے نہیں ہو سکتے اس لئے کہ وہ یورپین نہیں۔ بلکہ ایک یورپین کے جو حقوق یورپ میں پیدا ہونے پر مانے گئے ہیں وہ کسی یورپین کے ہندوستان میں پیدا ہونے پر نہیں ہیں اس لئے کہ مولد و منشا کے لحاظ سے وطنیت کمزور پڑ گئی۔ یورپینوں کے کوٹھی بنگلوں کے ساتھ خواہ وہ ہندوستانی جھونپڑے نہیں کھڑے رہ سکتے کہ ان میں سفید فام قومیت کی سکونت نہیں۔ یورپین کلب گھروں میں ہندوستانی بیاسا شریک کی حیثیت سے نہیں گھس سکتا۔

کہ وہ غیر قومیّت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ آج جذبات وطنیت کے تحت پورا ہندوستان اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ وہ یورپ کی تجارتوں کی ایک منڈی ہے جس سے ہندوستانیوں کا خون چوسکر یورپین اقوام کے رخساے سُرخ کر دئے جانے کے سوا اور کوئی غرض وابستہ نہیں چنانچہ آج ایک ہندوستانی کی یومیہ آمدنی کا اوسطاً فی کس پڑتا ہے اور ایک یورپین کی یومیہ آمدنی بیٹھتی ہے۔

پھر جبکہ یہ بے اعتدالیاں عملی ہی نہیں بلکہ آئین کا پیرایہ لئے ہوئے ہیں تو اس سے بڑھکر تعصّب اور قومی خودغرضی کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے کہ تعصّب اور معیار وطنیت و نسلیت خود ایک مستقل قانون بنجائے؟ اور اُسے وجہ نازش بناکر استعمال کیا جائے؟

ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم شخصی اور قومی خودغرضی کا شکار بنجائیگی اور اُس میں حُبِّ الارض کا مرض نفسانی تعیش کی خاطر سرایت کرجائے گا تو وہ بے غرضی اور استغنا سے کبھی ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ واضح ہوگیا کہ یورپین اقوام انتہائی خودغرضی میں پھنسکر تمام آثار بے غرضی، استغنا، یگانگت ایثار، ہمدردی اور عام بہی خواہی، انسانیت سے یکسر محروم ہوچکی ہیں انہیں اپنے نفس کے سوا دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ عصبیت خودغرضی کی اور خودغرضی خودبینی کی اور خودبینی صورت پسندی کی فروعات میں سے تھی اس لئے انجام کار وہ سابق نتیجہ اور زیادہ روشنی میں آجاتا ہے کہ اس اُمّت کی ذہنیت کے معیار پر زیادہ سے زیادہ قابل قبول وہی چیز ہوسکتی ہے جو آنکھوں پر بار ڈال سکے گو علم و عقل کے لحاظ سے اُس کا وزن کچھ بھی نہ ہو۔

کثرت رائے اسی طرح مثلاً استدلال اور اثبات مدعٰی کے دائرہ میں اعداد و شمار اور کثرت دلائل

یعنی ہیئت اِس اُمت کے یہاں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ کمیت وکثرت جزئیاتی شے ہے
جو آنکھوں سے نظر آسکتی ہے کلیاتی نہیں ہے جس میں علم و معرفت کی ضرورت ہو لیں یہ اُمّت
کسی چیز کے غلبہ و تفاوت پر ہمیشہ اعداد و شمار سامنے رکھکر استدلال کرتی ہے معدودات کی
حقیقت کو پرکھکر اصولی رنگ میں اُس کی قوت وضعف کے متعلق رائے قائم نہیں کرسکتی کہ
حقیقت و کیفیت آنکھوں سے اوجھل ہے اور کمیت و عدد آنکھوں کے سامنے ہے اُنکے نزدیک
کثرتِ دلائل اثباتِ مدعائی سب سے زیادہ مؤثر وجہ ہے نہ کہ قوتِ دلیل کیونکہ پہلی شے کمی ہے۔
جو احساسات پر بار ڈال سکتی ہے۔ اور دوسری صورت کیفی ہے جو علم و ادراک سے تعلق رکھتی
ہے جس سے یہ حس پسند اُمّت محروم ہے۔

اسی طرح اُمّت نصرانیہ کی اس سطحی ذہنیت کے مطابق کسی رائے کا وزن یا حکم کی قوت
رایوں کی کثرت اور بھاری گنتی کے سواد سے سمجھی جاتی ہے کہ کثرت ایک امر محسوس ہے جو آنکھ کو مرعوب
بنا سکتی ہے۔ حالانکہ ایک حقیقت پسند ذہنیت کے نزدیک محض شمار کی کثرت کسی رائے کی
قوت و حقانیت کی کفالت نہیں کرسکتی جب تک کہ خود رائے ہی اپنی ذات سے کسی معیار
حق پر پوری نہ اُترتی ہو اگرچہ اُس کا حامی کوئی ایک ہی فرد کیوں نہو۔ یہ جداگانہ امر ہے کہ کسی ذی
وجہین امر میں جبکہ ہر جانب میلان کی وجوہ مساوی موجود ہوں بطور قطع نزاع کثرتِ آراء
پر فیصلہ کرلیا جائے لیکن بذاتہ کثرت کوئی موجب صواب چیز نہیں کہ اُس کے خلاف راستہ
نہو۔ یا اتفاقِ حق کا ذریعہ نہیں کہ اُس میں حق کا وجود ضروری ہو۔ پس اُس کی حقیقت قرعہ سے
زیادہ نہیں ہوسکتی جس کی غرض محض قطع نزاع ہے اور بس۔

کثرتِ افراد | اسی طرح مسیحی ذہنیت دو مقابل فوجوں میں افراد کی کثرت سے گھبرا اُٹھتی ہے کہ اُس کی نگاہیں صور و اجسام سے آگے نہیں بڑھتیں۔ حالانکہ ایک حقیقت دوست ذہنیت کے نزدیک کمیت و تعداد کا بڑھ جانا نہ فتح و شکست کا معیار ہے نہ کوئی قابل التفات مظاہرہ بلکہ بلحاظ حقیقت صبر و استقلال اور اخلاص کے مجتمے اگر دس اور سو بھی ہوں تو ہزاروں پر بھاری ہیں اور اسی باطنی قوت سے بسا اوقات چھوٹی چھوٹی اقلیتیں بڑی بڑی اکثریتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ پس ایک نصرانی صداقت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف کثرت و کمیت کے دبائو سے۔ اور ظاہر ہے کہ کثرت وہی امر محسوس ہے جو مشاہدۂ عینی سے متعلق ہے گو صداقت سے خالی ہو۔ اور صدق و اخلاص ایک امر معنوی ہے جو مشاہدۂ قلب سے متعلق ہے گو کثرت سے خالی ہو۔ پس یہ اُمت محض آنکھ سے دیکھنے کی چیز سے مرعوب ہوتی ہے۔ علم و عقل سے جانچنے کی چیز سے نہیں اس لئے بالضرور کہا جائیگا کہ اس اُمت کو اپنی حس پسندی کے ماتحت علم و حقیقت سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس تصویری اُمت کی سطح پرستی اُسے کسی بات میں بھی صورت سے گذر کر حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتی اس لئے صورتوں کی رنگینی پر مفتوں رہنا یا عقل و دین سے بیگانہ رہکر محض آنکھ کا دیوانہ بنا رہنا ہی اس اُمت کے فضائل کی انتہائی لائن ہے۔

اُمت نصرانیہ علمی اُمت نہیں ہے۔ | اگر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ صورت و جسم اور حسیات کا راستہ بے انتہا تنگ اور محدود ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی وسیع علم کی گذرگاہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ حسیات اور جسمانی اشیاء میں ہر جسم دوسرے جسم کیلئے حجاب اور ایک کی حس دوسرے کے حس سے مانع ہے

ہر صورت دوسری صورت کیلئے حاجب یا مانع ہو اسلئے قدرتی طور پر ایک صورت پسند مسیحی کے عقل و فہم کے ظرف کو بے انتہا تنگ اور محدود ہی ہونا چاہیئے بخلاف اس کے ایک حقیقت پسند ذہنیت کا مالک چونکہ صورتوں سے گذر کر حقائق اور معانی تک پہنچتا ہے یعنی جزئیات سے گذر کر کلیات و اصول میں گھستا ہے تو بلاشبہ وہ حسیات کے تنگ دائرہ سے گذر کر وجدانیات کے غیر محدود میدان میں جا پہنچتا ہے جہاں ایک حقیقت دوسری حقیقت کیلئے حجاب نہیں ایک نور دوسرے نور سے مانع نہیں بلکہ ایک کلی اور جامع حقیقت کا ہاتھ لگ جانا اس کی لاکھوں جزئیات کا قبضہ میں آجانا ہے پس حقیقتاً علم اور اس کی روح اگر کسی فطرہ میں رچ سکتی ہے تو وہ صرف حقیقت پسند ہی فطرہ ہو سکتی ہے۔

ساتھ ہی اُمّت مسیحیہ نے حسیات کا یہ تنگ راستہ اختیار کر کے اپنے لئے ساری ہی محرومیوں اور خساروں کو قبول کر لیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کے لئے وسیلہ ہوتی ہے جس کا وجود حقیقت سے الگ کوئی مستقل وجود ہی نہیں۔ پس ایک صورت پسند تو صورتوں میں رہتے ہوئے ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے جسے ابھی تک حقیقت کا نشان بھی دستیاب نہیں ہوا اگر وہ اپنا آخری مطمح نظر محض صورت ہی کو ٹھہرا لے تو وہ حقیقت تک تو یوں نہیں پہنچ سکا کہ ابھی پابند صورت ہے اور خود صورت سے یوں محروم ہے کہ صورت بلا حقیقت اور جسم بلا روح کا نہ کوئی وجود ہے نہ بقا اس لئے صورت پرست بلحاظ نتیجہ صورت و حقیقت دونوں ہی سے محروم ہے۔ بہر حال یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اُمّت مسیحیہ نے اپنی تمام مساعی کا مرکز صورت و جسم اور اس کثیف مادہ کو ٹھہرا کر علم کے بجائے حس کو اور صواب دید کے بجائے چشم دید کو اپنا مبلغ علم

ٹھہرگیا ہے۔ اور اس لئے یہ تصویری اُمّت جس پسند کہلائی گئی۔ علم دوست یاد نہیں کی جائیگی۔ اُسے صورت پسند قوم کہیں گے حقیقت دوست قوم سے تعبیر نکریں گے۔

یعلمون ظاھراً من الحیوۃ الدنیا — وہ دنیا کی ظاہری زندگی کو تو جانتے ہیں اور آخرت

وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون۔ — وانجام سے وہ لوگ بالکل غافل ہیں۔

اُمّت مسیحہ استحکام پسند نہیں ہو سکتی پھر ایک جس پسند اور مادہ پرست اُمّت پر جیسے رہ تمدن مادیات ہی کا شغل ہو عموماً مادہ ہی کے خواص وآثار کا غلبہ ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ مادہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔ اُس میں تمکن اور پختگی حال کی کوئی شان نہیں بلکہ تلوّن اور لوٹ پوٹ ہی اس کا امتیازی وصف ہے اس اُصول کے مطابق مادہ پرست اُمّت مسیحہ کی ذہنیت بھی انہی مادی آثار سے لبریز ہونی چاہئے چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ یہ اُمّت استحکام پسند ذہنیت سے اس لئے محروم ہے کہ مادیت سے مغلوب ہے اُس کے عام کاروبار سے نمود بے بود غیر پختگی، بے استقلالی اور ناپائیداری و تلوین کی شان نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ دیکھو وسائل تمدن میں سب سے زیادہ استحکام طلب چیز تعمیر ہے جس کو مضبوط بنانے میں اُس کے خوشنما بنانے سے زیادہ توجہ کیجاتی ہے۔ اسی پائیداری کی بنا پر یہ مثل مشہور ہے کہ

لذۃ الطعام ساعۃ ولذۃ الثیاب یوم — کھانے پینے کی لذت گھڑی بھر کی ہے کپڑوں کی لذت دن بھر کی ہے

ولذۃ المرءۃ شھر ولذۃ الدار دھر۔ — عورت کی لذت مہینہ بھر کی ہے اور مکان کی لذت عمر بھر کی ہے

چنانچہ پچھلوں نے تعمیرات کے استحکام میں خزانے صرف کردیئے جس سے آج تک قدیم دنیا کے آثار جوں کے توں دکھائی دے رہے ہیں۔ آگرہ کا تاج محل۔ دہلی کا لال قلعہ۔ اکبرآباد وغیرہ کے محلات

نیز دوسرے ممالک میں قدما کی مستحکم یادگاریں آجتک اُسی طرح ایک پیر سے کھڑی ہوئی اپنے بانیوں کی استحکام پسند ذہنیت کی شہادت دے رہی ہیں۔ لیکن آج کی جدید دُنیا میں صورت پسند نصرانی حکومت رائے سینا (نئی دہلی) تعمیر کرتی ہے شاہی دفاتر اور گورنمنٹی عمارتیں لاکھوں روپیہ کی لاگت سے تیار کرتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ لاکھوں روپیہ مرمت کیلئے بھی منظور کرتی ہے کیونکہ لاگت زیادہ تر نمود بے بود پر لگائی گئی جس میں استحکام و پختگی اصل مقصود ہی نہ تھی۔ اسیطرح دوسری گورنمنٹی عمارتوں کو دیکھ لینا چاہئے کہ عمارت میں ڈیزائن کی خوبی پیدا کرنے کیلئے تو سارا محکمہ انجینیری جمع کر لیا جاتا ہے لیکن اُسے مستحکم کرنے کیلئے کسی مستقل اقدام کی طرف توجہات منعطف نہیں ہوتیں۔

پھر چونکہ ان نمایشی عمارات میں بقاء و استحکام کی طاقت ہی نہیں اور اس لئے نہیں کہ ان بانیوں ہی کی نمائش پسند ذہنیت میں بقاء پسندی کے جذبات نہیں اس لئے بڑے بڑے شہروں مثل بمبئی وغیرہ میں ان صورت آرا بلڈنگوں کے انتہائی قیام تک کی بھی ایک تخمینی مدت معین کر دی جاتی ہے حتیٰ کہ انقضاء میعاد پر اگر یہ عمارتیں اتفاقاً خود نہیں گرتیں تو میونسپلٹی کے حکم سے گرا کر مالکوں کو تجدید تعمیر کا حکم دیدیا جاتا ہے تاکہ اچانک گر پڑنے سے (جو اس مدت میں تقریباً متیقن ہوتا ہے) جانوں کا نقصان نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس بار بار کے بنانے اور بگاڑنے میں لاکھوں روپیہ کے یہ مصارف بقاء و استحکام کیلئے تو ہو ہی نہیں سکتے ورنہ اس شکست و ریخت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ لامحالہ یہی کہا جائیگا کہ خالص نمائش ہی کیلئے برداشت کئے جا رہے ہیں جس سے اپنا ذوق نمود پورا کر لینا مقصود ہے پائیداری ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح ملبوسات میں لو تو قدیم کپڑے اسی چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں جو اُن کی ابتدا ساخت کے

وقت تھی لیکن جدید صنعت کے ملبوسات دیکھو تو چند ہی سال بعد بوسیدگی انہیں کلیتہً ناقابل استعمال وبقا بنا دیتی ہے۔ قدما کا چھوڑا ہوا عام رہائشی اور استعمالی سامان صدیوں کا موجود اور آج بھی قابل استعمال ہے لیکن موجودہ صورت پسند اقوام کی صنائع میں بقا و پختگی کے بجائے وہی نمود بے بود ہے کہ جس کے سبب اُدھر سامان تیار ہوا اور اُدھر اُسے بے بقائی او نیستی نے سنبھالا۔ پچھلا کاغذ صدیوں کا آج بھی تازہ بہ تازہ نظر آتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کا مشینی کاغذ دس بیس برس ہی میں بوسیدہ اور ناقابل انتفاع ہو جاتا ہے۔ قدیم روشنائی اور الوان کی چمک دمک آجتک قائم ہے لیکن جدید ساخت کی روشنائیاں چند ہی سال میں خود بھی اُڑ جاتی ہیں اور ساتھ ہی کاغذ کو بھی گلا کر اپنے ہمراہ لیجاتی ہیں جس کی حروف کے بجائے حروف کے روشندان باقی رہجاتے ہیں جو انجانی روشنائی کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ غرض آج کی صورت پسند دنیا کا تمامتر دماغی اور مالی زور بجائے اصلیت کے رسوخ و استحکام یا بقا و دوام پسندی کے محض آرائش و زیبائش پر ہے اور بس۔

امت مسیحیہ انجام بیں قوم نہیں | پھر چونکہ اصلیت یا روح کی خاصیت بقا، و استمرار وجود ہے اور مادۂ و صورت کی صفت بے بقائی تغیر و فساد اور بالآخر فنا و عدم ہے۔ اِس لئے لازم ہے کہ روحانیت پسند اور باطن دوست قومیں تو انجام اور عاقبت دوست ہوں اور صورت پسند یا حس پرست اقوام عاجل پسند اور حال بیں ہوں۔ کیونکہ روح کا میدان بوجہ استمرار وجود کے استقبال کی طرف ہے کہ ہر باقی چیز بوجہ اپنی بقا و پختگی کے ماضی میں اپنا نشان چھوڑ کر استقبال کی طرف دوڑتی ہے اور صورت و مادہ کا رخ بوجہ اپنے تغیر و فنا کے ماضی کی طرف

ہے کہ ہر فانی چیز بوجہ اپنی خبائث کے فنا ہو کر ماضی میں رہجاتی ہے اور استقبال کو اپنے وجود سے خالی کر دیتی ہے گویا باقیات تو ماضی سے عبور کر کے مستقبل میں اپنا نشان قائم کرتی رہتی ہیں۔ اور فانیات مستقبل کو چھوڑ چھوڑ کر ماضی کیطرف ہٹتی جاتی ہیں پھر چونکہ ماضی خود منقضی اور معدوم کہ اُس کی صفت جانا اور گذرنا ہے اس لئے گویا فانیات نہ پہلے ہیں نہ پیچھے نہ اول ہیں نہ آخر اور مستقبل وجود سے ملحق ہے کہ اُس کی صفت آنا اور قریب ہونا ہے اس لئے گویا باقیات پہلے بھی ہیں اور پیچھے بھی اول بھی ہیں اور آخر بھی۔ خلاصہ یہ کہ باقیات وجود کے دائرے کی چیزیں ہیں اور فانیات عدم کے حلقہ کی۔ بس مرد حاقیت پسند اقوام تو استقبال پسند انجام بیں عاقبت شناس اور آخرت دوست ٹھہر جاتی ہیں جن کیلئے اول و آخر بقا و رسوخ ہے اور صورت پسند اقوام عاجل پسند پیش بیں اور دنیا دوست ٹھہرتی ہیں جن کے لئے اول و آخر فنا و حرمان کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صورت پسند اُمت مسیحیہ بھی دُنیا دوستی کی بنا پر اگر دین کے نام سے کوئی کام کرتی ہے تو اُس میں طلب دُنیا ہی کی مضمر ہوتی ہے وہ مذہب کا نام بھی لیتی ہے تو اس لئے کہ اسکی معاشرتی سیاست میں مدد دے۔ مدبرین برطانیہ نے صریح اعلانات کئے ہیں کہ اگر مذہب ہماری سیاست کے ساتھ چلے تو چلتا ہے ورنہ دُم دبا کر رستہ لے پس یہاں آخرت کا نام بھی دنیا کیلئے ہی لیا جاتا ہے۔ ان صورت پرستوں اور دنیا دوستوں میں مذہب کی غایت صرف قومیت کی شیرازہ بندی ہے اور بس گویا جہاں اور مختلف ذرائع تحصیل قومیت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہاں مذہب کا نام بھی ہے کہ جس پر دُنیا جمع ہو سکے پس کہاں تو یہ صورت حقیقت کے وسائل میں سے تھی اور کہاں ان صورت پرستوں نے حقیقت کو بھی

صورت ہی کا خادم بنا کر چھوڑا ۔ کج فہمی کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اُمت مسیحیہ کی عجلت پسندی اور جلد بازی

ظاہر ہے کہ جو صورت پرست اقوام اپنی صورت پرستی کے سبب حقیقت فراموشی یا دنیا طلبی کے سبب عاقبت گذاری کی خوگر ہو چکی ہوں، بلا شبہ اُن کی ذہنیت میں عموماً عاجل پسندی اور آجل گذاری بطور طبیعت ثانیہ کے راسخ ہو جانی چاہیئے کیونکہ جس طرح دنیا نقد اور عاقبت اُدھار ہے اور جس طرح صورت سامنے ہونیکے سبب بعجلت تمام سامنے آجاتی ہے جو نقد کی شان ہے اور حقیقت تک رسائی بدیر اور بغور و فکر ممکن ہے جو اُدھار ہونے کی شان ہے اسی طرح ہر صورت پسند درحقیقت عاجل پسند ہے اور ہر حقیقت پسند درحقیقت آجل پسند ہے اسی اُصول کے ماتحت دیکھ لیا جائے کہ یہ صورت اور بالفاظ دیگر عجلت پسند قوم (اُمت مسیحیہ) ہر چیز میں عجلت پسندی جلد بازی بے صبری اور گھبراہٹ کی ذہنیت پر اگر تلی ہے اُسے ہر چیز کے انجام کی تلاش وقت سے پہلے ہی ہونے لگتی ہے۔ تدریج و تانّی اور طبیعاتی ترتیب و درجہ بندی سے اُس کا جی اُکتایا ہوا رہتا ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ زینہ کی سیڑھیاں طے کئے بغیر ہی بالائی منزل پر جا کودے اور درمیانی وسائط سے بے نیاز ہو جائے۔ بلکہ یہ اُمت چونکہ صورت پسندی کی بھی سب سے آخری مقام پر پہنچی ہوئی ہے اس لئے وہ ان عجلت پسندیوں اور جلد بازیوں کے بھی انتہائی درجہ پر آ کر رُکی ہے چنانچہ اس عجلت پسندانہ ذہنیت کے ماتحت اُس کا طبعی تقاضہ یہ ہے کہ ہر کام اپنی قدرتی حد کمال پر پہنچے بغیر ہی اپنی اُدھوری حقیقت کے ساتھ نمایاں ہو جائے اگرچہ انجام کے اصلی منافع سے یکسر خالی ہو اور اگرچہ درمیانی وسائط کی مُفید تاثیرات سے کوئی استفادہ اور استکمال نہ کر سکے۔ سواریاں ہوں تو تیز رو جیسے ریل و موٹر اور ہوائی جہاز

وغیرہ چونکہ اچانک ہوائیں بدلنے سے مسافروں کی صحت پر بُرا ہی اثر پڑے کہ گرم سے سرد اور سرد سے اچانک گرم ہو کر مبتلائے آلام ہو جائیں وسائل خبر رسانی ہوں تو عجلت آمیز جیسے تار، ٹیلیفون، وائرلیس وغیرہ چلا ہے خبر اور اس کی صوت کی اصلیت مشتبہ ہی ہو جائے اور اس سے نتائج واحکام پر مفید اثرات نہ پڑیں حتیٰ کہ انبات نباتات ہو تو بعجلت مفرطہ جیسا کہ مشینوں کے ذریعہ بجلی کی حرارت سے ایک ایک سال میں چار چار فصلیں پیدا کرنے کی مساعی جاری ہیں۔ اگرچہ ایسی کھیتوں کے غلے اور پھل تدریجی قوت اور اپنی تربیتی خاصیتوں سے محروم رہکر ناقص المنفعت ہی ہو جائیں۔ پھر جلد بازیوں کی حد ہے کہ احیاء حیوانات بھی ہو تو عجلت و گھبراہٹ سے۔ جیسے حرارت رساں مشینوں کے ذریعہ بیضوں میں سے بعجلت تمام مرغی کے بچے نکالنے کی سعی کیجاتی ہے اگرچہ اُن کی حیوانیت ناتمام رہکر اُن کی حیات کو بھی ناقص اور ناتمام بنادے۔ پھر ایجاد جمادات ہو تو اُسی گھبراہٹ کیساتھ مثلاً مکانات کی تعمیر جلد سے جلد ختم کرنے کے لیے پہلے بنیادوں کی گہرائی میں کمی کی گئی پھر دیواروں کے آثار گھٹائے گئے۔ اور اب سرے سے بنیادیں ہی حذف کر دی گئیں بلکہ نفس تعمیر و آثار کو بھی ختم کر کے مکانات ہی سیمنٹ سے ڈھالے جانے لگے تاکہ تدریجی تاخیر بھی نہ ہو اور اسمیں بھی بہر حال کچھ نہ کچھ وقت صرف ہوتا تھا تو الومنیم وغیرہ کے مکانات ڈھلے ڈھلائے ہی فروخت ہونے لگے جو تہ شدہ رکھے رہیں تاکہ حسب ضرورت خیموں کی طرح کھولکر کھڑے کر دئے جائیں اور کوئی طبعی تاخیر ہی درمیان میں حائل نہ ہو کہ جس سے اس ذوقِ عجلت پسندی میں کوئی خلل رہ جائے بہر حال جذبات کی دنیا کا حال یہ ہے کہ چاہے یہ غیر قدرتی مکان قدرتی منافع بخشیں یا نہ بخشیں مگر بہر حال جلد بنجائے اور دیدہ زیب ہو

کپڑا سلے تو مشین سے کہ دستکاری میں بہر تدریج زمانی ہوتی ہے دوائیں غذائیں تیار ہوں تو مشین سے کہ ان کی دستی ساخت میں کچھ نہ کچھ وقفہ لازمی ہے۔ حجامت ہو تو مشین سے کہ ہاتھ کی حجامت میں بہر تاخیر کا خطرہ ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ طبعی طور پر بھی جو عرصہ کسی کام میں لگنا ناگزیر تھا وہ بھی نہ لگنے پائے اور کسی کام کے انتظار میں طبیعت کو صبر و تحمّل کا امتحان دینا نہ پڑے گویا جو کچھ ملنا ہو وہ ابھی مل جائے۔ عاقبت کے لحاظ سے گو ہاتھ خالی ہی رہ جائیں۔

يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا۔ — دُنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

سیّئات کا کمال تکمیل اسباب سے ممکن ہے

حالانکہ یہ ایک مشاہدہ اور معقول ضابطہ ہے کہ اس عالم اسباب کی ہر چیز اپنی قوت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ انسیاب اسباب کے ساتھ نمودار ہو ورنہ پھر یہ عالم عالمِ اسباب ہی باقی نہ رہے اگر عجلت پسندی سے درمیانی وقفے یا درمیانی درجات و مراتب حذف کر دیئے جائیں تو یہ ایسا ہی رہے جیسا کہ ایک جنین کو ماں کے پیٹ سے چھٹے ساتویں مہینہ نکالنے کی کوشش کی جائے یا کسی بچہ کو مراتب طفولیت گزرنے سے پہلے ہی دوا یا مصنوعی حرارت سے جوان بنانے کی تدبیریں کی جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا وہ وقت سے پہلے ہی ختم ہو جائیگا یا اُس میں قدرتی قویٰ ہی نہ پیدا ہوں گے یا ہوں گے تو اتنے ناقص اور ناکارہ کہ جن سے قدرتی اغراض پوری نہ ہو سکیں گی۔ اور ہر صورت میں اُس کی زندگی موت کے ہم رنگ ہو جائیگی پس آج کی عجلت باز ذہنیت انجام کے لحاظ سے حیات کی طرف نہیں بلکہ موت کی طرف دوڑ رہی ہے جس کو جہل مرکب کے طور پر حیات اور زندگی کی ترقی کہا جا رہا ہے۔ بہرحال صورت پسندوں میں نہ استحکام پسند ذہنیت قائم

ہوتی ہے نہ تحمل وتدریج پسندی یعنی نہ اِس جلد باز ذہنیت میں تمکّن و قرار ہوتا ہے اور نہ طاقت انتظار ظاہر ہے کہ جیسے یہ عجلت کاری اور بے صبری اِس اُمّت کا انتہائی مقام ہے اسی طرح انسانی کمزوریوں کا بھی یہ آخری ہی درجہ ہے۔ اِس لئے یہ اُمّت اپنی اِس ذہنیت کے ماتحت نہ صرف دائرۂ اسباب و مسبّبات کے قدرتی منافع ہی سے محروم رہی بلکہ اخلاق انسانیت اور ملکاتِ کامرانی سے بھی کوسوں دور پڑ گئی ہے۔ اُنہوں نے مسبّب الاسباب کو تو اسباب کی خاطر چھوڑا تھا لیکن خود اسباب کو اپنی جلد بازی کی خاطر ترک کر دیا۔ اِس لئے نہ مسبّب الاسباب کے رہے نہ اسباب کے۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے"۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ۔ دُنیا و آخرت دونوں کھو بیٹھا۔ یہی کھلا نقصان کہلاتا ہے۔

پھر اِس سے زیادہ محرومی و حرمان و خسران کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟

اُمّتِ مسیحیہ کی رغبت کا میلان مصنوعی اشیاء میں

پھر ظاہر ہے کہ جو ظاہر پرست اور عجلت کار قوم ہر شئے کو اس کے قدرتی اسباب اور اُس کے ظہور کا جبلی راستہ چھوڑ کر فرضی اسباب اور مصنوعی طریقوں سے بعجلت دکھلانے کی خواہشمند رہتی ہو اُس کی ذہنیت و رغبت عموماً مصنوعی اشیاء کی طرف ہٹ جاتی ہے اور طبعی طور پر قدرتی اشیاء سے پھر جاتی ہے گویا اِس قوم میں قدرتی پیدائش کا راستہ تکنے کے بجائے جلد بازی سے تصنّع بناوٹ اور صرف اپنی ہی صنعت کی دخل اندازی کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اِس تصنّع اور تکلّف کی آخری منزل پر پہنچ کر ایسی سطح پرست قومیں قدرتی اشیاء سے بے تعلق ہی نہیں بلکہ نفور ہو جاتی ہیں اور اُن کی قدرتی سادگی کو اپنی مصنوعی ساخت سے

آلودہ کئے بغیر نہیں رہتیں بلکہ اُن کے زعم فاسد میں محض خدا ہی ساخت کے نمونے اسوقت تک کسی طرح قابل التفات نہیں ہوتے جب تک کہ اُن میں اپنی کسی صنعتی مداخلت بیچ نہ آجائے۔ جس کا راز یہ ہے کہ قدرتی ساخت کے دو اجزاء روح وجسم اور حقیقت وصورت میں سے صرف صورت یا تصویر سازی پر انسان کو قدرت دی گئی ہے بت گری اُس کے ہاتھ میں ہے اور مجسّمے تیار کر لینا یقیناً اُس کے قابو سے باہر نہیں۔ لیکن اُن میں جان ڈالدینا اُس کے بس کی بات نہیں کہ حقیقت آفرینی اور جان بخشی صرف جان آفریں ہی کے ید قدرت میں ہے اس لئے حقیقت پسندوں کو قدرتی ساخت اشیاء کیطرف زیادہ میلان ہونا چاہیئے کہ حقیقت و اصلیت قدرتی ہی اشیاء میں ہوتی ہے اور وہ حقیقت ہی کے دلدادہ اور متلاشی رہتے ہیں لیکن صورت پسندوں کو اپنی مصنوعی اشیاء کی طرف زیادہ رغبت ہونی چاہیئے کہ مصنوعی اشیاء میں صرف صورت وبناوٹ ہی ہوتی ہے جسے اصلیت چھو نہیں جاتی اور وہ طبعاً صورت ہی کے دلدادہ اور متمنّی ہوتے ہیں پھر اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ قدرتی اشیاء میں اصل اصول حقیقت و روح ہے اور اس کی ساخت یا بناوٹ پر انسان کو کوئی دسترس نہیں کہ وہ بناوٹ سے کام لے سکے اس لئے حقیقت پسند تصنع پسندی اور بناوٹ سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے کہ وہ جس میدان کا مرد ہے وہاں بناوٹ اور مصنوعیت کا کوئی دخل نہیں البتہ مصنوعی اشیاء میں چونکہ اصل اصول صورت اور تصویر آرائی ہی ہوتی ہے اور اُنکی ساخت پر انسانوں کو کسی نہ کسی حد تک قدرت ہے اس لئے صورت پسندوں کا بڑا شغل ہی تصنع بناوٹ تکلف اور مصنوعیت کاری کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ جس میدان

صورت و رنگ میں کرشمے ہیں وہاں بناوٹ اور تصنع میں کوئی رکاوٹ نہیں اُمّت مسیحیہ اپنی
صورت پسندی اور عجلت کاری سے صورت آرائی کے میدان میں آئی جہاں حقیقی اشیاء اور
حقائق سے اُسے بیگانگی پیدا ہوئی اور حقائق سے بیگانہ ہو کر اُسے قدرتی طور پر صورت سازی
اور صورت بازی کا شغل اختیار کرنا پڑا جس سے اُس میں تصنع اور بناوٹ کی ذہنیت قائم ہوئی
انجام کار وہ اپنی اس درجہ پر نہیں رہی کہ وہ صرف اپنی ساختہ صورتوں کی عاشق بن چکی ہے کہ جبتک
خدائی اشیاء میں بھی اپنی ہی صنعتی مداخلت نہ کرے اُسے ان اشیاء پر قناعت نہیں ہوتی مثلاً
روشنی پسند ہے تو بجلی اور گیس کی جو اپنی صنعت ہے۔ پانی ہے تو نلوں اور پمپ کا اس میں اپنا
دخل ہے۔ پنکھا مرغوب ہے تو برقی کہ اپنی صنعت سے چلتا ہے گاڑی ہو تو اسٹیم اور برق سے چلتی ہو
کہ جانور کے سہارے چلنا پھر قدرت کی طرف رجوع اور اپنی صنعت سے بے تعلقی ہے ملازم
ہوں تو فولادی پُتلے ہوں جو بجلی سے حرکت کریں تمام کاج ہو تو سب بجلی کی حرکت اور مشین
کی طاقت سے انجام پائے۔ یہاں تک کہ جن چیزوں کی پیداوار خالص قدرت کے ہاتھ دارو ہوتی
ہے اُن میں بھی یہ بدبخت اپنی بناوٹ کی مداخلت سے نہیں شرماتے مثلاً قدرتی پھل پھول
کے رنگ و روپ اور فربہی تک میں بھی اپنی صنعت کی کوئی نہ کوئی مداخلت کئے بغیر نہ رہے
قلمبندیوں سے پھولوں میں نئے نئے الوان پیدا کئے جا رہے ہیں پھلوں کو چھوٹا بڑا کیا جا رہا
ہے تاکہ قدرتی چیزوں پر کچھ نہ کچھ صنعتی رنگ ضرور چڑھ جائے۔ گویا کہ یورپ کی مایۂ ناز صنعت کا
حاصل ہی یہ رہ گیا ہے کہ وہ قدرتی امور کو اپنی مداخلتوں سے بگاڑ رہا ہے اور چیزوں سے جو
قدرتی اور خلقی منافع تھے [illegible] انہیں اپنے تصنع [illegible]

بناوٹ کا کسی چیز میں دخل آتا جائیگا اُسی قدر فطری سادگی اور قدرتی خاصیتیں گھٹتی جائیں گی۔ چنانچہ ان مداخلت کردہ پھل پھول کا جسم و رنگ تو اس صنعت سے ضرور گھٹ بڑھ جاتا ہے لیکن قدرتی ذائقہ و بُو اور حقیقی فوائد رخصت ہو جاتے ہیں۔

صورت پسندانہ شوخ چشمی کی انتہا رہے کہ یہ صورت پرست جانداروں کے احیاء و ایجاد میں بھی اپنی صنعت گری سے باز نہ آئے مثلاً مشینیں ایجاد کی گئیں ہیں تاکہ بیضوں کو گرمی پہنچا کر مرغ کے بچے بلا مرغیوں کے توسط کے نکالے جا سکیں اور اب ایسی مشینوں پر بھی غور کیا جا رہا ہے جن کے ذریعہ گھوڑوں میں سے پیدائش کا مادہ کھینچ کر شیشوں میں محفوظ رکھ دیا جائے اور حسب ضرورت اُسے مادہ اسپ میں پہنچا کر بچہ حاصل کر لیا جائے نہ مادہ پر نر چھوڑنے کی حاجت رہے اور نہ اِس دردسری میں وقت صرف ہو اس نظریہ میں کامیابی ہو جانے پر شاید یہی طریقہ انسانی بچے حاصل کرنے کے لئے بھی عمل میں لایا جائیگا۔ اور یہ مختلف میکروں کی مشینوں سے حاصل شدہ انسانی بچے بازاروں میں دس پانچ روپیہ میں بسہولت دستیاب ہو جایا کریں گے۔ میکر اچھا ہوگا تو شاید روپیہ دو روپیہ قیمت میں اضافہ ہو جایا کریگا۔ کوئی اِن بدبختوں سے پوچھے کہ آخر صنع الٰہی سے تمہیں کیا عداوت ہے۔ یا انسانی فرائض تمہارے سامنے باقی نہیں رہے کہ خدائی کاموں میں دست اندازی کا جنون تمہارے سروں پر سوار ہوا۔ اِس جہالت و بلادت کی کوئی انتہا ہے کہ مشینی کاروبار اور مصنوعی اشیاء کی نمائش کے شوق میں انسانوں کو نچوڑ لینے اور اُنکا مادہ رجولیت کھینچ لینے پر محض اس لئے تیار رہیں کہ اپنی مشینی صنعت کا نمونہ دنیا کو دکھلا سکیں حالانکہ جس دنیا کو دکھلانے کیلئے اُسے نچوڑا جا رہا ہے وہ اِس نچوڑ کے بعد باقی ہی

کب رہیگی کہ اُسے یہ سب کچھ دکھلایا جائے؟ پس دنیا تو رخصت ہو گئی اور اس صنعت کا کامیاب ہونا پھر بھی موہوم ہی رہا۔ پس جدت طرازی کے اس بے پناہ جوش میں موجودات کو برباد کرنا اور موہومات کے انتظار میں بسر کرنا اسی قوم کا حصہ ہو سکتا ہے جو ان صورت آرائیوں کی بدولت اپنی حقیقت بینی کی آنکھ بالکل ہی پھوڑ چکی ہو۔ اور عقل سے خواہی نخواہی لڑائی مول لے چکی ہو۔

اُمّت یورپ کا تصنع اور بناوٹ

پھر اسی صورت پسندی اور قدرتی اُمور سے نفرت کے جذبہ میں جس طرح اس قوم نے عموماً جمادات و نباتات میں مصنوعی شان پیدا کرنی ضروری سمجھی وہیں خود اپنے اندر بھی طرح طرح کے بناوٹی تصرفات کر کے اپنی قدرتی خلقت کو بگاڑنا بھی اُس کا شیوۂ زندگی اور لازمۂ تمدن بن گیا۔ کسی میم صاحبہ نے اپنی چھوٹی آنکھ کو بڑی اور خوبصورت دکھلانے کے لئے اُس کا اپریشن کرا دیا۔ کسی نے دانتوں کو خوبصورت بنانے کیلئے رتوا دیا۔ کسی نے اُن پر سونا چڑھا دیا۔ کسی نے اپنی سانولی رنگت کو چھپانے کیلئے کھال کو کھرچ کر اُس میں کریم و پاؤڈر بھر دیا۔ کسی نے صاف جلد پر سرمہ سے نقش و نگار کھدوا لئے وغیرہ وغیرہ وہ حماقت آمیز اور مضحکہ انگیز امور ہیں جو اس صورت پسند قوم کے تصویری جذبات کو رات دن نمایاں کرتے رہتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خواہ قدرتی امور ہوں یا مصنوعی ہر نوع میں اس قوم کی تمام تر مالی اور جانی ہمت صورت آرائی اور حسنی زیبائش تک محدود ہے۔ چنانچہ اخبار دعوت دہلی ۴ ر اپریل ۱۹۳۶ء اسی آرائش و زیبائش کے ہیضہ کے متعلق لکھتا ہے۔

"آرائش و زیبائش کے لئے برطانیہ کے مرد و عورت ہائیس لاکھ روپیہ ہفتہ وار

خرچ کرتے ہیں چنانچہ اسی کمائی سے حال ہی میں پچاس کارخانے اور بھی بنائے گئے ہیں جن میں پاؤڈر کریم وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔"

اسی طرح عموماً صنعت و حرفت کے دائرہ میں اپنی صورت پرستیوں کی بدولت دستکاری کی جگہ مشینوں اور لوہے پیتل نے سنبھال لی ہے۔ قدرتی صناعی اور دستکاری کی جگہ اسٹیم اور برق کی طاقت نے گھیر لی۔ خیاطت پر سنگر کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ پارچہ بافی کی کارگاہوں پر مانچسٹر کی مشینوں کا تیل بتی پر الکٹرک انجنوں کا۔ کاغذ سازی پر پیپر ملز کا۔ اونٹ گھوڑوں کی سواری پر ریل اور موٹر کا کنول پر پائپ کا۔ کتابت پر ٹائپ کا۔ غرض ہر وہ دستکاری جو کسی اندرونی اور نفسانی ملکہ قدرتی قوت کے ماتحت انسانی جوارح سے ہویدا ہوتی تھی قلب سے نکل کر قالب پر آگئی اور قالب انسانی سے ہٹ کر جمادات کے سپرد ہو گئی جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا جوہر خود اُس کے پاس نہ رہا کہ وہ جہاں بھی ہو اپنا کام کر سکے اور جوہر دکھلا سکے۔ بلکہ آج انسان اپنے کاروبار میں مشین۔ انجن۔ کوئلہ۔ مزدور۔ برق۔ گیس اور مخصوص مواقع کا محتاج اور غلام بن گیا اگر کسی جگہ یہ مشینی لوازم نہوں تو انسان بیکار محض ہے۔ گویا وہ شہروں میں مشینی قیود کے ساتھ تو کار آمد ہے۔ لیکن دیہات میں مطلقاً بیکار جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ یہ مشینی ذہنیت انسان کو اپاہج اور نکما بنا کر اسکی تمام قدرتیں لوہے پیتل کو سونپ دیتی ہے جیسا کہ اُس کے بالمقابل قدیم طرز کی صنعت و حرفت اور دستکاری کی ذہنیت انسان کو باکمال بنا کر خود اُس کی قدرتیں اُسی میں جگا دیتی ہے۔ پہلی ذہنیت کے ماتحت انسان اپنی ذات سے عاری اور بے ہنر ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسری کے ماتحت سب کچھ انسان ہی میں چھپا نکلتا ہے۔ پہلی ذہنیت سے انسان لوہے لکڑی کا آلۂ کار بنتا ہے اور

دوسری کے ماتحت خود لوہا لکڑی اُس کا آلۂ کار، درتختۂ مشق ثابت ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس حقیقت کو یوں سمجھو کہ قدیم ذہنیت خود انسان کی عظمت وشان قائم کرتی ہے اور جدید اُسے گرا کر اُس پر اُسی کی خادم اشیاء کو غالب دکھلاتی ہے۔ جدید ذہنیت کے مطابق وہ انسان کہ ایک لوہا پیتل ہی نہیں سارا عالم اس کا دست نگر اُسی کے لیئے پیدا ہوا اور اُسی کے رحم وکرم پر زندہ تھا۔ آج وہی انسان لوہے لکڑی کے رحم وکرم پر زندہ ہے اگر مشنری نہ ہو تو سریع السیر سواریاں نہوں۔ زود اطلاع آلات خبر رسانی نہوں یا دوسرے تفریحی اسباب تمدن نہ رہیں تو اُس کی زندگی وبال اور وہ خود کشی کیلئے تیار ہو جائے چنانچہ یورپ کے اخبارات میں بکثرت خود کشی کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں جو اکثر انہی وجوہ کے ماتحت عمل میں آتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کے بعض اعداد و شمار ہم نے صفحہ (۱۰۰) پر پیش کیئے ہیں۔

حالانکہ حقیقی انسان تو وہ تھا کہ اگر ساری دنیا، ورمادیات کے سارے یہ تفریحی بلکہ ضروری سامان بھی اُسے چھوڑ دیں اور جنگل کی ایک پہاڑی خلوتگاہ سے زائد اُس کے پاس کچھ نہ بچے تب بھی نہ اُس کی عیش میں فرق آئے اور نہ اُس کے باکمال ہونے میں کوئی ادنیٰ خلل راہ پا سکے۔ وہ ساما نوں کا محتاج نہو بلکہ سامان اُس کے اندرونی طاقت سے وہیں پیدا اور مہیا ہو جائیں

بہرحال عیسائی اقوام نے اپنی صورت پسندانہ ذہنیت کے ماتحت اپنی غلامی اور محتاجگی کی زنجیریں مضبوط کرلیں۔ اور قدرتی اُمور یا فطری سامانوں کو چھوڑ کر اگر انہوں نے اپنی صنعت میں غلو کیا تو اُس سے اُن کی انسانیت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ حقیقتاً بے بسی محتاجگی اور ایک مہلک تنزل وزوال کی لائن پر اُن کی گاڑی چل پڑی جو دوڑ رہی ہے اور ہلاکت کی

کنارہ سے قریب ہو چکی ہے۔

امّتِ مسیحیہ عاقل نہیں بلکہ ایک غبی قوم ہے

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح صورت تک پہنچنے کا ذریعہ آنکھ ہے اسی طرح حقیقت تک پہنچنے کا راستہ عقل ہے پس جو نسبت صورت و حقیقت میں ہے وہی اُن کے طرق وصول یعنی آنکھ اور عقل میں بھی ہونی چاہئیے پس جس طرح صورت حقیقت کا وسیلہ اور خادم ہوتی ہے اور جس طرح کہ محسوسات (یعنی صور و اجسام) معقولات تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ آنکھ ناک وغیرہ جو محسوسات کا ادراک کرتے ہیں عقل کے خدام ہیں یہ جو کچھ جہان رنگ و بو میں سے بٹور کر لاتے ہیں عقل اُس میں سے اپنا حصّہ نکال لیتی ہے اور محسوس جزئیات میں سے معقول کلیات مستنبط کر لیتی ہے بشرطیکہ اُسے معروف عمل کیا جائے۔ اس لئے حقائق کو چھوڑ کر جو قوم صور و اشکال میں پھنس چکی اور اُس کے لئے یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ وہ آنکھوں کے بھروسہ پر عقل سے کنارہ کش ہو گئی ہے اور بصارت کے عشق میں مبتلا ہو کر بصیرت سے بے بہرہ ہو چکی ہے۔ پس ایسی قوم کو (جو کسی باب میں بھی حقیقت تک نہ پہنچے بلکہ صورتوں ہی کو ہمرنگ حقیقت دکھلا دکھلا کر گندم نُما جو فروشی کرتی رہے) عاقل تو نہیں کہا جائیگا مگر عیار شاطر اور چالاک ضرور کہا جائیگا جسے عقل کا کوئی شمہ نہ ملا ہو اور اُصولاً غباوت و حُمق اُسکا امتیازی وصف قرار پا چکا ہو کیونکہ عقل حقیقت تک پہنچاتی ہے اور چالاکی صورت فریبیوں میں اُلجھا کر ناکام بنا دیتی ہے اس لئے عورتوں کو شریعت کی نصوص نے ایک طرف تو ناقص العقل کہا کیونکہ وہ حقائق کلیہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور دوسری طرف انہیں کو چالاکی میں کامل کہا گیا جیسا کہ آیتِ قرآنی اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ سے ظاہر ہے۔

کیونکہ اُن کی ہر ایک چیز ذات ہو یا صفت نظر فریب ہوتی ہے اُن کے اقوال تلبیس آمیز ہوتے ہیں اور اُن کے بیانات کا اُتار چڑھاؤ بڑے بڑے کامل العقل مردوں کو دھوکہ میں ڈالکر اُن کی عقلیں اُچک لیتا ہے پس اسی طرح اُمّتِ مسیحیہ میں صورت پسندیوں اور نظر فریبیوں کی بدولت چالاکیوں اور شاطرانہ عیاریوں کے جذبات تو افراط کے ساتھ موجزن نظر آئیں گے لیکن حقیقت افروز عقل اور دانش کا کوئی نشان نہ ملیگا۔

شاید کسی کو دھوکا ہو کہ جس قوم کے دست و بازو کی بدولت نہایت ہی عجیب و غریب ایجادات اور مادی اختراعات نے جنم لیا اور جس کے نظر فریب تمدنی وسائل نے دُنیا کو محوِ حیرت بنا دیا ہے کیا اُس قوم کو بے عقل اور بلید کہنا خود عقل ہی کے ساتھ انتہائی دشمنی اور تعصب کی ناروا مثال نہیں ہے؟ کیا حماقت و بلادت کے ہوتے ہوئے بھی ایسے ایسے کارنامے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ان ایجادات یا مادی اختراعات کی بنا عقل پر نہیں بلکہ عملِ پیہم اور سعی دائم پر ہے ایک صناع یا دستکار جب کہ اپنی صنعت و حرفت میں رات دن لگا رہے۔ اور سلیقہ و فکر کے ساتھ اپنا کام مسلسل جاری رکھے تو لازمی ہے کہ دورانِ عمل میں متعدد نئے نئے گوشہ ہائے عمل اس کے سامنے آتے رہیں گے اور جسقدر وہ اُن گوشوں کو اپنے اصلاحی عمل سے پُر کرتا رہیگا اسی قدر یہ صنعت مکمل ہو کر اپنی آخری مہذب صورت میں نمایاں ہوتی رہے گی۔ اور اُسی کے ساتھ اور دوسرے نئے نئے مصنوعات کیطرف بھی ذہن منتقل ہوتا رہیگا۔ کسی صناع کو آغازِ صنعت ہی میں اُس کی آخری مہذب صورت کا ہرگز کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ یہ فرض کیا جائے کہ اُس نے اپنی عقل و دوراندیشی سے پہلے ہی کسی ایجاد یا صنعت کا خاکہ مکمل کر لیا تھا۔ اور

اُسی کے مطابق اُس نے عملدرآمد کا آغاز کر دیا بلکہ عمل کے دوران میں صرف تجربات ہی نئے گوشوں کی طرف
رہنمائی کرتے ہیں۔ پس صنائع کی تکمیل عملی تجربہ کرتا ہے نہ کہ عقل اِس لئے ایک صناع جو جاہل
یا کم عقل بھی ہو چند سال کے بعد اپنی صنعت کو بہترین صورت میں پیش کر دیتا ہے مگر عقل کے
درجہ میں وہ انتہا ہی بلید اور نظریات میں انتہا ہی کم سمجھ بدستور باقی رہتا ہے۔ بلکہ یہاں اگر
عقل کی ضرورت بھی ہے تو ماضی کے سلسلہ میں ہے کہ صنعت کے سابق نقائص کے سمجھنے میں
مدد دے نہ کہ مستقبل میں کہ صناع کو دوربین یا دور اندیش کہا جا سکے پس عقل اگر کسی درجہ میں
شمار ہوتی بھی ہے تو عمل اور تجربات کے تابع ہو کر نہ کہ عمل اور صنعت پر سابق اور مقدم ہو کر مثلاً
ریل اگر ایجاد ہوئی ہے تو نہ اس صورت سے کہ موجد نے پہلے اپنی عقل سے اِس صنعت کی
ہیئت کذائی کا تخیل قائم کیا اور اُس کے مطابق ایجادی عمل شروع کر دیا نہیں بلکہ جوش مارتی
ہوئی ہنڈیا کا ڈھکن بار بار اُٹھنے سے بھاپ کی طاقت کا اندازہ ہوا اور اُس سے ذہن اِدھر منتقل
ہو گیا کہ اگر اسٹیم کو بند کر کے چھوڑا جائے تو وہ ہر سامنے کی چیز کو اپنی بے پناہ طاقت سے دھکیل کر
آگے بڑھا دے گی اِس اُصول پر پہیوں کے حرکت میں لانے کی صورت پیدا کر لی گئی پھر اُس کو
گاڑی کی شکل میں لایا گیا۔ پھر انجنوں کی ہیئت کذائی کی طرف رفتہ رفتہ ذہن منتقل ہوا اور آخر کار
پیہم تجربات سے انجن اپنی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں نمودار ہو گیا پھر یہاں عقل نے جتنا
بھی کام کیا عمل کے تابع ہو کر کیا نہ یہ کہ عمل تابع عقل ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ اِس لئے نتیجۃً یہ کہا جا سکتا
ہے کہ اِن مادی صنائع و ایجادات کی بنیاد عقل پر نہیں بلکہ تجربہ اور عمل پیہم پر ہے۔ چنانچہ
مشاہدہ ہے کہ عموماً دستکار اور صناع وہی لوگ زیادہ تر ہیں جن کا دماغ نہ علمی ہے نہ نظری

کہ جس سے عقلیات میں کوئی موشگافی کر سکیں جب ان کے سامنے عقلیات کی باریکیاں آتی ہیں تو وہ مبہوت و حیران نظر آنے لگتے ہیں اور جب صنعت و حرفت کا کوئی عمل آتا ہے تو بایک سی باریک دستکاری میں وہ ایسی فقید المثال نظیریں پیش کر دیتے ہیں کہ دانا بھی انگشت بدنداں ہوجاتے ہیں۔

بہرحال صناعوں اور دستکاروں کا میدان کار عمل ہے نہ کہ عقل و دور اندیشی اور عاقلوں کا میدان کار خود عقل ہے۔ اور عمل اس کے تابع ہے اس لئے یہ کہنا بعید از انصاف نہیں ہے کہ جس مسلح قوم نے محض صنعت و حرفت میں ایسا ہی حصہ نہیں لیا کہ علم و عقل کو اس کے تابع بنا لیا ہو بلکہ اس طرح حصہ لیا کہ تصویری صنعت مقصود اصلی ٹھہرا کر اپنی معنویت بھی فنا کر دیا ہو جو عاجل پر فریفتہ ہو کر آجل کو کھو بیٹھی ہو اور جس نے صورتوں میں پھنس کر حقیقت کا مطالعہ عبث سمجھ لیا ہو ایسی قوم بلاشبہ عقل کے کوچہ سے نابلد اور بے عقلی میں ضرب المثل ہوگی اور کسی طرح بھی اُسے دانشمند اقوام میں شمار نہ کیا جا سکے گا

غرض اُمتِ نصرانیہ کی صورت پسندی بلکہ صورت پرستیوں نے علمی لائن میں تو اُسے علمِ حقیقت سے محروم کر کے بجائے علم دوست ہونے کے حس پسند بنا دیا اور علم کے اُس تنگ دائرہ میں مقید و محدود کر دیا جس میں بہائم کی بھی رسائی ہے کہ وہ بھی حسی ادراک سے محروم نہیں کیئے گئے۔ ادھر عمل کی لائن میں تصنع اور بناوٹ کے جراثیم اُس میں پیدا کر دیئے کہ وہ قدرتی اشیاء کی اصلاح بھی اپنی ساخت سے کر دینے پر تل گئی اور اس طرح حقائق اور حقیقۃ الحقائق سے علماً و عملاً اُسے بُعد بلکہ تنفر پیدا ہو گیا گویا جس مقصد کو انبیاء لیکر آئے تھے کہ انسان مخلوقاتی دائروں سے اوپر ہو کر خالق کی معرفت کا دم بھرے ٹھیک اُس کے بالمقابل

بہ صورت پرست اُمت محروم معرفت بنکر خالص مخلوقاتی دائرہ اور اُس میں بھی مجردات سے بعید ہوکر عنصریاتی مخلوق کی صورتوں اور الوان کے دلدل میں ایسی پھنسی اور پھر اُسی جزئیات کی بھی تو اِس حد پر آ گری کہ صورتوں میں بھی اُسے تصویر اور اپنی ساخت کی صورت، آئینوں کے سوا قناعت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ گویا خالق تک تو کیا پہنچتی مخلوق کے بھی کسی اونچے معیار تک بلند نہ ہو سکی۔

اُمت مسیحیہ پر عذاب الٰہی بھی تصویری اور ایجادی رنگ میں ہی آتا ہے

شاید اسی لئے اس صورت پرست قوم پر مصائب و آفات اور تنبیہی عذاب بھی آتے ہیں تو اسی تصویری اور ایجادی رنگ میں اور یہی صورتیں بجائے راحت ہونے کے عذاب کے وقت باعث کلفت و اذیت بنادی جاتی ہیں۔ کہیں ریلیں لڑ گئیں اور سینکڑوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کہیں موٹروں کی ٹکر ہو گئی اور بیسیوں ختم ہو گئے۔ کہیں بجلی کا تار ٹوٹ گیا اور اُس نے کتنوں ہی کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ کہیں کرنٹ آگیا اور اُس نے کتنوں ہی کی رُوح کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ کہیں بارود کے میگزین کو آگ چھو گئی اور مکان سمیت سینکڑوں اُڑ گئے۔ کہیں بم چلا اور بیسیوں مجروح ہو گئے۔ کہیں گیس پھیلا گیا اور ہزاروں جھلس گئے۔ کہیں ہوائی طیارے اُڑتے ہوئے گر پڑے اور کتنوں ہی کو لے مرے پھر کتنے ہی مہلک آلات جنگ محض اس لئے ایجاد کئے گئے ہیں کہ انسان اپنی ہی بھری پُری آبادیوں کو نہایت آسانی سے ختم کر سکے تیس من کے گولے پھینکنے والی توپیں میلوں مارنے والی رائفلیں وبا کیطرح انسانی جتھوں کو ختم کرنے والی مشین گنیں ہزاروں ٹن وزنی جہازوں کو ایک منٹ میں غرق کر دینے والی آبدوز کشتیاں وغیرہ وہ عذابات الٰہیہ ہیں جو مدعی انسانوں ہی کے

ہاتھ سے جیسا کر اکر انہیں کے سروں پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنی اپنی مہلک ایجادات
کے سبب اپنے ہی ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

بہر حال ہمارا وہ مدعا کافی روشنی میں آگیا کہ ہر اُمت کی ذہنیت اپنے مربی اول کی ذہنیت
کا ثمرہ ہوتی ہے عیسائی اقوام کی ذہنیت بھی قومی حیثیت سے اس مادّی ایجاد و اختراع اور
ان صورت پسندیوں میں بارگاہ عیسوی کی تصویری ذہنیت کا پرتو اور ثمرہ ہے لیکن انہوں
نے اس ذہنیت کو جو اپنی حُدود میں رہکر ایک کمال ہے، صحیح مصرف اور حُدود میں استعمال
نہیں کیا اس لئے وہ ذہنیت بجائے کمال و ہنر بننے کے اُن کیلئے شوم اور نحوست ہو گئی اور
اگر اس تصویری اور ایجادی ذہنیت میں معرفت عیسوی اور انجیلی نظام بھی شامل رہتا تو وہ اپنے
قدرتی نتائج خیر پر ضرور پہنچا دیتی۔

اُمت مسلمہ علمی اُمت ہے جس پر علم و حکمت کا غلبہ ہے

اُمم و اقوام کی ان شئون کو پیش نظر رکھکر دنیا کی اس آخری قوم اور
خیر الامم اُمت اسلامیہ کو لیجئے تو محسوس ہوگا کہ اس کی ذہنیت
بھی اپنے مربی اعظم حضرت اعلم الاولین والآخرین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شان کا ایک
ظل اور پرتو ہونے کی وجہ سے خالص علمی ذہنیت ہے کہ خود آپ کی غالب شان علم و
ادراک اور بصیرت و معرفت تھی جس قوم کا دستور العمل قرآن جیسی جامع اور تبیانا لکل شیء کتاب
ہو کیسے ممکن ہے کہ اس کی ذہنیت علم میں غرق نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ظہور علم کے آلات دو ہی ہیں۔
زبان اور قلم سو ان دونوں کے لحاظ سے اس اُمت نے جن نادر اور غیبی علوم کا انتشار کیا ہے
ہم مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ علمی اُمت علمی کمالات میں اُمم سابقہ سے منزلوں آگے بھی ہے

ورفائق بھی۔ اِس اُمّت کے خطبے۔ تقریریں۔ شعلہ بیانی اور دریا روانی یا سدجہ ہے کہ صرف خود ہی کلام نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی بولنا سکھلا دیا۔ گونگوں کو خطیب بنا دیا ہے زبانوں کو زبان آوری پر قادر کر دیا حالی نے خوب ہی کہا ہے ؎

عرب کی جو دیکھی وہ آتش بیانی ۔ سُنی برمحل اُن کی شیوا بیانی
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی ۔ وہ خطبوں کی مانند دریا روانی
سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم کا ۔ نہ ڈھب یاد تھا شرحِ شادی و غم کا
نہ انداز تلقین و وعظ و حِکم کا ۔ خزانہ تھا مدفون زباں اور قلم کا
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے ۔ تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
نواسنجیاں اُن سے سیکھیں سب نے ۔ زباں کھول دی سب کی نطقِ عرب نے

تصنیف کے میدان میں اُمّتِ مسلمہ کا وفورِ علم

قلم کو دیکھو تو کثرتِ تصانیف (بقول زرقانی صاحب مواہب) اِس اُمّت کی خصوصیت ہے۔ کتب خانے آباد ہی اُن کی تصانیف سے ہیں کسی علم اور فن کو نہ چھوڑا کہ اُس میں بے شمار ذخیرے جمع نہ کئے ہوں۔ خلافتِ عبّاسیہ کے دور میں عراق کے عظیم الشان کتب خانے خلافتِ اندلس میں اسپین کے کتنے ہی مکتبے۔ حجاز و روم کی لائبریریاں مصر کے بے شمار ذخیرے۔ ہندوستان کے ہزارہا کتب خانے اور دوسرے محروسہ ہائے اسلامیہ کے سینکڑوں علمی خزانے باوجودیکہ تباہ بھی ہوئے۔ دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھے۔ جلائے بھی گئے کروڑہا کتابیں کیڑوں کی نذر بھی ہوئیں عیسائی حکومتوں نے اپنی پوری طاقتوں سے پچاس پچاس برس کی مدت اُن کے مٹانے اور نذرِ آتش کرانے میں صرف بھی کی (جیسا کہ اندلس میں ہوا) فقد ستار

میں بغداد کا علمی ذخیرہ دجلہ میں ہی بہایا گیا جس سے کئی دن اس کا پانی رنگا رہا اور جب چلا تو کالی روشنائی بن گیا اور صدیوں دو والوں میں استعمال کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اس پر بھی جو ذخیرے آج موجود ہیں اور اب بھی علماء اسلام کی جا بجا کاہیوں سے جو ہزارہا تصانیف منصۂ شہود پر آتی جا رہی ہیں وہ اس مقدار میں ہیں کہ یورپ و ایشیاء کے مطابع چھاپتے چھاپتے تھک گئے مصر کی سلطنت طبع کرتی کرتی تنگ آ گئی ہے مگر ابھی مصنفات کا عشر عشیر بھی پریس کے میدان میں نہیں پہنچ سکا ہے۔

"ہنوز دلشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی"

آجکل کی ہزارہا مطبوعہ کتب میں غیر مطبوعہ کتب کے حوالے ملتے ہیں جن کا کہیں پتہ نشان نہیں۔ سلف کی کتب میں کتنی ہی حسرتوں کا اس پر اظہار ملتا ہے کہ فلاں فلاں تصانیف کاش ہمارے مطالعہ میں آسکتیں۔ یورپ کے موجودہ کتب خانوں بالخصوص جرمنی کے میلوں میں پھیلے ہوئے کتب خانہ میں کثیر حصہ اسلامی مصنفات ہی کا ہے جس میں علاوہ شرعی علوم کو علم معاشیات علم طبیعیات و حیات علم الاسنان۔ علم النباتات۔ علم الحیوانات۔ علم طبقات الارض اور سائنس وغیرہ کی بھی بے شمار کتابیں مہیا ہیں جن سے آج اصل مالک و حقدار محروم ہیں عہد حاضر کی اقتدار یافتہ قومیں ان پر مسلط ہو کر ان سے استفادہ کر رہی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ان سے حاصل کردہ معلومات کو وہ اپنی ہی کاوش طبع کا نتیجہ دکھلا کر دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہی ہوں۔

اُمتِ مسلمہ کا اختراعِ فنون و علوم | پھر یہی نہیں کہ قوم کی ہمت صرف علوم مختلفہ میں تصنیف و تالیف تک محدود رہ گئی ہو نہیں بلکہ مستقلاً خود علوم و فنون بھی پیدا کر کے اور بہ اختراعی طور پر بلکہ قرآن کریم

سے استنباط کرکے تصنیفوں کے میدان بھی استوار کردیئے مسلمانوں نے اپنی مقدس علمی کتاب کے تحفظ کیلئے جو حقیقتاً علم الٰہی کا تحفظ تھا سب سے پہلے اس کے رسُوم و نقوش کی حفاظت ضروری سمجھی کہ انہی سے الفاظ تک رسائی ہوتی تھی۔ اور کتابتِ قرآن کے سلسلہ میں علم رسم الخط کی بنیاد ڈالی تاکہ رسمِ کتابت میں کوئی ادنیٰ احداث یا اختراع راہ نہ پاسکے۔ پھر طریق ادا اور تجویدِ تلاوت کے لئے علم تجوید مُدوّن ہوا پھر قرأتیں چونکہ مختلف تھیں اور ہر ایک مقبول تھی اس لئے یہیں سے علم وجوہ القراءۃ نکلا۔ معانی کے دائرہ میں آیاتِ قرآنی کی تشریح اور مرادِ الٰہی کے واضح کرنے کی ضرورت تھی تو علم التفسیر کا آغاز ہوا۔ پھر قرآن کے عربی ہونے کے سبب تفسیر میں عربیت کی ضرورت تھی تو علم الادب کی بنیاد پڑی۔ پھر علم ادب کے لئے لُغت۔ محاورات قواعدِ زبان، بلاغت اور قوانین فصاحت کی تشریحات لازمی تھیں تو تقریباً بارہ علوم علیحدہ علیحدہ مدوّن کئے گئے یعنی علم لغت۔ نحو۔ صرف۔ اشتقاق۔ معانی۔ بیان۔ بدیع۔ ضربُ الامثال وغیرہ۔ پھر تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اقوالِ پیغمبر کی ضرورت تھی جو قرآن کی اصل تفسیر تھی تو علم الحدیث کی بنیاد پڑی روایاتِ حدیث کو پرکھنے کیلئے ایسے قوانین و اصطلاحات کی ضرورت تھی جن کے ذریعہ فنِ حدیث کی صحیح و سقیم میں باہم امتیاز کیا جاسکے تو یہاں سے علم اصولُ الحدیث کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ادھر روایات میں راویوں کے ثقہ غیر ثقہ ہونے اور اُن کی تاریخی حیثیت معلوم رہنے کی ضرورت آپڑی کہ حدیث کی صحت و سقم کا بڑی حد تک رُواۃ کی دیانت و عدالت سے بھی تعلق تھا تو یہیں سے علم اسماء الرّجال نکلا پھر راویوں پر تنقید اور جرح قدح کرنے کیلئے کسی نہ کسی معیار کی حاجت تھی جس سے اُن کے

ردوقبول کا فیصلہ کیا جائے تو اُس کے لئے علم الجرح والتعدیل کی بنیاد رکھی گئی اور اس طرح فن حدیث اَوجِ کمال پر پہنچا۔ پھر تمام احکامِ شریعت قرآن وسنّت میں اسی طرح مُندرج او لپٹے ہوئے تھے جس طرح شاخیں بیج میں مخفی ہوتی ہیں اُن کو نکالکر باب وار الگ الگ رکھنے کی ضرورت تھی تو یہاں سے علم الفقہ نکلا۔ پھر استخراج احکام کے لئے قوانین استخراج لازمی تھے تو یہیں سے علم اصول الفقہ کی عمارت کھڑی ہوئی اور پھر قوانین کے ذریعہ استنباط احکام کرنے میں چونکہ آراء وقیاسات کا تخالف بھی ممکن تھا جس کے مقبول ومردود ہونے کے لئے ایک قانون کی ضرورت تھی تو علم الجدل والخلاف کی تدوین ہوئی ادھر دین کی بنیاد اُس کے عقائد تھے اور اُنہی پر معاندوں کے فلسفیانہ حملوں کے خطرات تھے تو علم الکلام مدوّن ہوا۔ قرآن نے اقوامِ عالم کے وقائع اور عالم کے حوادث کا باب رکھا تھا اُس کی تفصیل کیلئے علم التاریخ قائم ہوا۔ پھر وقائع واحوال میں ذیلی اور ضمنی حالات کو چھوڑ کر ایک حصّہ عبرت واقعات کا تھا جس پر نتائج کا مدار تھا اور اسی کو قرآن نے اختیار کیا تھا اُس کو مشخص کرنے کیلئے قواعد کی ضرورت تھی تو اُس کیلئے علم اُصول القصص مرتب کیا گیا پھر قرآن نے زمین اور اُس کی مختلف پیداوار جمادات ونباتات کے اسرار واحوال پر اُصولاً مطلع کیا تھا تو اسی سے علم طبقات الارض نکلا اور پھر زمین کی مختلف شانوں اور قطعات کی نیرنگیوں سے جب اقالیم کی تقسیم کی گئی تو یہیں سے علم جغرافیہ ہویدا ہوا۔

پھر انہی جمادات ونباتات وغیرہ کے طریق استعمال اور لین دین کے طرز وانداز جنکی حدود قرآن نے قائم کر دی ہیں "علم المعیشۃ" کی بنیاد پڑی پھر اس کتاب اللہ کی بیان کردہ حیوانی

اور انسانی ساخت اور اُس کی مادّی اور رُوحانی خلقت اور مُقتضیات مزاج وغیرہ کی تفصیلات سے علم النفس کی بنیاد پڑی اور پھر نفس کی اصلاح اور رذائل اخلاق کی تعدیل کے سلسلہ میں جو قرآن کا ایک خاص موضوع ہے علم التصوف پیدا ہوا تذکیر ونصیحت کے مؤثر پیرا ئے جمع ہو کر علم الوعظ کی بنیاد پڑی پھر نفسِ انسانی کی موت پر ترکہ اور سہام میراث تقسیم کرنے کی تفصیلات کو ایک جگہ مدون کیا گیا تو علم الفرائض کی بنیاد پڑی اور اُن حصوں کی تقسیم میں چونکہ حساب کا دخل لازمی تھا تو علم الحساب کو اَوج کمال پر پہنچایا گیا اور علم جبر و مُقابلہ کی بنیاد ڈالی گئی غرض پیدائش سے لیکر موت تک مادّی و روحانی زندگی کے شعبوں کے لئے عمل کے جس قدر موضوع بھی قرآن نے قائم کئے تھے اُمّت نے قرآنی سمندر میں سے علمی انداز نکالکر انہیں جُدا جُدا عُلوم وفنون کی صورت میں قائم کیا ہر فن کے اُصول وقواعد مُنضبط کئے مبادی اور مقاصد کی تنقیح کی۔ مسائل میں طبعی ترتیبیں قائم کرکے اُنہیں سہل الوصُول بنایا۔ مباحث فن کو ابواب وفصول پر تقسیم کرکے سہل المآخذ کیا اور علم کے سلسلہ میں اُن علوم وفنون سے اپنی سماوی کتاب کی وہ محیر العقول خدمت انجام دی کہ دنیا کی سابقہ اور موجودہ اقوام کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہگئیں اور ہر ایک قوم علم کی ان عجیب وغریب تنقیحات سے عاجز ودرماندہ رہکر بالآخر مسلمانوں ہی کی خوردہ چینی پر مجبور ہوئی۔

پھر ان سینکڑوں علوم کی خدمت اور انہیں اَوج کمال پر پہنچانے کے لئے بھی اُمت نے اپنے خاص سلیقہ سے (جو اُس کی علمی ذہنیت کا ثمرہ تھا) تقسیم عمل سے کام لیا ہر فن کے لئے ایک ایک مُستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے اُس فن کی حفاظت وصیانت اور ترقی کیلئے

اپنی عمریں وقف کردیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ کو حافظ نے طریق ادا کو قرار نے رسم الخط کو کتبہ نے فصاحت وبلاغت کو ادبار نے معانی کو مفسرین نے فروعات احکام کو فقہا نے قواعد تفقہ کو اصولیوں نے اصول عقائد کو متکلمین نے محاجات کو مناظروں نے الٰہیات کو فلاسفہ اسلام نے اخلاق کو صوفیاء نے حقائق کو حکماء اسلام نے قصص کو مؤرخین نے عبر وامثال کو واعظوں نے سنبھالا اور ہر ایک فن میں بے شمار کتابوں کے ذخیرے فراہم کردیئے جنکا شمار آج مورخوں کے حیطۂ اختیار سے خارج ہے حتٰی کہ محض قرآنی علوم اور اُن کے مرتّب شدہ ذخیروں کی شمار بتلانے کے لئے ایک مستقل فن علم الاسامی والفنون کے نام سے وضع ہوا جس میں کتنی ہی تصانیف ہوئیں جیسے کشف الظنون وغیرہ ادہر علمی طبقات اور اُن کے نامور مصنفین کے سوانح وتراجم کا پتہ دینے کے لئے ایک مستقل علم کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام علم طبقات رکھا گیا اور جس میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ جیسے طبقات الشافعیہ۔ طبقات ابن سعد۔ طبقات حنابلہ۔ طبقات الحنفیہ وغیرہ۔ پھر یہ تو وہ اُصول علوم ہیں جنہوں نے مستقل صورتیں پیدا کرلیں ورنہ ذیلی اور فروعی فنون کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جو ہیں اُمت سے وقتاً فوقتاً نمایاں ہوئے اور دُنیا کے لئے علمی سیرابیوں کا بے نظیر ذریعہ ثابت ہوئے۔ حالی نے خوب کہا ہے۔

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت ۔۔۔ طبیعی الٰہی ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت ۔۔۔ سیاست تجارت عمارت فلاحت

لگاؤ گے کھوج اُن کا جاکر جہاں تم
نشاں اُن کے قدموں کا پاؤ گے واں تم

اسلامی مصنفوں کے طبقات | پھر یہ ایسے عظیم الشان علمی کارنامے جماعتوں یا حکومتوں کے رہین منت نہیں بلکہ اُمت نے ایسے ایسے افراد و آحاد علماء بے شمار پیدا کئے جن میں سے ایک ایک عالم دینی وُسعت علم کے لحاظ سے ایک ایک اُمت کی برابر ثابت ہوا۔ وہ اُس کی تنہا شخصیت نے وہ کچھ کر دکھلایا جو عادتاً جماعتیں بلکہ بھی نہیں دکھلا سکتیں۔ ابن کثیر تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو آدم علیہ السلام سے شروع کر کے اپنے زمانے تک کے وقائع بارہ جلدوں میں محدثانہ طرز پر قلمبند کرجاتے ہیں۔ امام محمد قید خانے کے کنویں میں محبوس رہکر منڈیر سے سُننے والے شاگردوں کو فقہ کا املا کراتے ہیں تو تیس جلدوں میں مبسوط لکھا دیتے ہیں۔ ابن جریر طبری قرآن کریم کی تفسیر لکھنے بیٹھتے ہیں تو اسی جلدوں میں قلمبرداشتہ لکھ جاتے ہیں۔ یعقوب بن شیبہ بصری جب اپنی مسند تصنیف کرتے ہیں تو صرف ایک کتاب کی تکمیل کا اندازہ دو سو جلدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ چالیس کاتب بیٹھتے ہیں اور ایک مصنف کی صرف ایک تصنیف کی کتابت کرتے ہیں۔

پھر یہ صرف ایک ایک ہی کتاب کی اتنی اتنی مجلدات ہیں۔ ایسی ایسی کتابیں جو مجلدات پر مشتمل ہوں یہ نہیں کہ علماء نے ایک دو ہی تک لکھی ہوں بلکہ ایک ایک عالم کی تصانیف کا عدد دہائیوں اور سینکڑوں سے بھی متجاوز ہے۔ مثلاً شیخ جلال الدین سیوطی نے اپنی تصانیف کی فہرست خود اپنے ہی ایک رسالہ شذرات الذہب میں پانچسو تک شمار کرائی ہے۔ ابن تیمیہ اُٹھتے ہیں تو بڑی بڑی پُر مغز علمی تصانیف کا عدد پانچسو سے اُوپر پہنچا دیتے ہیں۔ ابن جریر طبری کی وفات کے بعد لکھائی کی روشنائی کا حساب کرنے پر اندازہ کیا گیا کہ ایک ہزار رطل (روشنائی کتابت علوم اور تصنیف میں صرف ہوئی ہے۔ اور ایسی علماء کی

تعداد تو شمار سے باہر ہے جنہوں نے کتنی ہی دہائیاں تصنیف کر کے بطور یادگار دنیا میں چھوڑی ہیں۔

غرض ایک ایک جبر اُمت اُٹھتا ہے اور دہائیوں سے متجاوز ہو کر سینکڑوں اور سینکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک اپنی تصانیف کا عدد پہنچا دیتا ہے۔ اور الحمد للہ کہ آج تک بھی اُمت ایسے آحاد و افراد سے خالی نہیں ہے۔ آج ہی کے انحطاط پذیر دور میں جامعۂ دیو بند کے مایۂ ناز فرد حضرت حکیم الامۃ مولانا محمد اشرف علی تھانوی متعنا اللہ بطول بقائہ کو دیکھ لو کہ تیس چالیس برس کے عرصہ میں علوم کے سینکڑوں قابل تدریس صحیفے مرتب کر دئیے جن کی مختلف علوم و فنون کی مختلف اللغات نظم و نثر تصانیف کا عدد آٹھ سو سے متجاوز ہو چکا ہے اور جن میں وہ ضخیم عظیم کتابیں بھی شامل ہیں جو کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں اور الحمد للہ کہ ہنوز سلسلۂ تصنیف جاری ہے اگر علم کی اس تصنیفی لائن کا جو اُمت مسلمہ نے اکر بچھائی اسلام سے اُدھر کوئی وجود نہیں ملتا تو پھر کس طرح اس بارہ میں اُمت مرحومہ کو یکتائے زمانہ اور فرد فرید تسلیم نہ کیا جائے؟ واقعہ بھی ہے کہ کوئی قوم بھی اپنے گھر کی کتب یا تعلیمات سے بلند نایف اور جامع علوم اور علم کے ایسے جامع اور پاکیزہ عنوانوں کا پتہ نہیں دے سکتی جن کا اس اُمت نے پتہ دیا ہے۔ بلکہ اگر زبان و قلم کے میدان میں آج کسی غیر نے قدم بھی رکھا ہے تو وہ اُسی نقش قدم پر چلنے کے لئے مجبور ہوا ہے۔ جو علمائے اسلام ڈال گئے تھے۔ اور اس لئے جس غیر کی کتاب میں بھی کوئی علمی ترتیب اور حکمت کی تالیف نظر پڑتی ہے یا بعینہ اُن کی نقل ہوتی ہے یا سرقہ اور یا اُن سے فیض یافتہ ذہنیت کا ثمرہ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ علمی میں طلوع آب

ہوئے اور آپ کی شان غالب علم وحکمت تھی اسی طرح آپ کے طفیل اور برکت اقدام سے یہ
اُمت بھی علمی بارگاہ سے فیضیاب ہوئی اور علمی اُمت بن گئی ہاں پھر چونکہ علم ہی معانی و
حقائق کھولتا اور مستور و غائب ماہیتوں کو منکشف کر دیتا ہے اس لئے اُمتِ مسلمہ ایک
حقیقت دوست اور باطن پسند اُمت ثابت ہوتی ہے جس کے یہاں صورتوں کی
وقعت کے بجائے صرف حقائق اور معانی ہی کو مقبولیت حاصل ہے۔

عُصاۃ مسلمین پر عذاب علمی ہی نوعیت لئے ہوئے آتا ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ اُمم سابقہ کے وطیرے کے موافق اگر موسوی
اُمت کے گنہگاروں پر شانِ تقلیب سے عذابات آئے اور عیسوی
اُمت کے عاصیوں کو شانِ تصویر و ایجاد کے راستہ سے سزائیں بھگتنی پڑیں جیسا کہ واضح ہو چکا
ہے اسی طرح اس علمی اُمت پر بھی اگر معاصی کے سبب مصائب وفتن کا دروازہ کھل سکتا تھا تو
وہ زیادہ تر علم ہی کی لائن پر کھلنا چاہیے تھا کہ اُمت کی شان غالب ہی علم ہے جس کی صورت
یہی ہو سکتی تھی کہ علم کا سب سے بڑا فتنہ جو ایک عالم کے حق میں زیادہ سے زیادہ مصیبت و عذاب
بن سکتا ہے شبہات کا فتنہ ہے کہ اصل منکشف نہ ہو اور اوہام و ظنون علم کی صورت اختیار
کر لیں جس سے ایک انسان اصل حقیقت سے بعید ہو کر خلافِ حقیقت ایک نیا راستہ اختیار
کر لے اور ظاہر ہے کہ ہر نیا راستہ جبکہ پرانے راستہ پر چلنے والے موجود رہیں قدرتی طور پر اختلاف
نزاع کی بنیاد قائم کر دیتا ہے۔ پھر جتنے بھی شبہات ہوتے ہیں اُتنے ہی نزاعات کے محاذ
قائم ہو جاتے ہیں اور اس طرح قدامت و جدت کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جدید و قدیم
پارٹیاں قائم ہو کر قوم میں باہم رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے ہر نئی پارٹی قدیم حصہ سے ٹکرا کر اپنا

یہ نومولود وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور قدیم پارٹی اُس کی مدافعت کر کے حق کو واضح کرنے کی جد و جہد کرتی ہے اور اس طرح دونوں طبقے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ گو عند اللہ ایک محق اور ایک مبطل ہوتا ہے مگر اپنی اس علمی زور آزمائی میں تکلیف و اذیت دونوں پاتے ہیں تفسیق و تضلیل بلکہ تکفیر تک کی گرم بازاری شروع ہو جاتی ہے اور پھر عوام اُمت کی آمیزش سے باہمی سبّ و شتم۔ لعن طعن۔ دل آزاری۔ ایذا رسانی۔ آبرو ریزی۔ تحقیر و تذلیل اور استہزاء و تمسخر جیسے ناپاک مشاغل کیلئے قوم کا پورا وقت فارغ ہو جاتا ہے۔ پس قوم کی قوم ایک دوسرے کے ذریعہ آفات و فتن کا مزہ چکھتی رہتی ہے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ اُس کی بدکرداریوں کی سزا کیلئے آسمان و زمین کے عناصر کو متوجہ کیا جائے بلکہ اگر اُمت علمی تھی تو اُس پر قہر و انتقام بھی آسمان و زمین میں سے اُبھرنے کی بجائے خود اُنہی کے قلوب کی گہرائیوں میں سے علمی رنگ میں اُبلتا ہے یعنی علمی شبہات سے اختلاف مسائل اور اُس سے فرقہ وارانہ جنگ چھڑ کر ساری اُمت اپنے ہی ہاتھوں مبتلائے آلام و مصائب کر دی جاتی ہے۔ یعنی قانون فطرت کے مطابق بدکرداریوں پر جہاں اور اقوام کو عذاب دیا گیا وہاں اُمتِ اسلامی بھی اس قانون عام سے مستثنیٰ نہیں کیگئی مگر یہ فرق پھر بھی ملحوظ رکھا گیا کہ اور قوموں پر تو مادی عناصر اور زمین و آسمان مسلط کئے گئے جو خود انسانی خدمتگار تھے۔ گویا غلاموں کے ذریعہ آقاؤں کو سزائیں دلائی گئیں جبکہ وہ آقائے واحد سے پھر گئے پس اس عذاب میں تعذیب کیساتھ توہین بھی شامل رکھی گئی۔

لیکن اس علمی اُمت کو جو خیر الامم بنائی گئی تھی اور جسے علم جیسی افضل الصفات کے سایہ میں پالا گیا تھا معاصی پر سزا دینے کے لئے انسانی خدمتگاروں آگ پانی، ہوا، مٹی کو نہیں اُبھارا گیا نہ پتھر

برسا کر پتھراؤ کیا گیا نہ طوفان آب و ہوا میں بہایا گیا اور نہ آتش سوزاں سے ہلاک کرنے کی صورت پیدا کی گئی۔ بلکہ اُمت کی سزا خود اُمت ہی کو سپرد کر دی گئی کہ نزاع و جدال اور اختلاف کے ذریعہ یک دوسرے کو مزا چکھا تا رہے۔ تا کہ اُمت کی خیریت و فضیلت کا راز (جو درحقیقت شاہ اُمت کی خیریت و فضیلت کا پرتو ہے) اس تعذیب کے پردہ سے بھی نمایا ہوتا رہے۔ ورنہ اگر اس علمی دور میں بھی اس خیر اُمت کو مادی اُمتوں کی طرح عناصر ہی کے ذریعہ عذاب بھگتنا یا جاتا تو صورت یہ آپڑتی کہ اُمت کے کفار تو سائنس کے ذریعہ ان عناصر کو غلام بنا کر آگ پانی سے تمدنی خدمتیں لیتے اور اُمت کے ایماندار اُنہی مسخر عناصر کے ذریعہ ذلیل و رسوا ہوتے ظاہر ہے کہ اس میں تعذیب کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر توہین تھی جو پہلی مادی اُمتوں کیلئے روا رکھی گئی اس لئے غیرت خداوندی نے اس صورت کو گوارہ نہ کرتے ہوئے اُمت کی سزا ہی اُمت کے سپرد کر دی کہ تنبیہ تو کافی ہو مگر اپنے ہی مسخرات و خادمہ کے ہاتھوں توہین تذلیل نہ ہو۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ	آپ کہئے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ	عذاب تمہارے اُوپر سے بھیجدے یا تمہارے پاؤں
اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ	تلے سے یا کہ تم کو گروہ گروہ کرکے سب کو بھڑا دے۔ اور
بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ	تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے۔

دُنیا کی کوئی قوم اُمت مسلمہ کی ٹکر نہیں لے سکتی

بہرحال ہم نے ابتک چار قوموں کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ مشرکین جنکی ذہنیت تنزیہی ہے۔ یہود جن کی ذہنیت تقلیبی ہے۔ نصاریٰ جن کی ذہنیت تصویری ہے۔ حنفاء (مسلمین) جنکی ذہنیت تحقیقی یا علمی ہے اور ظاہر ہے کہ دنیا میں

بھی چار اقوام ہیں جو ربع مسکون کے مختلف طبقوں میں آباد ہیں اور ہر ایک نے اپنی ذہنیت کے مطابق دنیا میں متفاوت اور مختلف المراتب تصرفات کئے جن کے ذریعہ ہر ایک کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

مشرکین کا حشر: ان میں سے مشرکین ایک جہالت زدہ قوم ہے جو نہ اپنی کسی مستند کتاب کا پتہ دے سکتی ہے جس سے اس کی قومیت کا مذہبی شیرازہ مستحکم نظر آئے اور نہ اقوام عالم میں کسی قابل ذکر ذہنیت اور کسی خاص شان عمل کا اس میں نشان ملتا ہے کہ اس کے معیار ہی سے ان کے متعلق کوئی وزنی رائے قائم کی جاسکے وہ دائرۂ عمل میں اپنی تنزیہی ذہنیت کے سبب عمل کے بجائے ترک عمل اور عائشہ افعال کی جگہ ترو ک کو اختیار کئے ہوئے ہیں جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے۔ اس لئے مشرک اقوام بت پرست ہوں یا عناصر پرست سیارہ پرست ہوں یا اشخاص پرست۔ پھر کسی خطہ کے بھی ہوں حقیقتاً ان کی عمارت کسی بنیاد ہی پر قائم نہیں کہ وہ مذہبی معیار سے قابل بحث ہوں۔ توہمات۔ آبائی رسوم۔ کہنہ داستانوں۔ قدیم الروایات رواجوں۔ من گھڑت خوش اعتقادیوں یا زیادہ سے زیادہ چند فلسفیانہ نظریوں کے سوا ان کی قومیت اور مذہب کا کوئی بھی سہارا نہیں مختلف انواع شرک نے ہر خطہ کی مناسب شکلیں اختیار کر کے ان کی قومیتوں کی تقویم کر دی ہے اس لئے ہر مشرک قوم کو بجائے حقیقی قوم سمجھنے کے کسی سچی قوم کا بگڑا ہوا انجام سمجھ لینا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی قومیت ہی نہیں کہ اُسے اقوام ذیل میں شمار کیا جائے بلکہ فنا ر قومیت ہے جس پر قومیت کا نام محض مجازاً آسکتا ہے اور بس اس لئے اُس کا کوئی پہلو قابل بحث ہی نہیں رہتا کہ ہم اُسے اس لئے

موضوع بحث ٹھہرائیں۔ پس اب بلحاظ کتاب و آئین عمل جن کی قومیت پر نگاہیں اُٹھ سکتی ہیں اور جنہیں قومی معیار سے ایک منضبط سوادِ اعظم کہا جا سکتا ہے تین قومیں ہو جاتی ہیں یہود، نصاریٰ، مسلمین

یہود کا انجام | لیکن اُن میں سے یہود گو ایک زبردست قومیت کے مالک ہوئے اور ایک دور میں دنیا پر بلحاظ مذہب و قومیت چھا بھی گئے مگر چونکہ ان کی تقلیبی ذہنیت میں موسوی معرفت نے جگہ نہ پکڑی تو ذہنیتوں میں صرف تقلیب ہی تقلیب کا جذبہ باقی رہ گیا جس کا انجام تخریب نکلا یعنی اُن میں ماہیات اور حقائق کو الٹ پلٹ کر دینے کا رنگ تو کافی موجود رہا۔ مگر محل اور موقع کو پہچان کر تعلیمی تصرفات کرنے کی صلاحیت یکسر گم ہو گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے معرفتی اور کج فہمی کے ساتھ جب انہوں نے تقلیب ماہیات کا راستہ اختیار کیا تو بجائے تبدیل کے سرے سے حقیقتیں ہی گم ہونی شروع ہو گئیں اور اُن کی جگہ باطل آ ٹھہرا جس کو اُنہوں نے بآسانی سنبھال لیا اور اس طرح ایک ایک حقیقت کو گم کر کے اس کی جگہ باطلات کے ذخیرے جمع کر لئے پس جو کہا او ندھا کہا اور جو کیا اُلٹا کیا۔ اعتقاد ہو یا عمل اس الٹ پلٹ میں باطل سے حق کی طرف نہیں آئے بلکہ حق سے باطل کی طرف پھرے اس لئے یہ تقلیب اُن کے حق میں بصورت تخریب ظاہر ہوئی۔

(۱) مثلاً دینی عقائد کے سلسلہ میں خدا پر ایمان لانے کا وقت آیا تو کہدیا بھلا بن دیکھے خدا کو کیسے مان لیں۔

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً	ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے یہاں تک کہ ہم خود دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ۔

(۲) نبیوں کی تصدیق کا وقت آیا تو انبیاء کی تکذیب اور قتل شروع کر دیا۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا — کیا جب کبھی بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے

تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ — جنکو تمہارا دل نہ چاہتا تھا تب ہی تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ — سو بعضوں کو تو تم نے جھوٹا بتایا اور بعضوں کو بیدریغ قتل کر ڈالتے تھے

(۳) کتاب اللہ دی گئی تو اس میں ہوائے نفس کے مطابق بدل سدل شروع کر دیا۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ — وہ لوگ کلام کو اس کے مواقع سے بدلتے ہیں۔

(۴) آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا تو بے فکری سے کہدیا کہ ہم تو خدا کے رشتہ دار ہیں ہمارا کوئی کیا کر سکتا ہے۔

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ — ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

(۵) جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا تو کہا اونہہ دو چار دن اس میں رہ بھی لئے تو اس سے کیا ہوتا ہے

لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً — ہم کو آتش دوزخ چھوئے گی بھی نہیں مگر بہت تھوڑے روز جو انگلیوں پر شمار کرلئے جا سکیں۔

(۶) جنت سے محرومی پر ڈرایا گیا تو بہت اطمینان کے ساتھ بولے کہ اجی جنت کے ٹھیکیدار تو ہم ہیں

لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ — بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں۔

(۷) پھر از خود سلسلہ اعتقادات میں فرمائش کی تو کاہے کی؟ بت پرستی کی۔

يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ — اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک بت ایسا ہی مقرر

لَهُمْ اٰلِهَةٌ ط — کر دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں۔

(۸) اعمال کے سلسلہ میں جب جہاد کا حکم دیا گیا تو کہہ دیا کہ بس اب تم اور خدا ہی لڑائی بھڑائی کر لو ہم تو آرام سے یہیں بیٹھے رہیں گے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ — آپ اور آپکے اللہ میاں چلے جائے اور دونوں لڑ بھڑ

اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ○ — لیجئے ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔

(۹) بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ کے وقت کہا گیا کہ جھک کر تواضع سے داخل ہو کلمات استغفار (حِطَّةٌ حِطَّةٌ) کہتے ہوئے چلو تو جھکنے کے بجائے سرینوں کے بل پیروں سے داخل ہوئے اور حِطَّة کے بجائے کلمات خورد و نوش حِنْطَةٌ گیہوں اور جو وغیرہ کہتے ہوئے گھسے،

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ — اور دروازے میں داخل ہونا عاجزی سے جھکے جھکے

قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ — اور زبان سے کہتے جانا کہ توبہ ہے توبہ ہے ہم معاف

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ — کر دیں گے تمہاری خطائیں۔ اور ابھی مزید برآں اور دیں گے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ — دل سے نیک کام کرنیوالوں کو سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک

الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ — کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جسکے کہنے کی ان سے فرمائش کی گئی تھی

(۱۰) نبی سے فرمائش کرنے پر آئے تو وہ اونچی اور ذلیل خواہشیں کیں کہ عقل و دانش و وقار و سنجیدگی نے سر پیٹ لیا من و سلویٰ کی جگہ کیا مانگا؟ پیاز و لہسن۔

لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ — روز کے روز ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے

فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا — آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے

مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا	لئے ایسی چیزیں پیدا کر جو زمین میں اُگا کرتی ہیں ساگ ہوا
وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا	ککڑی ہوئی گیہوں ہوا مسور ہوئی پیاز ہوئی۔

(۱۱) غرض اس کجرفتار قوم کی حالت یہ تھی کہ

وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا	اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی اُن پر ایمان نہ لاویں
بِهَا ۚ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ	اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اُس کو اپنا طریقہ نہ
لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا	بناویں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسکو
سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ	اپنا طریقہ بنالیں۔

اِن تمام شواہد میں اپنی تقلیبی ذہنیت کے ماتحت جب حقائق کے بدل سدل پر آئے تو تمام حقائق واقعیہ کو تو چھوڑ بیٹھے اور پلٹ کر تمام باطل اور خسیس چیزوں پر آترے اس لئے نفس تقلیب تو کام کرتی رہی مگر جو چیز اس جذبۂ تقلیب کو حدود پر قائم رکھتی یعنی علم و معرفت سو وہ باقی نہ رہی اس لئے اس اُمت کی اصل بنیاد ہی منہدم ہو گئی۔ پس اپنے اِس تقلیبی بگاڑ کے سبب مادی نعمتوں کی تو اُنہوں نے یہ قدر دانی کی کہ پیاز و لہسن پر آگئے اور روحانی نعمتوں کی یہ گت بنائی کہ توحید سے منحرف ہو کر صریح بت پرستی کے سوال پر اُتر آئے۔ اور خدا کی بے انتہا مادی و روحانی نعمتوں کو ایسی ذلیل حرکتوں سے ٹھکرایا کہ گویا وہ عزت کی بجائے ذلت اور مہر کی بجائے قہر کے خود ہی طالب ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کی غیرت مطلق نے اُن کی یہ مونھ مانگی مراد پوری کر دی۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور جم گئی اُن پر ذلت اور پستی کہ دوسروں کی نگاہ

وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ	[illegible] قہر، اور خود آ گئے اُولوالعزمی سے ہی اور مستحق ہو گئے
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ	غضب الٰہی کے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ	ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا	ناحق اور نیز یہ اس سبب سے ہوا کہ اُن لوگوں نے اطاعت نہ کی
يَعْتَدُوْنَ ۟	اور دائرہ اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

بہرحال یہود میں اس تقلیب بلا معرفت کے ماتحت بنے بنائے کو بگاڑ دینے کی تو کافی اسپرٹ قائم ہو گئی مگر قائم شدہ حقائق و صور کو موزوں نہج پر بدل سدل کرنے اور اُن سے انقلابی کام لینے کی صلاحیت نہ آئی۔ اس لئے اُن کی یہ تقلیب تخریب کے ہم معنی ہو کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ تخریب محض جس میں تعمیر کا کوئی پہلو نہ ہو کیا قابل ذکر شے رہ جاتی ہے کہ اُس کے تذکروں کو موضوع بنا کر چھیڑا جائے۔ پس مشرکین تو اپنی تنزیہی ذہنیت کی بدولت ابتداء ہی سے اعمال کی ہنگامہ آرائی کے بجائے ترک اور بچاؤ کی ہٹ دھرمی میں گرفتار رہے جس سے قابل بحث نہ ٹھہرے اور یہودی اپنی اس تخریبی ذہنیت کے ماتحت گو عمل سے بچے تو ہیں مگر ان کے افعال کی لائن بنے ہوئے کو بگاڑ دینے اور حق کو باطل کر دینے کی طرف جاتی ہے۔ اس لئے یہ قوم بھی کسی دلچسپ بحث کا موضوع بنانے کے قابل نہ رہی کہ ہنگامہ آرا اقوام کے ذیل میں اُس کا تذکرہ کیا جائے۔

اُمت مسلمہ اور اُمت مسیحیہ میں حقیقی اور اصولی تقابل ہے۔

اس لئے اب اگر دنیا کے اس آخری دور میں کچھ اقوام ایسی باقی بچی ہیں جن کے جوش عمل اور کارگزاریوں نے ترقیات کا سہرا سر کیا زندگی کی ہنگامہ خیزیاں جن کے بازوؤں اور قوت عمل کی بدولت قائم رہیں اور جنکی اُلجھو سازیاں

کے اثرات عالم میں چرچے ہوئے تو وہ صرف دو ہی قومیں رہ جاتی ہیں نصاریٰ اور حنفاء (مسلمان)، ادھر کائنات کے میدان عمل بھی اتفاق سے دو ہی رہ جاتے تھے۔ مادیات اور روحانیات یا صورت اور حقیقت اس لئے ان میں سے ہر ایک قوم اپنی اپنی فطری رفتار کے ماتحت ایک ایک میدان کی طرف بڑھ گئی۔

دونوں قوموں میں حس اور علم کی باہمی نسبت

امت مسیحیہ کا رخ تو اپنے مربی اعظم حضرت مسیح علیہ السلام کی تصویری و ایجادی تربیت کے ماتحت تصویر و ایجاد اور مادی اختراعات کی طرف ہو گیا اور امت مسلمہ کا رخ اپنے مقتدائے اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و ادراکی تربیت کے ماتحت علمی انکشافات، حکم و معارف اور دقائق و حقائق معنویہ کی طرف ہو گیا۔ ایک قوم عالم شاہد کی طرف جھک گئی اور ایک عالم غیب کی طرف بڑھ گئی ایک نے مادیات کے خزانے کھولے اور ایک نے روحانیات کے سربستہ راز آشکارا کئے اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور ان کی صورتیں جسمانی ہونے کے سبب آنکھوں سے دیکھنے کی چیزیں ہیں اور حقائق اور ان کے باطنی الوان معنوی ہونے کے سبب علمی آنکھ یعنی فراست و عقل سے مشاہدہ کرنے کی چیزیں ہیں اس لئے قدرتی طور پر نصرانی امت اپنی صورت پسندیوں کی بدولت علم و خبر کی میدان میں حس سے آگے نہ بڑھ سکی اور مسلم قوم اپنی حقیقت دوستی کی بدولت علم و معرفت کی منزل مقصود پر جا پہنچی۔ وہ ہر ہر امر میں حسی مشاہدہ کی طالب ہوتی اور یہ ہر ہر جزو میں علمی ادراک کی دلدادہ رہتی ہے۔ وہ محسوسات میں الجھ گئی ہے یہ معقولات و وجدانیات کی طرف دوڑتی ہے وہ جزئیات میں رہ جاتی ہے یہ کلیات و اصول میں منہمک ہوتی ہے۔

اُمّت نصرانیہ چشم دید کی دلدادہ ہے اور اُمّت مسلمہ صوابدید کی۔

صورت پسند نصاریٰ ہر معاملہ میں چشم دید کے دلدادہ ہیں اور جب تک کسی امر کا عینی مشاہدہ نہ ہو جائے اُنہیں یقین آنا سخت دشوار ہوتا ہے لیکن حقیقت پسند اُمّت مسلمہ بجائے چشم دید کے صوابدید کی دلدادہ ہے اگر اُسے کسی چیز کا صواب اور حق ہونا واضح ہو جائے خواہ چشم دید سے یا صوابدید سے خواہ بصارت سے خواہ بصیرت سے اور خواہ دید سے خواہ شنید سے اُسے مساوی طور پر یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ کسی غیبی اور مخفی چیز کی تصدیق کرنا مشاہدہ پر معلق نہیں رکھتی۔

اُمّت مسلمہ کی کلیہ پسندی اور وسعتِ علم

نہیں بلکہ علم دوست اُمّت مسلمہ کے نزدیک علمی میدانوں میں عینی مشاہدہ کوئی زیادہ باوقعت دلیل نہیں کیونکہ مشاہدہ ہمیشہ جُزئیات ہی کا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ کلّیات کا نہیں۔ اور جُزئیات کا آنکھوں کے سامنے آجانا علم نہیں بلکہ حِس ہے جسکو زیادہ سے زیادہ علم صوری کہہ سکتے ہیں نہ کہ علم حقیقی اور ظاہر ہے کہ حِس کا دائرہ علم کے سامنے نہایت تنگ، محدود اور کمزور ہے۔ کیونکہ امور جزئیہ خود محدود ہیں اس لئے انکا علم و ادراک بھی محدود ہوگا۔ چنانچہ کسی ایک جزئی کا مشاہدہ و ادراک دوسری جزئی کے مشاہدہ کو نہ لازم ہے نہ مستلزم نہ ایک جزئی سے دوسری جزئی خود بخود محسوس ہو سکتی ہے۔ جن جزئیات کا تتبع و استقرائی مشاہدہ کر لیا گیا وہ ہو گیا۔ دوسری جزئیات کے علم و ادراک سے اُسے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں کلّیات مشاہدہ کی چیز نہیں بلکہ علم کی چیزیں ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی ایک کلّی کا علم ہو جانا اُس کی لاکھوں بلکہ ان گنت جزئیات کا علم میں آجانا ہے۔ پس علم کلّی علم جزئیات کو مستلزم ہے اس لئے کلّیات ہی کا علم حقیقتاً علم ہے اور اُس کا دائرہ حسیات سے بڑھا

[illegible] سب زیادہ پیچیدہ اور گنجلک رہتا ہے۔

اُمّتِ مسلمہ چونکہ علم کی دلدادہ اور علمی ذہنیت کے سبب معقول پسند اور حقیقت دوست بھی اِس لیئے اُس نے اُصول و کلّیات اختیار کر کے بے شمار جزئی احکام کلیات سے استخراج کر لینے پر قدرت حاصل کی وہ اپنے علم میں جزئیات کی محتاج نہ رہی بلکہ جزئیات اپنے وجود میں خود اُس کی محتاج ہو گئیں۔ پس حجّت و بُرہان یعنی استدلال اسکا خاص شیوہ قرار پایا اجتہاد و استنباط اُس کا مخصوص شعار ہو گیا جس کی بدولت اُس نے کلّی الکلیات کا اُس حد تک سراغ لگا لیا کہ جس قدر بشریت کے دائرے میں زیادہ سے زیادہ ممکن تھا۔

بہی فطرت کے ماتحت اُمّتِ مسلمہ نے بھی حضور کی علمی بارگاہ سے تربیت پا کر جب علمی اور اُصولی راہ پیمائی شروع کی اور اُس اصل الاُصول کا بصیرت کے ساتھ پتہ لگا لیا تو ان کے علوم و معارف کی بھی کوئی انتہا نہ رہی اُنہوں نے کلیات کے جہاں پر قابو پا کر جزئیات کے ذخیروں کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اِس طرح علم و حِسّ دونوں دریاؤں کے شناور بن گئے مگر پھر بھی اُن کے نزدیک ساری پر علم کو غالب رکھنا اُنکا سب سے زیادہ خوشگوار شعار رہا۔

بخلاف اُمّتِ مسیحیہ کے کہ اس نے اپنی تحقیقات کا دائرہ جزئیات اور محسوس و مُجسم اشیاء تک محدود کر دیا۔ اِس لیئے وہ اپنی غالب حیثیت میں کلّیات کی سُراغ رسانی اور اُمورِ عامہ کی تلاش سے بے بہرہ رہی اور جبکہ اُن کی اِس فطرتی ساخت نے اُنہیں کلّیات و حقائق سے بیگانہ رکھا اور اُن میں حقیقت پسند اور کلّیت دُوست ذہنیت ہی نہ پیدا ہو سکی تو اُس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہی تھا کہ وہ اُس اصل الاُصول اور حقیقت الحقائق سے بعید ہوتے چلے جائیں جس کا

سارے عالم کا وجود قائم ہے۔ نیز اُس کے مخفی اسرار اور غیبی لطائف کے علم و اعتقاد سے بھی اُنہیں کوئی واسطہ نہ پیدا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جس درجہ اُس وجود مطلق سے نیچے اُترتے اور بعید ہوتے رہیں گے اُسی درجہ جزئیت، تنگی و تحدید اور تشخص بڑھتا جائیگا جس میں نہ جامعیت ہوگی نہ ہمہ گیری یہانتک کہ اجناس و انواع سے باہر ہو کر اشخاص و حدانیہ اور ان میں بھی محدُودہ و مقیدہ اور پھر اُن میں بھی زمانی و مکانی حسّی تحدیدات کیساتھ گھری ہوئی اشیا کو محسوس کر لینا ہی سب سے بڑا ادراک رہجا دیگا اور معاملہ خالص حس پر آکر ٹھہریگا۔ جیسا کہ متعدد مثالوں سے یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے۔ اب بصیرت کیساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اگر دنیا کے اُن قرون اخیرہ میں کوئی قوم ترقیات کی مستحق تھی اور اگر کسی قوم کی بدولت دنیا عجائبات قدرت اور اُس کے نہایت ہی عمیق رازوں سے آشنا ہو سکتی تھی تو وہ صرف یہی دو قومیں قدرت کی نگاہ میں آئی ہوئی تھیں نصرانی اور حنفا جن پر ترقی یافتہ دنیا کا دور ختم ہونے والا تھا۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ان میں سے نصارٰی تصویری قوم ہے جو حس پسند واقع ہوئی ہے اور چونکہ صور و اشکال اور حسیات کا تعلق مادیات اور اجسام سے ہے اس لئے اس کی ترقیات کا میدان مادہ اور جسم ہو گیا اور اُس نے مادی ایجادات کا سہرا سر کیا پس اس قوم کو مادّی قوم کہنا بجائے خود درست ہو گیا۔ اور حُنفا (مسلم قوم) حقیقتاً علم دوست اور معنی پسند واقع ہوئی ہے اور چونکہ حقائق اور معنویات کا تعلق غیبیات اور اسرار سے ہے اس لئے اُس کی ترقیات کا میدان رُوح اور غیب ہو گیا اور اس نے روحانی اور علمی انکشافات سے دنیا کو لبریز کر دیا۔ پس اس قوم کو علمی یا روحانی قوم کہنا قرین فہم و انصاف ہوگا غرض ایک قوم مادی ہے اور

ایک روحانی یا ایک قوم حسی ہے۔ اور ایک علمی۔ جو اپنے اپنے دائرہ عمل میں جوش کے ساتھ گامزن ہیں۔

اسلامی علوم نے دنیا کی ذہنیتوں کو جگا دیا اور کیونکر جگایا؟

لیکن یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ تمام کمالات میں صفت علم ہی ایک ایسی اصولی اور مرکزی صفت ہے جو سب سے اول بھی ہے اور اوّل درجہ کی بھی ہے۔ پھر یہ کہ وہ تو اپنی کارگزاری میں کسی کی محتاج نہیں پر تمام صفات اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان دونوں اقوام میں بھی نصاریٰ تو اپنی اس تصویری اور ایجادی کمال کو بروئے کار لانے میں اُمّت اسلامیہ اور اس کے علم کے محتاج ہوں پر یہ علمی اُمّت اُن کی کسی درجہ میں بھی دستنگر نہو اور اس لئے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ اُمّت نصرانیہ کی تمام ایجادی کارگزاریاں اُسوقت تک عالم میں نہیں پھیلنی چاہیئے تھیں جب تک کہ اُمّت اسلامیہ کے علوم منتشر ہو کر نصرانی طبائع تک پہنچیں اور ان کی ذہنیتوں کو منور نہ کر دیں گویا عیسائیوں کی اس اختراعی ذہنیت کو علوم قرآن کا منتظر رہنا چاہیئے تھا کہ بغیر اُس کے وہ میدان عمل میں مسابقت نہ کر سکتی تھی اور کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ یہ قوم دُنیا کی ایک یکتا اور ایک اعلیٰ ذہنیت کی بننے والی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصاریٰ کی ذہنیت لاکھ تصویری اور ایجادی سہی لیکن آخر اسلام سے پہلے انجیلی مذہب کے دورِ شباب میں بھی یہ ذہنیت آج ہی کی طرح تھی پھر آخر کارفرما کیوں نہ ہوئی؟ یہ سائنٹیفک ایجادیں یہ نئے نئے مادی اختراعات کیوں بروئے کار نہ آئے اور کیوں اُس کے طبیعاتی کرشمے آجکی طرح اسوقت رونما نہو گئے؟ اُس کی وجہ یہی ہے کہ ذہنیت اور فطرت ضرور ایجادی تھی اور

وہ انجیل سے تقویم بھی پاتی رہی لیکن اپنی کارگذاری اور بڑے کار آمد بننے کیلئے وہ علم کی اُصولی روشنیوں کی محتاج اور منتظر تھی جیسے خود عربی اقوام کی ذہنیت میں علم کا مادۂ قابلہ ضرور موجود تھا فطری اخلاق وملکات فاضلہ کی کمی نہ تھی وہی حقیقت شناس مادّے جنہوں نے آگے چل کر دنیا کو حقیقت نمائیوں سے ہلا ہلا دیا ضرور مہیا تھے مگر اُن کو جگا دینے والا علم نہ تھا اس لئے زمانہ جاہلیت میں وہ قلوب ہی کی سرزمین میں مدفون پڑے ہوئے تھے۔ لیکن جونہی کہ اسلام کے علمی اُصول اور جامع علوم کا آفتاب اُفق اقوام پر چمکا یعنی جونہی قرآن کریم دنیا میں آیا جو علوم ربانی کی ایک جامع تعبیر تھا وہ نہی اقوام کے فطری مادّے بیدار ہو گئے اور اُس نے ان مواد کو اپنی اپنی راہ پر لگا دیا۔

قرآنی اُصول مادیت و روحانیت پر یکساں حاوی ہیں

کیونکہ جس طرح خدا کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس طرح محیط تھا کہ روحانیت و مادیت کا کوئی گوشہ اُس سے باہر نہ تھا اسی طرح قرآن کریم جو اس محیط علم کا معبر ہے اس درجہ جامع جملے بلیغ تعبیرات اور ہمہ گیر تعلیمات لیکر آیا جو روحانیت و مادیت کے دونوں سلسلوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا اُن میں سے مادیت و روحانیت تدیّن و تمدن اور دُنیا و عقبیٰ دونوں کے منافع یکساں طور پر نکل رہے تھے۔ اور قرآن کے اُن اُصول وکلیات سے جس طرح ایک روحانی مرتاض اپنی روح کے مخفی مقامات اور نفسانی دقائق پر مطلع ہو سکتا تھا اسی طرح ایک مادی فلاسفر بھی انہی جامع اصول کی روشنی میں مادیات کے مخفی خزانوں اور تمدن کے ہزار ہا مکنون عجائبات پر فتح پا سکتا تھا۔ پس ان اصولی علوم میں سے ایک رستہ روحانیات اور عقبیٰ کی طرف

نکلتا تھا اور دوسرا ماديات اور دنیا کی طرف - فرق یہ تھا کہ تہذیب رُوحانی ان اصول کی غایت تھی جو مقصود اصلی تھی اور تہذیب مادی اُن کی خاصیت تھی جس کی طرف مقصد و ارادہ سے متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہ بذاتہ مقصود نہ تھی - لیکن ان اصُول میں صلاحیت ضرور موجود تھی کہ اگر محض تمدّنی ترقیات ہی کا قصد کر کے ان اُصول سے کام لیا جائے تو ایک محیّر العقول طریقہ پر مدنی کارنامے بھی ان اُصول کے استعمال سے حاصل ہو سکتے تھے - پس جو قومیں روحانی تھیں اُنھیں رُوحانی راہیں نظر آنے لگیں اور جو مادی وصوری تھیں اُنہیں صُوری اشکال کی بوقلمونیاں محسوس ہونے لگیں اور جو گمراہ محض تھیں اُنہیں گمراہیوں ہی کے سارے ابواب مفتوح نظر آنے لگے - پس جو قوم بھی ان اُصول کلّیہ کو لیکر جس راہ پر چلی اُسی میں ایک کامیاب قوم نظر آنے لگی - پھر یہ ایک قدرتی بات ہے کہ پیغمبر کے وہ اُصول علوم جن سے آئندہ پھوٹ نکلنے والی فروع اور علمی جزئیات طبعی طور پر نکلتی ہیں اُمّت کے عام طبقات میں شائع ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کے سامنے سے گذرتے ہیں خواہ وہ مطیع ہو یا معاند ایمان لائے یا کفر پر رہے لیکن ان اُصول کو بوجہ طبعی اور فطری ہونے کے ہر طبقہ دل میں جگہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ قابل انکار ہی نہیں ہوتے پس انہی اُصول علوم اور رؤس معرفت کے ذہن نشین ہونے پر ان تمام طبقات اُمت میں حسبِ استعداد ایک علمی ملکہ قائم ہو جاتا ہے - اور طبیعت اس خاص علمی راہ کی طرف چل نکلتی ہے - اور ظاہر ہے کہ ایک خاص راہ پر چلی ہوئی طبیعت پھر خود اپنی ذہنی رفتار کے مناسب کچھ نئے نئے انکشافات بھی کر لیتی ہے جو درحقیقت انہی اُصول علوم کا ثمرہ ہوتے ہیں جو ابتداءً ذہن نشین ہو چکے تھے -

مسلمانوں کی عالمگیر تبلیغ

مسلمانوں نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان جامع اور فطری تعلیمات
کو شائع کرنے اور دنیا میں انہیں پھیلا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کوہ و بیابان دریا اور
سمندر جزیرہ اور بادیہ شہر اور دیہات میں سے کوئی خطہ نہ چھوڑا جہاں قرآن کی آواز بلند بانگ
ہو کر نہ پہنچائی ہو۔ کوئی قوم ایسی نہ چھوڑی جسے اپنے علوم و فنون سے آشنا بنانے کی سعی نہ کی ہو
اُن کا علم بت پرستوں کی طرح کسی خاص فرقہ یا خاندان کی میراث نہ تھا بلکہ سارے عالم کا ترکہ
تھا اس لئے تمام ممکن وسائل تبلیغ کے ذریعہ انہوں نے انتہائی جوش کے ساتھ عالم میں قرآنی
نور پھیلایا اُن کی بے شمار تصنیفوں اُن کے خطبوں اور لیکچروں اُن کے شخصی اور اجتماعی امر بالمعروف
اور اُن کی قائم کردہ تعلیمگاہوں کے ذریعہ دنیا کے ہر ہر گوشہ اور ہر ہر سنجیدہ طبقہ میں اُن کے علم
کا آوازہ پہنچا۔ انہوں نے دور خلافت اندلس میں اسلامی یونیورسٹیاں قائم کیں جن میں عیسائی
رعایا کو بھی تحصیل علم کا اُسی طرح اذن عام تھا جس طرح مسلم رعایا کو۔ قومی حیثیت سے عیسائی
رعایا اسلامی تعلیمات سے باخبر ہوئی حتیٰ کہ عیسائیوں میں اسلام کی توحید خیز تعلیمات سے
تأثر کی بنا پر تثلیث پرستی سے نفرت قائم ہونے لگی اور اُن میں پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد پڑی
جس کا مشن تثلیث کا رد اور توحید کا اثبات تھا۔ جیسا کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے
توحیدی مواعظ اور خطبے سُن سنکر اور اُن تقریروں میں شرک و بت پرستی کی دھجیاں بکھرتے
دیکھکر مشرکین ہند میں بھی ہیجان برپا ہوا اور اُن میں آریہ کے نام سے ایک مستقل فرقہ ہی توحید کا
نام لیوا کھڑا ہو گیا اور گو اس میں ابھی کافی مشرکانہ اعتقادات موجود ہیں تاہم وہ اسلام سے قریب تر
ہوتا جا رہا ہے یہ کیا تھوڑا ہے۔ قریب ہے کہ تینتیس کروڑ دیوتاؤں کی بندگی کا حلقہ گردنوں سے اُتر کر

صرف تین معبودوں خدا اور روح اور مادّہ کی غلامی کا پھندہ گلے میں رہگیا ہے جس سے قوی اُمید ہے کہ اس پھندے کی گرہ تھوڑی سی بھی ڈھیلی پڑ جانے پر اسلام کی حقیقی توحید کا حلقہ گلوگیر ہو جائیگا۔

اُمم و اقوام میں اسلامی تعلیمات کی تھی کھلی تاثیرات

غرض اسلامی تعلیمات نے شائع ہو کر ایک طرف عیسائیوں کو بیدار کیا ایک طرف بت پرستوں کو جھنجوڑا اور جو قوم جس قدر بھی ان تعلیمات سے متاثر ہوئی اُسی قدر اس میں علم و حکمت کی جھلک نمایاں ہونے لگی آج بلا شبہ عیسائی اُمت ایک علمی اُمت کی صورت سے نمایاں ہو رہی ہے لیکن انجیل کی بدولت نہیں۔ (ورنہ ذہنیتوں کا یہ تنور اور روشن خیالی کے یہ دعوے اپنی تعلیمات سے پہلے انجیل کے دور شباب میں نمایاں ہوتے) بلکہ اُس استعداد کی بدولت جو قرآنی تعلیمات سُن سُن کر اُن میں بتدریج قائم ہوتی رہی اور آہستہ آہستہ صدیوں کے اثرات نے نسلوں میں علمی ذہنیت قائم کر دی تحقیق تلاش کا مادّہ پیدا ہوا جس نے اخلاق پر اثر ڈالا یہانتک کہ رفعت و شوکت کے حسی آثار اُن سے ہویدا ہونے لگے آریوں میں بھی علمی حیثیت آنی شروع ہوئی تو بتدریج اُس نے بڑھ بڑھ کر اُن میں بھی اُبھرنے کی استعداد پیدا کر دی۔ ہاں جو قومیں ابھی تک اسلامی تعلیمات سے متأثر نہیں ہوئیں وہی جمود و خمود کی حالت میں مدہوش پڑی ہوئی ہیں اور ان میں رفعت و شوکت اور نہضت کے جذبات مشتعل نظر نہیں آتے۔

بہرحال جس قوم میں بھی ذہنی روشنی اور علمی حیثیت نے نفوذ کیا وہ حقیقتاً اسلامی تعلیمات کا طفیل ہے جو غیر محسوس طریقہ پر صدیوں سے اُن میں نفوذ کرتی چلی آئی ہیں اور آج تو محسوس

طریق پر بھی قرآنی تعلیمات نے اپنی علمی آواز ہر ملک اور ہر خطہ میں پہنچا دی قرآن کریم طباعت و اشاعت کے ذریعہ ہر ہر گھر میں پہونچ چکا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے سائز پر چھپکر مسلم و کافر گھرانوں میں موجود ہے۔ اُس کے تراجم مسلمانوں نے ہر زبان میں شائع کر دیئے ہیں۔ عیسائیوں نے اُس سے آشنا ہو کر بطور خود اُس کے کتنے ہی تراجم شائع کیئے۔ حدیث کی ہزار ہا کتابیں خود عیسائی طبع کرا رہے ہیں۔ فقہ کی مستند اور معتبر کتابوں کے سینکڑوں ایڈیشن یورپ شائع کرتا جا رہا ہے۔ مروجہ قوانین و تعزیرات اسلامی فقہ کا خلاصہ ہے جس سے عدالتیں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے بے شمار علمی ذخیرے مسیحی ملکتوں کے قبضہ میں ہیں جو خود مسلمانوں کو میسر نہیں یورپ کی متعدد یونیورسٹیاں مستقل طور پر ایشیائی اور اسلامی تعلیمات کو عام کر رہی ہیں۔

یورپ کے ماہر مصنف کھلے طور پر اُس کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں کہ قرآن سے زیادہ فطرتوں کو پر جوش طریق پر اُبھارنے اور اُن کے خلقی جذبات کو صحیح فطرت پر اپیل کرنے والی کوئی کتاب نہیں ٹون بران ہارڈی مشہور مصنف۔ برنارڈ شا مشہور انگلستانی فلاسفر گسٹاؤلی بان مشہور فرانسیسی مؤرخ اور دوسرے علم دوست فلاسفر اپنی تصانیف میں اس اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن کی عمیق علمی لہریں دلوں کی گہرائیوں میں چار و ناچار سرایت کرتی جا رہی ہیں اور اپنے آپ کو منوانے میں کسی دوسری قوت و اعانت کی محتاج نہیں ہیں۔ ماضی صدیوں کے تدریجی تاثرات نے بالآخر عام اقوام کی ذہنیتوں میں اسلام کی طرف میلان و رجحان پیدا کر دیا اور اب کتنی ہی ایشیائی اور یوروپین اقوام قومی حیثیت سے اُس کی طرف کھنچتی چلی آ رہی ہیں۔

(۱) ڈاکٹر موریس فرانسیسی مشہور مصنف، لکھتا ہے۔

"قرآن دینی تعلیم کی خوبیوں کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلیہ عنایت نے جو کتابیں دیں اُن سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔ قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا (تنقید الکلام مصنفہ سید امیر علی)"

(۲) تیرا لیسٹ (لنڈن کا مشہور اخبار) لکھتا ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم وارشاد کی قدر وقیمت، اور عظمت وفضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو فی الحقیقت ہم عقل ودانش سے بیگانہ ہیں۔"

(۳) ڈاکٹر کینن آئزک ٹیلر (کلیسائی انگلستان کے صدر نشین کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے۔"

(۴) جارج سیل (مشہور مترجم قرآن) کہتا ہے۔

"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا۔ یہ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کے زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔"

خطبہ صدارت مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
شعبہ مدارس علیگڈھ

لیئے علم وفن اُن سے تم نے	کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفا ہانیوں نے	کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

اِن حالات و اعترافات کے ہوتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات اگر صدیوں سے غیر محسوس طریق پر قلوب کے منفذوں میں سما کر ذہنیتوں کا جزو بنتی جارہی تھیں تو آج محسوس طریقہ پر تمام ہی منکر نسلوں میں پیوست ہوتی چلی جارہی ہیں اور اگر کوئی زبان سے اقرار نہ بھی کرے تو اُس کا عمل اور حال کھلے بندوں ندا کر رہا ہے کہ کفر کی تاریکیوں میں روشنی کا یہ رنگ قرآنی ہی ہو سکتا ہے جس نے اپنی فطری اُصول ہی کو نہیں بلکہ بہت سی معاملاتی فروع کو بھی بعزّ عزیز و فعل ذلیل منوا کر چھوڑا ہے آج اُس قوم کے مرد و عورت بھی جس میں منزلی معاشرت اور تمدن کے سینکڑوں عمومی گوشے تشنہ اور احکام کی تنگیوں سے بھنچے اور سکڑے ہوئے پڑے تھے یعنی ہندو رہنما اپنے مذہبی قوانین کے برخلاف اس پر مجبور ہوئے کہ طلاق، تعدد ازدواج، عقدِ بیوگان، عقدِ بلوغت، ترکہ و وراثت جیسے اسلامی دستور العمل سے اپنی معاشرت میں عملی ترمیم اور معاشرتی فراخی پیدا کریں اور کونسلوں میں طلاق بل، اچھوت بل، متبنّٰی پریشن بل وغیرہ کی پناہ لینے پر مجبور ہوں کیا یہ کم حیرتناک بات ہے کہ ہندو مذہب کے سب سے بڑے اور اُس کی بقاء و استحکام کے سب سے اُونچے علمبردار گاندھی اور مالوی ہندو دھرم سے اُس چھوت پن کو دور کرنے کیلئے کھڑے ہوں جب پر دھرم شاستروں نے دھرم کی ساری ہی عمارت کھڑی کی تھی اور یکہ جیسے ترقی کی اونچی سطح پر پہونچے ہوئے یورپین ملک میں بقول فرید وجدی مصنف انسائیکلوپیڈیا ڈھائی سو رسائل و اخبارات محض اس نظریہ کی اشاعت کیلئے نکالے جائیں کہ ہم آج تک جن

غیبی جہانوں اور اسلام کے نشان وادہ اسرار غیب کے منکر تھے آج انتہائی ندامت کیساتھ اپنے اس جاہلانہ خیال سے رجوع کرتے ہیں حالانکہ مادی ترقیات کی اس جرع مفرط کی اساس ہی روحانیات کے انکار پر قائم تھی۔ پھر آخر دنیا کی اقوام اپنی مذہبی حماقتیں اپنے ہی ہاتھوں شرمساری کے ساتھ کیوں مجبور ہیں؟ محض اسلئے کہ اسلامی علوم کا آفتاب جب طلوع ہو چکا تو کھلے میدان ہی نہیں اُن اندھے کوٹھوں میں بھی اُس کی روشنی کی کرنیں جا پہونچیں گو خود آفتاب کے سامنے نہیں تھے مگر آفتاب کی اُن سریع النفوذ کرنوں نے کسی نہ کسی منفذ سے اگر دھوپ نہیں تو اُسکا اُجالا ہی پہونچا دیا۔ بس یہ صحیح ہے کہ گاندھی، مالوی، برنارڈ شا، گستاؤلی بان، فون برن ہارڈی، ڈاکٹر موریس، ڈاکٹر کینن، جارج سیل اور دوسرے امریکن سائنسدانوں نے کسی اسلامی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن اسلامی علوم و قوانین کے اُن عام اثرات کو جو مسلمانوں کی زبانوں اور قلموں اور سب سے بڑھکر اُن کے محسوس تعامل کے ذریعہ عام کانوں اور آنکھوں تک پہونچے اور برسہا برس سے پہونچتے چلے آرہے ہیں آخر یہ ہستیاں کس طرح مٹا دیتیں؟ یہی ہوا کہ دلوں کو اندرونی انصاف کے ماتحت جلو غایا کر ماان اُصول کو اپنے اندر جگہ دینی پڑی اور اعتقاداً نہیں تو عملاً اسلام کو قبول کرنا پڑا۔

بہرحال قرآنی اُصول جس طرح مطیعوں میں شائع ہوئے اُسی طرح منکروں میں بھی پھیلے فرق ہے تو صرف یہ کہ مطیعوں نے اُن اُصول حقہ کو اُنہی کے محل میں استعمال کیا اس لئے وہ برکت اطاعت کے ثمرات بصیرۃ، نورِ قلب۔ انشراح اور زیادۃ علم سے مشرف ہوئے اور غیر مسلم اقوام نے انہی علوم کو بلا اعتراف و انقیاد قبول کیا تو بجائے زیادۃ علم اور تفصیلات کے اُن میں محض

اجمالی اصول اور مطلق کلیات سرایت کر گئیں۔ اور اُنھوں نے انہی اصول کو مواقع استعمال سے
نابلد رہ کر اپنی ہی ذہنیت کے حسب حال مختلف مادی منافع کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا
چنانچہ مسلم حنیف نے ان اُصول کو دیانات، عبادات معرفت خالق اور تدین میں استعمال کر کے
سلامتی آخرت کا ذریعہ بنا لیا اور غیر مسلم نے اُنہی اُصول کو مادی معاشرت نفسانی عادات
معرفت کونیات اور تمدن میں استعمال کر کے تعیش دنیا کا ذریعہ بنا لیا۔ کامیاب دونوں ہی ہُوئے
(کہ ان اُصول کی فطرت ہی میں دونوں جہانوں کی کامیابی کی صلاحیت موجود تھی) مگر ایک
عقبیٰ میں جس کے ہاتھوں سے دنیا بھی نہ گئی کہ وہ تابع آخرت ہے اور دوسرا دنیا میں جس
کے ہاتھ سے انجام کار دنیا تو اس لئے نکل جاتی ہے کہ وہ خود فانی ہے اور آخرت اس لئے
ہاتھ نہیں لگتی کہ وہ دنیا کے تابع نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُصول کے غلط استعمال کا یہی ثمرہ بھی ہو
سکتا ہے کہ انجام کار حرمان و خُسران سے دوچار ہونا پڑے۔

بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ قرآنی اُصول میں تدین اور تمدن دونوں کی خوبی اور برتری پیدا
کر دینے کی اعلیٰ صلاحیت تو موجود تھی اِدھر مسلمانوں نے ان اُصول کی اشاعت من حیث المعقول
ہمت دکھا کر دنیا کے چپہ چپہ پر انہیں علماً عملاً پھیلا دیا اُدھر گویا دنیا کی ہر قوم کی ذہنیت اپنے
اُبھرنے کے لئے اس علمی روشنی کی پیاسی ہی تھی اس لئے ہر قوم نے حسب استعداد اُن
سے جلا حاصل کی اور اپنے کہنہ پروگراموں میں بتدریج ترمیم شروع کر دی۔ لیکن ہم پہلے ثابت
کر چکے ہیں کہ میدان عمل میں وہی قومیں فطرتاً آگے آگے تھیں ایک مسلمان جن کی ذہنیت
اپنے مربی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی ذہنیت سے مستنیر ہونے کے سبب

حقیقت پسند واقع ہوئی تھی اور ایک نصاریٰ جن کی ذہنیت اپنے مقتدائے اعظم حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تصویری اور ایجادی ذہنیت سے مستفید ہونے کے سبب صورت پسند واقع ہوئی تھی پس جونہی کہ قرآنی اُصول اور علوم کی روشنی چمکی تو خصوصیت کے ساتھ ان دو قوموں کو اپنی اپنی ذہنی طاقتیں نظر آنے لگیں اور انہوں نے میدان عمل میں دوڑنا شروع کر دیا کیونکہ یہی دونوں اس کی مستحق بھی تھیں کہ اسلام کے اُن علمی اُصول کی روشنی میں استفادہ کرتی ہوئی دوڑ پڑیں جن میں سے رُوحانیت و مادیت دونوں کی طرف وسیع شاہراہیں جاتی تھیں چنانچہ اپنی اپنی ذہنیتوں کی رہبری میں ایک تمدن کی طرف چلی اور ایک تدین کی طرف ایک نے ان قرآنی اُصول کو دیانت کے لئے استعمال کیا تو روحانی خزائن حاصل کئے دوسری نے محض تمدن اور مدنیت کیلئے استعمال کیا تو اُن کی ظاہری معاشرت نظر فریب ہو گئی۔

امت مسلمہ اور امت مسیحیہ کے نظام باہم متشابہ اور ملتے جلتے ہیں اور یہی کا راز

لیکن غور کرو تو اُن ترقیات میں رہبر دونوں کا قرآن ہی ثابت ہوتا ہے مسلمانوں کا اس لئے کہ ان کا مذہبی دستور العمل ہی قرآن ہے اور مسیحیوں کا اس لئے کہ اُن کا یہ موجودہ تمدنی پروگرام تورات و انجیل کا شرمندۂ احسان نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ماخذ اگر نکل سکتے ہیں تو صرف قرآن میں۔ چنانچہ مختلف تمدنی اور معاشرتی مسائل کی مروجہ تشکیلات پر نظر ڈالنے سے جو بطور نمونہ ہم پیش کریں گے یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ مادی نظام معاشرت کا یہ اُسلوب گو نصاریٰ کے ہاتھوں عمل میں آ رہا ہے لیکن اس کے ماخذ اگر نکلتے ہیں تو بجائے اُن کی کتب مقدسہ کے جو منسوخ العہد ہیں صرف قرآن سے نکل رہے ہیں۔ پس جن اُصول سے مسلم قومیں روحانیات میں ترقی کر رہی ہیں بعینہٖ اُنہی اُصول سے

نصرانی قومیں مادیات میں بڑھ رہی ہیں۔ اور جبکہ دونوں قوموں کے اصول عمل مشترک ٹھہر گئے گو خیال و عمل مختلف رہے تو لازمی تھا کہ ان دونوں قوموں کے مادی و روحانی نظام باوجود اس شدید اختلاف کے بھی باہم ملتے جلتے ہوں اور ایک دوسرے پر اس درجہ مطابق آجائیں کہ جیسے کسی لحاف کا ابرہ اور استر ایک دوسرے پر راست آجاتا ہے فرق اگر ہوتا ہے تو ظاہر و باطن کا یا صورت و حقیقت کا۔ مگر اس فرق سے اس تطابق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پس ہر ایک نظام دوسرے کا شبیہ ہے کہ منشا و ماخذ ایک ہے۔ گویا قرآنی اصول و معارف نے اپنے دو رُخ ظاہری و باطنی قائم کر کے مادی رُخ نصاریٰ کے ہاتھ میں دے دیا اور روحانی حنفاء کو سپرد کر دیا۔ اس لئے ان دونوں اقوام کے ترقی یافتہ پروگراموں میں صورت و حقیقت کے تقابل کے ساتھ ساتھ باہمی تناسب اور تطابق تا بحد کمال پہنچا ہوا ہے۔

اسلامی اور نصرانی نظام کی مشابہت کی چند مثالیں

مسئلہ توقیت (۱) مثلاً اسلام نے توقیت یعنی پابندی وقت یا انضباط اوقات کے اصول کو نہایت اہتمام کے ساتھ پیش کیا اور اس کی حکیمانہ طرز پر تعلیم دی پہلے چاند سورج کی پیدائش کی غرض ہی اندازۂ اوقات قرار دی۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ	وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند
نُورًا وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا	کو بھی نورانی بنایا اور اس کی چال کے لئے منزلیں مقرر
عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ط	کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔

پھر ان سنین کو بارہ ماہ پر تقسیم فرمایا۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا
عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔

یقیناً شمار مہینوں کا جو کہ کتاب الہی میں اللہ کے نزدیک
معتبر ہیں بارہ مہینے قمری ہیں جس روز اللہ تعالےٰ
نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے۔

پھر ان مہینوں کو ہفتوں پر تقسیم فرمایا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

بلا شبہ تمہارا رب (حقیقی) اللہ ہی ہے جس نے
آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز کی مقدار میں پیدا کر دیا

ساتواں دن جو آخری دن تھا مخصوص طور پر ذکر فرمایا کہ وہ جمعہ ہے (جس میں آدم کی پیدائش
ہوئی اور یوم عبادت آدم قرار پایا)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ
لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ
وَذَرُوا الْبَيْعَ۔

اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لئے
اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد یعنی نماز و خطبہ
کی طرف فوراً چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی
طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو۔

پھر ہفتوں کا تجزیہ لیل و نہار سے فرمایا۔

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ
وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ

وہ رات (کی ظلمت) کو دن (کی روشنی کے محل یعنی ہوا)
پر لپیٹتا ہے اور دن (کی روشنی) کو رات پر لپیٹتا ہے۔

پھر لیل و نہار کو ساعتوں اور گھنٹوں پر تقسیم فرمایا۔

لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ — گویا یہ لوگ دن بھر میں ایک گھڑی رہے ہیں۔

پھر اوقات کی اس ساری تنظیم کی اصل غایت وغرض یہ بتلائی کہ عبادت جو اصل مقصد تخلیق انسانی ہے سہولت کے ساتھ باقاعدگی سے منضبط ہو جائے اور منتشر اوقات میں پراگندہ ہو کر ضائع نہو۔ ارشاد ہے۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ — آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور غیر اختیاری عبادات مثل حج روزہ زکوٰۃ وغیرہ کیلئے

اور فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ — اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ دلائل و نعم مذکورہ ہوئے) اُس شخص کے سمجھنے کے لئے ہیں جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔

چنانچہ پھر عبادت کی توقیت جدا جدا ارشاد فرمائی۔ نماز کے بارہ میں فرمایا۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۔ — یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔

روزہ کے بارہ میں ارشاد ہوا۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط۔ — سو جو شخص اِس ماہ میں موجود ہو اُس کو ضرور اُس میں روزہ رکھنا چاہیے۔

حج کے متعلق فرمایا گیا۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ — (زمانہ) حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں (شوال ذی قعدہ اور دس تاریخیں ذی الحجہ کی)

زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہونے کی شرط، مال پر ایک سال گذر جانا، حدیث نے بتلایا وغیرہ وغیرہ۔

پھر عبادات کی اِس اوقاتی تنظیم میں کہیں نظام شمسی سے کام لیا اور کہیں نظام قمری سے جو عبادات کہ ماہ و سال کی لمبی مدتوں سے منضبط ہوتی تھیں اُنھیں تو نظام قمری پر دائر کیا گیا اور سال بارہ ماہ کا رکھکر ہر مہینہ کا آغاز و انجام رُویت ہلال پر دائر کر دیا تاکہ اوقات کی حد بندی حقیقی ہو محض جعلی اور اختراعی نہ ہو جس میں اختیاری یا حسابی کمی بیشی راہ پا سکے جیسے حج کہ عمر بھر میں ایک دفعہ لازم ہے مگر اس کی ادائیگی قمری سال کے صرف اخیر مہینہ (ذی الحجہ) ہی میں رکھی گئی یا زکوٰۃ جو ایک سالانہ مالی عبادت ہے مگر اس کی ادائیگی مال پر پورا ایک قمری سال گذر جانے سے مقید کر دی گئی جس سے اِس عبادت میں بھی وقت کی قیود آگئیں۔ صیام جو ایک سالانہ جانی عبادت ہے قمری سال کے ایک بارھویں جزو سے مشروط کی گئی جس کی ابتدا و انتہا محض رُویت ہلال پر ہے حساب پر نہیں غرض یہ تمام عبادتیں نظام قمری سے متعلق ہیں۔ البتہ وہ عبادتیں جو سالانہ یا ماہانہ ہونے کے بجائے یومیہ تھیں اور یومیہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھر ساعاتی بھی تھیں کہ لیل و نہار میں ہر دو چار گھنٹے کے بعد واجب الادا تھیں۔

اُن کے اوقات کی نظام شمسی سے حد بندی اور توقیت فرمائی کہ چاند نہ تو پورے مہینہ نکلتا ہی ہے اور نہ دن میں رُونما ہوتا ہے اگر ان یومیہ عبادات کی تحدید نظام قمری سے کی جاتی تو دن کی عبادتوں سے تو بالکلیہ دست بردار ہونا پڑتا اور رات کی عبادت کا نظام کسی ایک نہج پر اُستوار نہ رہ سکتا۔ جیسے ہر ہر دن کا روزہ کہ دن بھر کی عبادت ہونے کی وجہ سے اُسکی تحدید چاند کی حرکت سے ناممکن تھی اس لئے طلوع و غروب آفتاب سے کی گئی یا پنج وقتہ نمازیں بیشتر دن میں واقع ہونے کی وجہ سے جبکہ چاند کا دورہ ہی نہیں اور کچھ رات میں واقع ہونے کی وجہ سے جس میں کہ چاند کا دورہ ایک نہج پر استوار نہیں رہتا دورہ قمر پر دائر نہیں ہوسکتی تھیں اس لئے آفتاب کی حرکت پر دائر کی گئیں۔ چنانچہ فجر کی نماز صبح صادق سے طلوعِ شمس تک ظہر زوال آفتاب سے سایہ دو مثل ہو جانے تک عصر دو مثل سایہ سے غروب آفتاب تک مغرب غروب آفتاب سے غروب شفق تک اور عشاء غروبِ شفق سے طلوعِ فجر تک رکھی گئی۔ پھر نمازوں کے اختتام پر تسبیح تہلیل رکھکر انہیں بھی گویا انہی اوقات کیساتھ مؤقت کر دیا گیا۔ یا مثلاً حج کے جزئی افعال طواف، سعی، وقوفِ عرفات، قیامِ منیٰ و مزدلفہ، رمی جمار، قربانی، طوافِ زیارت وغیرہ سب ہی اجزاء اوقات شمسی سے مؤقت کئے گئے ہیں جیسا کہ کتب فقہ اس سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح دوسری طاعات و حکمیات عدّتِ طلاق، عدّت وفاتِ زوج، مدّتِ رضاعت، مدّت ایلاء، مدّت دینِ مؤجل مدّت نذر مؤقت وغیرہ کثرت سے ایسے معاملات ہیں جنہیں اوقات سے مؤقت اور منضبط کیا گیا ہے۔

پس جبکہ عبادات کے دائرہ میں ماہِ صیام کے ذریعہ سال کے دونوں کناروں کی حد بندی کر دیگئی تو پھر ماہ کے ہر ہر ہفتہ کی جمعہ و جماعت کے ذریعہ تحدید کر دیگئی اور پھر ہر ہفتہ کو لیل و نہار کو نمازوں کے ذریعہ پانچ حصوں میں منقسم کر دیا گیا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ عمر کے ہر ہر سال ہر ہر ماہ ہر ہر ہفتہ اور ہر ہر رات دن کے اطراف موقت عبادات سے گھیر کر بیچ کے اوقات معاشرتی امور کے لئے خالی چھوڑ دیئے گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان درمیانی اوقات میں عادات و معاشرت کا جو کام بھی ہو وہ بھی قدرتی طور پر وقت سے منضبط اور حدود سے محدود ہو جائے اور اس طرح انسان کی پوری ہی زندگی دینی ہو یا معاشرتی نہایت باقاعدہ اور منتظم ہو کر پراگندگی عمل اور پریشانی اوقات سے مامون ہو جائے۔ پس مسئلہ توقیت و انضباطِ اوقات کا اصل مقصود تو وقت کو باقاعدگی کے ساتھ طاعت و عبادت الٰہی میں لگانا ہے جو تخلیق انسانی کا اصل مقصد ہے لیکن ساتھ ہی تمدنی ضروریات کو بھی درمیانی اوقات میں ایسے انداز سے لا کر چھوڑ دینا ہے کہ ان کی تنظیم کا قصد تو کرنا پڑے کہیں وہ مقصودِ زندگی نہ بن جائیں مگر غیر ارادی طور پر بطور خاصیت خود بخود اُنکی بھی اوقاتی تنظیم ہوتی رہے۔ غرض عبادت کے تمام اجزاء جن میں خواہ وہ روحانی غذا ہو جیسے نماز و روزہ و ذکر اللہ خواہ روحانی سفر ہو جیسے حج و زیارت بیت اللہ خواہ روحانی میل جول ہو جیسے ازدواج و نکاح خواہ اس میل جول سے روحانی کنارہ کشی ہو جیسے ایلاء و عدت سب ہی کو تنظیم اوقات سے منظم کر کے پیش کیا گیا ہے۔ پس مسئلہ توقیت کا اصلی محل روحانی نظام قرار دیا گیا ہے جس کی توقیت مقصود ہے مگر اس کے ضمن میں مادی زندگی کا نظام بھی خود بخود استوار ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس مسیحی اُمت نے جس کا مقصودِ زندگی تصویری جذبات کے
ماتحت صرف تمدن قرار پاچکا ہے اِسی قرآنی اصول (توقیت) کو سلیقہ کے ساتھ عملاً اختیار
کیا۔ اگر عبادات یا مذہب کے دائرہ میں نہیں (کہ انجیل نے تو اپنے پیروؤں کو پوری زندگی کا کوئی
مذہبی منظم پروگرام دیا ہی نہیں تھا اس لئے وہ مذہبی اعمال میں کسی منظم توقیت کے خوگر ہی نہ تھے
اور قرآن کے پروگرام پر یہ انجیلی قوم مذہباً ایمان نہیں لائی اس لئے قرآنی اصول کو بھی مذہبی نقطۂ
نظر سے استعمال نہیں کر سکتی تھی)، اس لئے اِس قرآنی اصول (توقیت وانضباطِ اوقات)
کو انہوں نے صرف اپنے مخصوص مادی تمدن اور اپنے ہی رنگ کی مادی معاشرت میں
استعمال کیا۔ سفر کے اوقات اور حضر کے اوقات پھر حضر میں کھانے پینے کے اوقات کھیلنے
کودنے اور لہو و لعب کے اوقات۔ تفریح و تعیش کے اوقات ملاقاتوں کے اوقات، دفتری کاروبار
اور انتظامی امور کے اوقات حتیٰ کہ بدکاری اور عیاشی کے اوقات نیز عام مادی ضروریات کے
اوقات بالکل اسی طرح منضبط کئے جس طرح اسلام نے روحانی ضروریات کے اوقات
کا انضباط کیا تھا۔ آج سینما اور تھیٹر کا لہو و لعب اسی طرح توقیت کا پابند کیساتھ شروع اور ختم
ہوتا ہے جس طرح اسلام میں عبادات کی ادائیگی تھی۔ کلب گھروں کے ناچ رنگ ٹھیک
ٹھیک ٹائم سے شروع ہوتے ہیں اور ٹھیک وقت پر ختم ہو جاتے ہیں۔ ملازمتی اوقات کی عمر
۵۵ سالہ مدت سے مؤقت کی گئی ہے اُس کے فرائض کیلئے دفتری اوقات کی توقیت منٹوں
اور سکنڈوں کیساتھ کی گئی ہے لنچ اور ڈنر کے اوقات تُلے ہیں سفر دیکھو تو ریلوں کے
اوقات انتہائی احتیاط کیساتھ معین و منضبط ہیں ہر ہر شہر اور گاؤں میں ریل کے پہنچنے اور چھوٹنے

کی گھڑیاں تک محفوظ اور مقرر شدہ ہیں جنکو کسی طرح مسافروں کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ ٹھیک اُسی طرح حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جس طرح اوقاتِ عبادات کو حکومت الٰہی نے اپنے ہاتھ میں لیکر اختراعی حسابات سے روک دیا تھا ملاقات کے اوقات معیّن وائسرائے اور گورنروں سے ملنے کیلئے گھنٹے ہی نہیں بلکہ منٹ تک محدود اور معیّن کئے جاتے ہیں جن میں فرق نہیں آسکتا مقررہ وقت اگر ملاقاتیوں کے تساہل سے ٹل جائے تو پھر اس کی قضا بھی نہیں ہے خواہ جدید وقت دوبارہ مقرر کردیا جائے۔ پھر ان تمام امور کے اوقات اُسی طرح کتابوں میں منضبط اور شائع شدہ ہیں جس طرح اسلام میں اوقاتِ صلوٰۃ وحج اور عام مؤقت عبادات پر فقہا نے موشگافیوں کے ساتھ مباحث کرکے انہیں ابواب وفصول میں مدوّن کیا تھا۔ ریلوں کے ٹائم ٹیبل الگ ہیں اور دفتروں کے الگ۔ سول کے الگ ہیں اور ملٹری کے الگ۔ بہرحال اصول توقیت کا جس نہج سے اسلام نے روحانیات وعبادات میں استعمال کیا تھا ٹھیک اُسی نہج سے اس قرآنی اصول کا استعمال مسیحیوں نے مادیات وعادات میں کیا اور اس طرح ایک ہی اصول کی روشنی نے دو قوموں کو اپنی اپنی لائن پر حسب عمل آگے بڑھا دیا ایک کو روحانی ترقی کیطرف اور ایک کو مادی ترقی کی جانب۔

مسئلہ جمہوریت واجتماعیت (۲) یا مثلاً اشتراک واجتماع اسلام کا خاص اصول ہے جس کے دقائق سے دنیا نابلد تھی۔ اسلام نے اس اصول کے ذریعہ طاعات وعبادات کو جمہوری بنایا تھا تاکہ بالتبع تمدنی اور علم اقتصادی معاملات میں بھی اجتماعی زندگی قائم ہوجائے اور اس کے ذریعہ عبادات کی تو ادائیگی سہل ہوجائے اور عادات میں ایک کی دوسرے سے نصرت

واعانت ہو جمہور کو ایک ہی کام ملکر کرتے ہوئے دیکھکر اس کیطرف رغبتیں بڑھ جائیں کسل راہ نہ پائے مساوات کی شان قائم ہو جائے۔ اس جیسی وصل وملاپ سے باہم قلبی یگانگت بھی قائم ہو جائے منافع شخصی ہونے کے بجائے قومی ہو جائیں ایک کو دوسرے سے تقویت ہو کر قومی قوت ورعب قائم ہو جائے۔ پھر آپس میں مل بیٹھنے پر مجمع کی ظاہری وباطنی برکات سے ہر ہر فرد مستفید ہو اور ایک کی کمزوری کا دوسرے کی قوت سے جبر نقصان ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس اُصول سے پیدا شدہ یہ حقیقتیں ۔ مساوات ۔ موانست ۔ مراحمت ۔ برکت! قوت اور رعب وغیرہ ہی قومی اقتدار کی بنیادیں ہیں جن سے کسی قوم کے تمدن ومعاشرت کی مستحکم تشکیل ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام نے جمہوریت کے اُصول کو روحانیات میں اس طرح ترتیب دیا کہ تمدنی فوائد اور مادی منافع بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹے اور دین کے ساتھ ساتھ تمدن بھی استوار ہوتا رہے۔ یعنی دین کے پیچھے پیچھے دنیا بھی ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔ چنانچہ نماز رکھی تو جماعت کی تاکید کی۔ زکوٰۃ رکھی تو اجتماعی بیت المال بنایا تاکہ اُس کا نفع شخصی ہونیکے بجائے قومی ہو جائے۔ روزہ بایں لحاظ اجتماعی حیثیت میں آگیا کہ سب ایک ہی سکنڈ اور منٹ پر اپنی اپنی جگہ طعام سحر ترک کریں اور افطار کا فریضہ انجام دیں گویا سب کا روزہ ایک ہی آن پر شروع ہوا اور ایک ہی پر ختم ہو۔ حج نام ہی اجتماع کا ہے جہاد کے اجتماعات کو امام جہاد بنا کر منظم کر دیا۔ پھر دینی معاشرت کو دیکھو تو کل کی کل اسی جمہوری تنظیم کے ساتھ منظم کی گئی ہے حکومت وسیاست ہے تو یا اہی شورہ پر وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ نہ کہ شخصی استبداد پر نصب خلیفہ یا انتخاب امام ہے تو اہل حل وعقد

کے اجتماعی فیصلہ پر نہ کہ بطور وراثت خاندانی۔ گھریلو زندگی کو دیکھو تو اُس کے ایک بڑے کو داعی فرما کر بقیہ اہل بیت کو رعیت بنا دیا ہے تاکہ ہر ہر گھر میں اجتماعی نظام قائم رہے اور اور خانگی معاشرت سہل اور خوشگوار ہو جائے۔ سفر کو دیکھو تو امیر سفر مقرر کر کے اس میں اجتماعی نظم پیدا کر دیا ہے تاکہ سفری بکھیڑے سہل اور قابل تحمل ہو جائیں غرض اسلام نے جمہوریت کے اصول سے تمام اسلامی اور روحانی زندگی کو منظم کر دیا ہے چنانچہ اسلامی پروگرام کے سہل الوصول ہونیکی (علاوہ نفس احکام کی سہولت کے) ایک بڑی وجہ یہ اجتماعیت بھی ہے کیونکہ احکام کے اجتماعی ہونے کی وجہ سے ان کی تعمیل ہر ہر فرد پر سہل ہو جاتی ہے۔

آج کی متمدن اقوام نے اسلام کے اصول جمہوریت کو اختیار کیا اور اُسے قومی زندگی کا جزو بنایا لیکن روحانیات میں نہیں جو اسلام کا مقصد تھا اور جس سے اُن کی روحانیتیں منظم ہو جائیں بلکہ عادات و معاشرات میں جس سے مادی نظام میں ضرور صورتِ جمہوریت قائم ہو گئی ہے۔ آج حکومتیں ہیں تو پارلیمنٹری۔ حکومت رسی ہے تو اجتماعی ییکشنوں کی صورت سے۔ ملکی حالات و خیالات کی ترشیح ہے تو انجمنوں اور جمعیتوں کی شکل میں، احتجاجات ہیں تو مجلسی ریزولیوشن کے رنگ میں شخصی شکایات بھی ہیں تو قومی سوال کی صورت میں موقر عرض حال اور گفت و شنید ہے تو وفود کی صورت میں مسئلوں کو منوانا ہے تو دلائل کے بجائے پارٹیوں اور جماعتوں کے حلقہ میں تجارتیں ہیں تو کمپنیوں کے رنگ میں، صنعت و حرفت ہے تو اجتماعی کارخانوں کی صورت میں، گھریلو زندگی ہے تو ہوٹلوں کی وضع پر، کھیل کود ہیں مقابلے ہیں تو ٹیموں اور جماعتوں کی صورت میں۔ غرض تمدن و معاشرت کی

ہر ہر شخصی اور وحدانی چیز آج اجتماعیت اور جمہوریت کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ اسلام نے اس اُصولِ جمہوریت کو روحانی مقاصد کی تنظیم اور تسہیل کیلئے وضع کیا تھا جس سے مادی منافع بھی خود بخود منتظم ہو جاتے تھے لیکن صورت پرست اقوام نے اُسی اُصول کو رُوحانیت سے الگ ہو کر محض مادی منافع کی تسہیل کیلئے استعمال کیا اسلئے گو صورتِ تنظیم تو کسی قدر پیدا ہو گئی۔ مگر حقیقی تنظیم سے مادہ پرستوں کو کوئی حصہ نہ ملا کیونکہ اسلام نے اگر جمہوریت قائم کی تو مرکزیت کے ساتھ جس میں انتشار و تشویش نہیں اور مادہ پرستوں نے اگر اُسے حاصل کیا تو لامرکزیت کے ساتھ اس لئے اسلام میں تو جمہوریت کا حاصل شیرازہ بندی ہے۔ اور ان تصویری اقوام میں اُس کے معنی اژدحام اور بھیڑ بھاڑ کے ہیں جس کے ذریعہ بہت سے افراد کو ایک جگہ گھیر کر صورتِ جماعت پیدا کر دی جائے خواہ اُن کا کوئی مرکز ہو یا نہ ہو جس کا حاصل تشویش و بے اعتمادی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ پس گو اجتماعیت اور جمہوریت کی رسم ضرور ادا ہو جاتی ہے۔ مگر حقیقت کے درجہ میں افتراق و شقاق کی حکومت ہوتی ہے ایک بڑی جمعیت سے کوئی لیڈر ناخوش ہو کر الگ ہوا تو اُس نے اپنی پارٹی قائم کر لی اور پھر اس جدید پارٹی میں سے کوئی جُدا ہوا تو اس نے ایک اور جماعت بنالی پس اوپر سے لیکر نیچے تک جماعتی صورت ضرور قائم ہے جو متغیر نہیں ہوتی مگر حقیقت میں جمعیت کا کہیں وجود نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حقیقت دوسرے لفظوں میں یہ نکل آتی ہے کہ آج اختلاف و شقاق کو بھی جماعتی رنگ میں استعمال کیا جارہا ہے۔ پس اُصولِ جمہوریت روحانیت کے بلند پایہ مقصد کے لئے وضع کیا گیا تھا لیکن مادہ پرستوں نے اُسے مادیت کے خسیس مقاصد کے لئے استعمال کیا جنہیں

کسی اجتماعی شان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صورت پرستوں کی اِس صنیع اور عملی روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کے دور میں دنیوی زندگی تو جمہوری کہلانے لگی لیکن دینی زندگی جمہوری تو کیا انفرادی صورت میں بھی قائم نہ رہی۔

مسئلہ خطابت عامہ (۳) یا مثلاً خطابت اور تقریر بیان اسلامی زندگی کا ایک خاص شعبہ ہے جس کو حقیقتاً مسلمانوں نے دنیا میں انتہائی سلیقہ کے ساتھ برپا کیا اور وہ انتہائی فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کے ساتھ اس وقت گویا ہوئے جبکہ دنیا گونگی اور بولنے کا سلیقہ نہ رکھتی تھی وہ خود ہی نہیں بولے بلکہ اُنہوں نے ہی دنیا کو بلوایا اور گویا کیا۔ ع

"زباں کھولدی سب کی نطق عرب نے"

قرآن کریم چونکہ خود ہی فصاحت و بلاغت کا ایک عظیم الشان معجزہ تھا جس نے ہر ہر باب کی تقریروں کے عنوانات اور سرخیاں معجزانہ طرز پر قائم کیں اور تقریروں کے تسلسل کا مادہ اپنے طرز بیان سے مسلم قلوب میں پیدا کر کے اُنہیں تنہا اِس میدان کا مرد بنا دیا۔ چنانچہ خطباء اسلام کی شعلہ بیانیوں نے کفر کے حلقوں میں ہلچل ڈالدی اور جہلاء عالم کی آبائی رُسوم اور کورانہ تقلید کے قلعے پاش پاش کر کے اُنہیں اِسلام کی طرف پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ غرض مسلمانوں نے اِس اُصول خطابت کے ذریعہ اشاعت دین اور ترویج مذہب کا کام حیرتناک طریق پر انجام دیا۔ اور حقیقتاً اِس اصول سے یہی غرض بھی تھی کہ وہ دین کے لئے استعمال کیا جائے۔ یعنی اُمت کو دینی تذکیر کیجائے۔ پند و موعظت سے دلوں کو گرمایا جائے۔ بھولی ہوؤں کو دین یاد دلایا جائے۔ جن کو یاد ہے اُنہیں یاد رکھنے کی تاکید کی جائے۔ مسائل کی دلنشین

پیرایوں میں تبلیغ کی جائے۔ رُوحانی مقامات اور اعمال دین کی حرص قلوب میں پیدا کی
جائے۔ یہ غرض نہ تھی کہ اُسے تمدن و معاشرت کی موشگافیوں اور اُس کے مختلف جہتی پہلوؤں
کی یاد دہانیوں کے لئے استعمال کیا جائے اور اُس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ دنیا میں
رہکر انسان دنیا کو خود ہی نہیں بھلا سکتا کہ اُس کی یاد دہانی کی ضرورت ہو۔ ہاں آخرت سے
بعید اور اس کو وطن سے دور رہکر ہر وقت اس کی فراموشی کا خطرہ سامنے تھا اس لئے
دلنشین پیرایوں میں اسکی یاد دہانی اور تذکیر کی ضرورت بھی تھی۔ مسلمانوں نے اس ضرورت
کو انتہائی سلیقہ اور کمال کے ساتھ انجام دیا اُن کے خطبا رکھڑے ہوئے اور تذکیر آخرت کے
سلسلہ میں اپنی سچی اور مؤثر تقریروں سے سینوں کو برمایا دلوں کو تڑپایا روحوں کو گرمایا۔
آنکھوں کو برسایا نفوس کو ڈرایا۔ خود فراموشوں کو چونکایا۔ اور اس طرح منکروں اور سرکشوں
کے جتھوں میں اپنے خطاب عام سے تہلکے ڈالدیئے اور خدا کا حکم بلند کر دکھایا۔

لیکن آج کی متمدن اقوام نے اس قرآنی اصُول کو اختیار کیا اور مسلمانوں سے خطیبوں
کی روانی اور سلاست بیانی سیکھی بھی تو کس مصرف کے لئے؟ دین کے لئے نہیں مسلمانوں
کے دین کے لئے نہ سہی خود اپنے دین کے لئے بھی نہیں۔ بلکہ تمدن کے دنی اور خسیس امور
میں موشگافیاں کرنے کے لئے اسمبلیوں اور کونسلوں میں آج کے قابلانہ لکچر اور خطبے کس
موضوع پر ہیں نمک کے محصول پر۔ منڈیوں کے بھاؤ پر۔ رُوئی کی پیداوار پر۔ تجارتی
سلسلوں کو فروغ دینے پر۔ صنعت و حرفت اور دستکاری کو رواج دینے پر۔ کارخانوں
کی مزدوریوں پر۔ ریل و تار کے کرایوں اور محصولات پر۔ پارچہ بافی اور اُس کی نکاسی پر۔

اسٹیشنری اور دوسرے سامانوں کی درآمد برآمد پر۔ مکان کے ٹیکسوں پر۔ پھر ایسی تمدنی جزئیات پر
جن سے لذاتِ جسمانی اور تعیش کا خاکہ تیار کیا جا سکے۔ مثلاً ننگے اور برہنہ رہنے کے فوائد پر۔
زناکاریوں کے اعداد و شمار پر۔ سرقہ کی تفصیلات پہ۔ غرض جس قدر شعبے اس مادّی زندگی
کی آرائش و نمائش اور آسائش و زیبائش سے تعلق رکھتے ہیں وہی آجکل کی خطابت
و تقریر کا موضوع ہیں۔ وکلاء کی فصاحت بیانی مختاران عدالت کا زورِ لسانی اور بذل جویوں
کی نکات آفرینی سب ہی کچھ انہی وسائل و معاملات کی تکمیل کیلئے ہے جنکا تعلق بقاءِ
تمدن اور ترویج معاش سے ہے نہ کہ دیانت و راست بازی اور دین و مذہب کے بقاء عزّت
و حرمت کے ذرائع سے۔ پس تقریر و خطابت۔ تسلسل بیان اور خطاب عام کا اُصول اور
اُسکو عمل میں لانے کے مادے قرآن نے لاکر پیش کئے جس سے دنیا بولنا سیکھی لیکن اُس کا
حقیقی مصرف حقائق و معارف الٰہیہ تھیں تاکہ بندے خدا سے مربوط ہوں نہ کہ مادی وسائل
کی تدقیق اور اشاعت و ترویج جس سے بندے خدا کو چھوڑ کر خود اپنی خودی ہی میں پھنس کر
رہجائیں اور روحانیات کی پابندیوں سے گر کر مادی دلدل ہی میں دھنس کر رہجائیں پس اُمّتِ
نصرانیہ نے یہ قرآنی اصول ضرور اختیار کیا مگر مصرف بدلکر اُسے مادیات میں استعمال کیا۔ اور
اُسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

مسئلۂ تفکر و تدبّر (۲۱) اسی طرح مثلاً تفکر و تدبر کا اُصول نہایت ہی جامعیت کیساتھ
قرآن کریم نے قائم کرکے عالم کے تمام عقلاء اور حساس انسانوں کو اُس کی دعوت دی۔ تاکہ
ارواح کے مخفی خزانے خیال کی کاوشوں سے باہر آجائیں چنانچہ آسمان و زمین اور اُن کی

پیداوار۔ نباتات وحیوانات کی عجیب وغریب خلقتیں انسانی ظاہر وباطن کے عجائبات وغیرہ اُس نے اس لئے سامنے رکھے تھے تاکہ بندے ان عجائبات قدرت کو کامل تدبر اور دقت نظر سے دیکھکر اُن کے حقیقی موجد وصانع تک رسائی حاصل کرسکیں اور ایمان ومعرفت کی دولت سے مالامال ہوجائیں۔

لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝۔ تاکہ لوگ اُس کی آیتوں میں غور کریں اور اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

اِس تدبیر کا نتیجہ ظاہر ہے کہ جس حد تک اُس صناع حقیقی کی صنعتوں کا کمال کھلتا جائیگا اُسی حد تک اُس کی مختلف شانیں اور صفات واضح ہوتی جائیں گی اور پھر اُن شئون کے سامنے رہنے سے انہی کے مناسب طاعات وعبادات کی طرف طبیعت چلتی آئے گی بس اس طرح ایک متفکر انسان اپنی دنیا سے آخرت اور اپنی ریاضت سے لازوال راحت کے ملک پر قابض ہوتا جائے گا اور اپنے نتائج فکر سے رُوحانیت کی نئی نئی راہوں کی طرف عروج کرتا جائیگا۔ قرآن کریم نے اُصول تفکر کی یہی غرض وغایت ٹھہرائی ہے اور اِس لئے تفکر پر حرص دلائی ہے۔

قرآنی اصول سے ایجادات کی طرف ذہنی انتقال

پھر جہاں قرآن کریم نے حساس انسانوں کو دعوت دی وہیں فکر کو استعمال میں لانے کی عملی لائن بھی بچھائی اور اس طرح دعوت تفکر اور طریق تفکر دونوں کی ایک ہی بیان میں تکمیل کردی۔ چنانچہ قرآن کریم نے کتنی ہی شرعی اور تکوینی حقائق کے قدرتی جوڑ بندپر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ ایسے انداز سے افعال الٰہی کی

توضیح و تشریح کی ہے اور اپنے طرز بیان کو کچھ ایسے عمل خیز طریقہ پر پیش کیا ہے کہ اگر اُس تکوینی عمل کی تصویر کو سامنے رکھکر ذرا بھی غور کیا جائے اور عملی حرکت شروع کر دی جائے تو ذہن صدہا اختراعات وایجادات کی طرف خود بخود ہی منتقل ہونے لگتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر متفکر دماغ روحانیت آشنا ہے تو معنوی ایجادات اور نظریات کے نتائج کیطرف دوڑ جائے گا جو علمی لائن سے متعلق ہوں گے اور اگر مادّیات میں ڈوبا ہوا ہے تو مادی ایجادات کی طرف منتقل ہو جائیگا۔ جو صنعت وعمل کی لائن سے وابستہ ہوں گے پہلی فکری حرکت کا نام اجتہاد ہو گا۔ اور دوسری فکری حرکت کا نام ایجاد ہو گا۔ مگر بہرحال دونوں لائنوں میں یہ اصول عمل ضرور ہے کہ سربمہر اسرار قدرت کو واشگاف کر دیں۔ نمونہ کے طور پر ایک اصول پر نگاہ ڈالئے جو چند آیات و احادیث کو ملا کر دیکھنے سے کھلتا ہے وہ یہ کہ چند متضاد بسیط مادّوں کو اگر الگ الگ رکھا جائے تو نہ اُن میں کوئی ترقی ہوتی ہے اور نہ اُن سے بجز مقررہ طبعی وظائف و آثار کے کوئی نئی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان کو کسی خاص ترکیب سے جمع کر دیا جائے تو ان کی باہمی کشاکش سے مختلف الالوان عجائبات کا ظہور بھی ہوتا ہے اور اس مرکب میں ترقی کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

مثلاً قرآن کریم نے انواع مخلوقات کے سلسلہ میں ایک ایسی غیر محسوس نوع کی اطلاع دی جو مرکز طاعت ہے اور جس میں عصیان کا نام و نشان نہیں یعنی ملائکہ علیہم السّلام۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ	بلکہ وہ فرشتے اس کے بندے ہیں معزز۔ وہ اُس سے آگے بڑھکر بات
بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○	نہیں کر سکتے اور وہ اسکے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔

لَا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَھُمۡ وَ — نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو اُن کو حکم دیتا ہے۔

یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ۝ — اور جو کچھ اُن کو حکم دیا جاتا ہے اُسکو فوراً بجا لاتے ہیں۔

پھر شیطان کی نوع پر مطلع فرمایا کہ وہ مرکز کفران و عصیان ہیں جن میں طاعت کا نام نہیں

وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوۡرًا ۝ — اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے۔

پھر بہائم و انعام کا پتہ دیا کہ وہ کھانے پینے اور جگتے موتنے کے سوا نہ طاعت سے واقف

و عصیان سے باخبر چنانچہ اُن منکر اور غافل انسانوں کو جو محض لذات جسمانیہ کھانے پینے وغیرہ

میں لگ کر حرام و حلال کی تمیز سے بے بہرہ ہو گئے ہوں بہائم سے تشبیہ دی گئی۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَتَمَتَّعُوۡنَ وَ — اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اسطرح

يَاۡكُلُوۡنَ كَمَا تَاۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ — کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔

نیز جنہوں نے اپنے قوائے فکر و احساس کو فانی لذات پر قربان کر کے غفلت شعاری اختیار

کر لی ہو انہیں بھی بہائم سے مشابہ ٹھہرا لیا۔ ارشاد ہے

اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ — یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ۝ — بے راہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

یہ ایسی بسیط انواع ہیں کہ ان میں ایک ایک مخصوص مادہ، طاعت، عصیان، غفلت

بھر دیا گیا ہے اور پیدا ہوتے ہی اُن میں سے ہر نوع مشین کے کل پرزوں کی طرح اپنے مادہ

خاص کے مناسب افعال میں لگ جاتی ہے اور جدت سے مستقل رنگی رہتی ہے۔ نہ ان میں کوئی

ترقی ہے نہ جدت آرائی ہے۔

ایک فرشتہ اگر پیدا ہوتے ہی مثلاً رکوع وسجود میں لگا دیا گیا تو وہ لگ گیا اور لاکھوں برس بھی گذر جائیں تو اُسی طرح لگا رہیگا۔ اسے طاعت کے صرف اِس شعبہ کی خبر اور جس ہے جس میں مصروف ہے لیکن طاعت کے ایسے مفہوم کلی پر کوئی اطلاع نہیں جس سے وہ طاعت کی نئی نئی اور مناسب وقت جزئیات کا استخراج کر سکے۔ پس اُسے کہدیا جائے تو کرلیگا لیکن قوت عاملہ کے ماتحت کلیات پر مطلع ہو کر جزئیات نکالنا یا اطاعت کے خوش کرنے کے لئے کچھ نئے ڈھنگ اختیار کرنا اُس کی حد شعور سے بالاتر ہے۔

اُسی طرح شیطان جب سے پیدا ہوا وہ ایک ہی نوع کی معصیت اور بغاوت پر آمادہ رہتا ہے اُس میں کوئی ترقی نہیں کہ اُس کی اگلی ذریت پچھلی سے کچھ بڑھ جائے۔ جس ڈھنگ پر ہزارہا برس کا شیطان چل رہا ہے اور تسویل نفوس کے ذریعہ غافل انسانوں کو اپنی راہ چلا رہا ہے اُسی پر آج کا پیدا شدہ شیطان بھی چلے اور چلا ئیگا۔

اِسی طرح بہائم کے جذر طبیعت میں جو خورونوش کا ایک جذبہ ہے وہ اُس پر لگے ہوئے ہیں انہیں بھی کوئی جدت یا ارتقار نہیں۔ آدم علیہ السّلام کے وقت کی گائے جو گھاس کھاتی تھی وہی آج کی گائے بھی کھاتی ہے جس پر وہ خلقی رہنمائی سے لگادی گئی لگ گئی۔ نہ اُنہی کھانوں میں کوئی ترقی کی نہ رہنے سہنے کو کچھ خوش آیند بنایا۔

اِن تین انواع کے تذکرہ کے بعد قرآن کریم نے ایک ایسی چوتھی مخلوق پر مطلع فرمایا کہ جس میں یہ تمام حقائق ودیعت کی گئیں تھیں اور پھر اُن کو ایک خاص ترتیب سے لا کر ایک ہی سفالی ظرف میں جمع کر دیا گیا۔ یعنی مٹی کے ایک مخصوص ڈھانچہ میں ملکیت۔ شیطنت۔ بہیمیت

کے سارے ہی متضاد عناصر ایک عجیب و غریب ترکیب اور اعتدال کیساتھ جوڑ کر عبد کر دیئے اور اُس مجموعہ کا نام انسان رکھدیا گیا۔ چنانچہ اسی اعجوبہ عالم مرکب اور انسانی نفس میں ملکیت وشیطنت کے اسی اجتماع کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ۔

اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اسکو درست بنایا پھر اُسکی بدکاری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اُس کو القا کیا

پھر اسی ظرف میں بہیمیت کے متعلق ارشاد ہے۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

آپ اُن کو اُن کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ خوب کھالیں اور چین اُڑالیں اور خیالی منصوبے اُن کو غفلت میں ڈالے رکھیں اُنکو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

بہرحال جبکہ یہ تینوں بسیط مادے ملکیت، شیطنت، بہیمیت جو الگ الگ فرشتہ وشیطان اور بہیمہ میں رکھے گئے تھے جن میں باہم تضاد بھی ہے اور توڑ بھی جبکہ انسان میں لاکر جوڑ دیئے گئے تو قدرتی طور پر اُس میں جوڑ توڑ کی حقیقت قائم ہو گئی چنانچہ وہ فہم میں بھی جوڑ توڑ لگاتا رہتا ہے اور علم و عمل میں بھی اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جوڑ توڑ کا خاصہ اضافہ وترقی ہے چنانچہ اگر دو الگ الگ چیزوں کو ملا دو تو ایک تیسری چیز حاصل ہو جاتی ہے جو اشیاء کا ارتقاء ہے اور اگر ایک مخلوط چیز کے اجزاء جدا جدا کر دو تو چند الگ الگ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں جو اجزاء کا ارتقاء ہے اسی کا نام جدت آرائی یا ترقی ہے کہ علمی جوڑ توڑ یا ترتیب نظری جدید علمی انکشافات حاصل کر لئے جائیں اور عملی جوڑ توڑ سے روحانیات و مادیات کے جدید عجائبات منظر عام پر

سے آتے جائیں۔ اس سے یہ نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی و تجدد اور جدت آرائی کی شان فقط انسان ہی میں ہو سکتی ہے اور بس کہ جوڑ توڑ اسی کے قویٰ میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اسی جوڑ توڑ اور مذکورہ متضاد عناصر کی کشاکش لے ہر چہار جانب کے متضاد میدان اور باطنی پہلو انسان کیلئے کھول رکھے ہیں کہ وہ جدھر بھی ہو لیتا ہے ان تھک بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بہیمیت کے لحاظ سے دیکھو تو آدم علیہ السلام کے وقت میں انسانوں کی جو غذائیں اور ملبوسات تھے آج اپنی اس جدت آرائی کی بدولت اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس نے کھانے پینے اور لذائذ کی صورتیں پیدا کر لی ہیں۔ ملکیت کے لحاظ سے تو تقدس و تنزہ اور روحانی پاکیزگیوں میں مذاہب و شرائع کے زیر سایہ اس نے وہ ترقی کی کہ ہر اگلی اُمت پچھلی اُمت کو طاعت و عبادت اور قرب مع اللہ میں شہ دیتی رہی ہے حتیٰ کہ انسانی کُنبہ آخر کار ایک ایسے کامل مکمل دین پر پہنچ گیا کہ بشری دائرہ میں اُس سے زیادہ اور اُس کے آگے کوئی راستہ ہی باقی نہیں۔ مگر پھر بھی ترقی کا دروازہ بایں معنی کسی وقت بند نہیں کہ اسی دین کے اصول کے ماتحت عروج کے اور بھی لاانتہاء درجات ہیں جو علمی جدوجہد سے طے ہو سکتے ہیں۔ شیطنت کے لحاظ سے لو تو چالاکیوں اور عیاریوں جعلسازیوں اور فریب بازیوں میں بھی انسان نے وہ ارتقائی شان پیدا کی کہ ہر اگلی قوم پچھلوں کو بے وقوف ثابت کئے دیتی ہے اور ابھی بہت کچھ ذخیرہ باقی ہے جو شاطر انسانوں کی عملی جدوجہد سے رفتہ رفتہ سامنے آتا جا رہا ہے۔

غرض ہر مادہ کے لحاظ سے انسان میں ایک ممتاز ارتقائی شان موجود ہے جو اُسے پچھلی حالت کی نسبت سے آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ خیر و شر اور ملکیت و شیطنت کی دونوں

متضاد راہوں میں انسان کی اس ممتاز ترقی کا تذکرہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے پھر اُن میں جو بگڑا ہوا ہوجاتا ہے، ہم اُسکو پستی کی حالت تک نیچے سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔

ایجاد کی حقیقت | غرض قرآنی تصریحات سے پتہ چلا کہ کچھ انواع بسیط ہیں جنہیں جدا جدا کوئی ارتقائی شان نہیں ہے اور ایک مخلوط نوع ہے جو اپنی شان جامعیت کے ماتحت اپنے پہلو میں جدت آرائی اور ارتقاء کی شان رکھتی ہے۔ اس قرآنی روشنی سے ایک مبصر کے لئے یہ اصول مستنبط کر لینا بالکل سہل ہے کہ اگر متضاد بسیط عناصر کو الگ الگ رکھا جائے تو وہ صرف اپنا ایک ہی طبعی وظیفہ ادا کریں گے لیکن اگر ایک خاص ترتیب سے اعتدال کے ساتھ انہیں جمع کر دیا جائے تو پھر اُن کے اجتماع سے ایک جدید طاقت پیدا ہوگی جس کے بے پناہ عمل کے سامنے یہ بسیط عناصر بھی عاجز رہ جائیں گے اگر اسی اصول کو جبکہ وہ قرآنی تعلیمات سے ذہنوں میں پیوست ہو جائے اُس کے صحیح مصرف (شرعیات یا روحانیات) سے نکال کر کوئی فلاسفر اسے مادیات میں استعمال کرنا چاہے تو کیا وہ چند مادی عناصر کے جوڑ توڑ سے نئی نئی طاقتیں اور نئے نئے نمونے کے سامان اختراع نہیں کر سکتا؟ ضرور کر سکتا ہے اور کوئی مشینری بطور ... اگر وہ روحانی جسد نہیں تو مادی شوہد ضرور بنجائے گا اور اس کے ذریعہ مادیات کے نئے نئے کرشمے پردہ دنیا پر نمایاں ہونے شروع ہو جائیں گے۔

مشینری کی ایجاد کا اصول | (۱) مثلاً اس اصول کی روشنی میں یوں دیکھا جائے کہ آگ ایک بسیط

عنصر ہے جو جلانے کے سوا دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ پانی ایک بسیط عنصر ہے جو بجھانے اور گلانے کے سوا کوئی اور عمل نہیں کر سکتا گویا ان دونوں متضاد طاقتوں میں ملکیت اور شیطنت کی طرح جُدا جُدا کوئی ترقی نہیں لیکن اگر کسی مضبوط آہنی ظرف میں آگ رکھکر اس کے اندر خاص طریقے سے پانی کو محبوس کر دیا جائے تو اُس اجتماع و اتصال سے فطری طور پر ایک تیسری طاقت اسٹیم کی تیار ہو جائے گی جو دو طاقتوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے حد درجہ قوی اور اپنی ذاتی اجزا کی کشاکش کے سبب ایک خاص اُبھار اور ارتقار کی شان رکھیگی اسٹیم کی اس عروجی طاقت، دَوڑنے بھنگنے والی طاقت، اور بجائے جلانے اور گلانے کے سے اُڑنے والی طاقت میں ایک ایسی ترقی کا جذبہ ہوگا کہ خواہ اُس کے ذریعہ ہزار ہا من لوہے کو دوڑا دو منوں وزنی پہیوں کو گھما دو زمین کھودتے چلے جاؤ۔ فضار آسمانی میں پرواز کر جاؤ۔ ہوا کو نیچے کھینچ لو یا پانی کو اُوپر چڑھا دو۔ غرض مادیات کے اسفل سافلین تک پہنچ جاؤ۔ یا اعلیٰ علیین تک چڑھ جاؤ سب کچھ ممکن ہوگا پس اس سے قرآنی بیان اور اُس سے مستنبط شدہ اُصول سے اگر ایک مادی ذہنیت انجنوں اور مشینوں کی ایجاد کی طرف چل نکلے تو کونسی تعجب کی جگہ ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مادی ترقیات ایسے شرعی اُصول سے بیگانہ تو کیا ہوتیں خود اُنہی کا ایک غیر محسوس اثر ہیں۔ گو ایک مادی فلاسفر اور موجد کے ذہن میں یہ استحضار و استفادت نہ ہو کہ اُس میں یہ اُصول کیسے اور کس طرح شرعی رہنمائی سے پہنچا لیکن حقیقتاً ان تمام ذہنی روشنیوں میں جس سے نئے نئے اختراعات ظہور پذیر ہوں کار فرمائی انہی فطری اُصول اور علوم الٰہیہ کی ہوتی ہے۔

ایجاد کا اصول شرعی ہے اور اصول الٰہی سے ماخوذ ہے

(۲) یا مثلاً شریعت نے حکمیات و مسائل کے سلسلہ میں ایک عملی مرکب کا پتہ دیا کہ وہ نماز ہے پھر تنبیہ کی کہ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو متعدد شرعی اجزاء اُس میں سے نکلیں گے ارشاد نبوی ہے

اِنَّمَا هِیَ التَّسْبِیْحُ وَالتَّکْبِیْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْاٰن۔ (مشکوۃ صفحہ ۹۰) نماز کی حقیقت صرف تسبیح، تکبیر، در قرآن کی تلاوت ہے۔

ظاہر ہے کہ تسبیح، تہلیل، تکبیر اور تلاوۃ قرآن مستقل عبادتیں ہیں جنکو اگر الگ الگ عمل میں لایا جائے تو اثرات و ثمرات اور ہوتے ہیں اور اگر اُن کو خاص ترکیب سے جوڑ کر مجموعی حیثیت سے استعمال کیا جائے جسے نماز کہتے ہیں تو اثرات دوسرے ہو جاتے ہیں پھر اگر ان اجزاء کی حقیقتیں الگ الگ دریافت کی جائیں تو اور قسم کے علوم پیدا ہوتے اور اگر مجموعہ صلوٰۃ کے اسرار و حقائق کا سُراغ لگایا جائے تو حقائق و معارف کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے غرض مرکبات میں پہنچکر علم و عمل کی نوعیت اور ہوتی ہے اور مرکبات کے اجزاء میں پہنچکر کچھ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس مرکب کے تجزیہ اور اجزاء کے تکلیہ سے انسانی دماغ ایک کلی اصول پر پہنچتا ہے جسے تحلیل و ترکیب کہتے ہیں۔ اور یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ جوڑ توڑ اور تحلیل و ترکیب ہی انسانی ترقی کی حقیقت ہے۔ پس اگر سی تحلیل و ترکیب کے شرعی اصول کو جس کا استعمال نماز کی عبادت میں ابھی شرعی تعلیم کے ماتحت دکھلایا گیا ہے۔ کیمیادی طریق پر مادی اجزاء میں استعمال کیا جائے تو بلا شبہ یہیں سے مادی ترقیات اور جدید اختراعات کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ انہی جنگل کی جڑی بوٹیوں کو خاص وزن کے ساتھ

مخصوص ترکیب دیجائے تو سونا تیار ہوجاتا ہے جسے کیمیا کہتے ہیں سمندر کے پانی کی تحلیل
کی جائے تو نمک نکل آتا ہے چنانچہ معدنیات میں یہی ترکیب و تحلیل کا اصول استعمال
کرنے سے آج صدہا کیمیاوی عجائبات پردۂ ظہور پر نمایاں ہو رہے ہیں اسی طرح عنصریات
میں استعمال کرنے سے آج ہزارہا مادی ایجادات منصۂ شہود پر آتے جا رہے ہیں بہرحال
یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جس فطری اصول کو جو شرعیات کیلئے وضع کیا گیا تھا ایک مادی
دماغ مادہ کے مفردات و مرکبات میں بعینہٖ اس طرح استعمال کرسکتا ہے جس طرح روحانیوں
نے اسے مجموعہ نماز کی تحلیل اور اجزاء نماز کی ترکیب میں استعمال کیا تھا۔ اور اس کلی اصول
میں ضرور اس کی صلاحیت ہے کہ وہ روحانیات کی طرح مادیات میں بھی نئے نئے نتائج
پیدا کرے اصطلاحی فرق وہی ہوگا کہ ان علمی اصولوں سے شرعیات کی مخفی تفاصیل کا استخراج
اجتہاد کہلائے گا اور انہی علمی اصول سے مادیات کے مخفی رازوں کا انکشاف ایجاد
کہلایا جائے گا۔

بہرحال علمی اجتہاد ہو یا عملی ایجاد ہو دونوں چیزیں انہی قدرتی اصول کا ثمرہ ہیں جو قرآنی
فطرت نے لا کر پیش کئے مسلمانوں نے ان اصول سے وہی کام لیا جو ایک مطیع حق کو لینا
چاہیے تھا انہوں نے تفکر و تدبر کے ذریعہ عالم آفاق اور عالم انفس کے مخفی راز آشکارا کئے
مکائد نفس، مقامات روح، روابط آخرت، تقلیب کو ڈھونڈھ نکالا کلام حق اور افعال حق میں
غور کرکے اسرار غیب کو سپرد زبان و قلم کیا اور حکمتوں کے چشمے ان کے قلوب سے پھوٹ نکلے
یہاں تک کہ انہوں نے ہر باطل میں سے حق کو ڈھونڈھ لیا اور ہر صنعت کو آئینہ جمال صانع

کر دکھلایا۔

اُمتِ مسیحیہ نے اُصولِ قرآنیہ کو مادہ و صورت میں استعمال کیا

آج کے تمدنی مدبر (نصرانی مفکر) بھی اس قرآنی اصول پر عمل پیرا ہوئے جبکہ یہ اُصول اور اس جیسے اور اُصول مسلمانوں کی تعلیم کے عموم سے رفتہ رفتہ ان کے قلوب اور دماغوں میں سرایت کر گئے اور انہوں نے بھی اس عمل کو اُس کے تسلسل سے اخذ کر کے استعمال کیا۔ لیکن کس مصرف میں؟ روحانیات میں نہیں۔ معرفتِ حق میں نہیں۔ تلاشِ آخرت میں نہیں بلکہ مادیات کے سربستہ راز کھولنے میں پھر نہ اس لئے کہ صانعِ برحق کی یاد تازہ ہو بلکہ اس لئے کہ اُس کی ذات فراموش ہو کر محض اپنا نفس اور صرف اُسی کا مادی مفاد یاد رہ جائے کہ مادہ پرستی اور صورت پسندی کا ثمرہ ہی قدرتی طور پر حقیقت فراموشی ہے اس لئے اس اُصولِ تفکر کو اگر مسلمانوں نے رُوح، نفس، عرش، کرسی اور حقائقِ غیبیہ کی تحقیق و تلاش میں صرف کیا تھا تو نصرانیوں نے اسی اُصول کو آگ، پانی، ہوا، مٹی کی صورتوں اور اُن کے موالید برق، گیس، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، ریل، موٹر، طیارہ، اسٹیمر، کلوں اور کارخانوں میں صرف کیا۔ کہیں طبقاتِ ارض پر تحقیق کے ساتھ غور و فکر ہو رہا ہے تا کہ سونا چاندی اور مختلف معدنیات نکل آئیں اور دادِ عیش دی جا سکے کہیں نباتات پر غور کیا جا رہا ہے کہ کپڑا، کاغذ اور دوسرے مصنوعات اُن سے تیار ہو سکیں کہیں پھلوں کو بار بار قلم کر کے جڑ سے بڑا کئے جانے کے تجربات ہو رہے ہیں کہ تجارت کو فروغ ہو سکے کہیں حیوانات کی کھالوں، ہڈیوں اور آنتوں کو جمع کیا جا رہا ہے تا کہ [illegible] کے دستے اور مختلف سامان بنائے جا سکیں اور مادی جنجال [illegible]

سریع العمل آلات کی ایجادات پر غور ہو رہا ہے کہ مادی منافع کی تحصیل میں کوئی ادنیٰ تاخیر بھی نہ ہو۔ اور جذبات عیش سرد نہ پڑنے پائیں۔ کہیں مشینوں اور کلوں کے ذریعہ لوہے پیتل وغیرہ دھاتوں کو خوبصورت سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے کہیں لکڑیوں کو فرنیچر کے لئے تراشا جا رہا ہے۔ کپڑوں کو منقش اور نگارین کیا جا رہا ہے تاکہ تمدن کی چمک دمک روز افزوں ہو کر دنیا کو اپنا شیدا بنا تی رہے اور اس نشاط بازی میں مبتلا ہو کر اگر کبھی یہ انسانی برادری بھولے سے بھی اپنے مبداؤ و معاد اور آنے والی زندگی کو یاد کر سکتی تھی وہ بھی نہ کرنے پائے۔

پس اس ترکیب و تحلیل کے اصول سے اس مادی قوم نے بلاشبہ ایجادی ترقی کی اور کرنی چاہیئے تھی کہ یہ اصول ہی ترقی کا تھا۔ لیکن رُوح کے بجائے اُس کا میدان مادہ قرار پایا۔ مادہ کے مقامات کھولے۔ لوہے کو بلوا دیا۔ وزنی دھاتوں کو نچا دیا۔ پہاڑوں کو برما دیا۔ شہروں کو جگمگا دیا۔ بدنوں کو گرما دیا اور گویا مادہ کو ہمہ تنگ رُوح بنا کر زندہ کر دکھایا۔ لیکن اس ظاہری اور نمائشی حیات کے ذریعہ باطن ہمہ تنگ مادہ بنا کر زندگی سے دور کر لیا۔ روحوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ قلوب کو مردہ بنا لیا۔ نفوس کو تاریک کر دیا۔ اقلیم جان میں خاک اُڑا دی اور صورت کو سنوارنے کے پیچھے حقیقت کھو دی اور انجام بگاڑ لیا۔ محسوسات میں تدبر کی دولت ختم کر کے مغیبات اور اسرار سے الگ ہو گئے۔ کیا اور کھو دیا۔ محنت کی اور رائیگاں کر دی دنیا تو ایک مقررہ مدت کے بعد کھو دی اور آخرت کو پہلے ہی سے کھو دیا اس لئے نہ دُنیا ہی ہاتھ لگی نہ آخرت۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ○ أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ○ ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيٰتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ○

یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی، اور وہ بوجہ جہل کے اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا (یعنی کتب الٰہیہ کا) اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں سو اس لئے ان کے سارے کام غارت ہو گئے تو قیامت کے روز ہم ان (کے نیک اعمال) کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے بلکہ ان کی سزا وہی ہوگی یعنی دوزخ اس سبب سے کہ انہوں نے کفر کیا تھا اور یہ کہ میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔

اُمت مسلمہ اور اُمت مسیحیہ میں صورت و حقیقت کی نسبت قائم ہے

خلاصہ یہ ہے کہ آج کا تمدن اور اُس کے نظر فریب مناظر یا عام تمدنی نظریات اگر رونق افزائے عالم بنے ہوئے ہیں تو حقیقتاً ان کی تمام تر رونق اُنہی قرآنی اُصول سے پیدا شدہ ذہنیت کا ثمرہ ہے جن کو عہد اسلام میں مسلمانوں نے پھیلایا اور وہ غیر محسوس طریق پر اقوام کا جزو طبیعت بنتے بنتے آخر کار طبیعت ثانیہ ہو گئے اور ہر قوم نے اپنی ذہنیت کے مناسب اُن کی روشنی میں تفریعات کیں مسلمانوں نے اپنی حقیقت پسند ذہنیت کی بدولت اُنہی اصول کی روشنی میں حقائق کی لائن اختیار کر لی اور عیسائیوں نے اپنی صورت پسند ذہنیت سے صور و اشکال کی راہ لے لی

ترقی دونوں نے کی مگر ایک نے حقیقی اور ایک نے رسمی۔ اُمت مسلمہ ان علمی اُصول کے ذریعہ
جس درجہ حقائق کی طرف بڑھتی ہے اُمت مسیحیہ اُسی قدر صورتوں کی طرف دوڑتی ہے۔
وہ رُوحانیات کی گہرائی میں گھستی ہے یہ مادیات کی گہرائیوں میں۔ وہ عرش کی طرف لپکتی
ہے۔ یہ فرش کی طرف دھنستی جاتی ہے اور اس طرح ان دونوں میں وہی نسبت قائم ہو جاتی
ہے جو صورت و حقیقت، جسم و روح اور ظاہر و باطن میں ہوتی ہے۔

اب اس پر غور کرو کہ صورت و حقیقت میں سے حقیقت اصل ہوتی ہے اور صورت
اس کا اثر۔ حقیقت اپنی صورت کو وجود دیتی ہے اور صورت اپنی حقیقت کی محض نمائش
کرتی ہے یعنی اگر حقیقت نہ ہو تو صورت کے موجود ہونے کی کوئی صورت نہیں اور صورت
نہ ہو تو حقیقت کے وجود و بقا میں کوئی بھی کھٹکا نہیں۔ ہاں حقیقت کے کھلنے اور ظاہر ہونے
کی بجز صورت کوئی سبیل نہیں۔ اس لئے صورت کا تو وجود حقیقت پر موقوف ہے مگر
حقیقت کا وجود صورت پر موقوف نہیں گو اُس کا ظہور اور اُس کے مخفی اسرار اور قوائے سربستہ
کا انکشافات صورت پر موقوف ہے۔ پس جبکہ اُمت نصرانیہ مثل صورت کے ہے اور اُمت
اسلامیہ مثل حقیقت کے تو نتیجہ صاف نکلتا ہے کہ اُمت مسلمہ کے معنوی کمالات نہ ہوں
تو اُمت نصرانیہ کے یہ ظاہری کمالات سرے سے ہی نہ ہوں لیکن اگر یہ کمالات ظاہری نہ ہوں
تو معنوی کمالات [illegible] ہے کہ [illegible] ظہور اور کشف
نہ ہو [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ اُمت نصرانیہ کا یہ قومی اور تعمیری نظم [illegible] علیہ ہی
کے قومی اور [illegible] کی تشکیل یافتہ ہی ہیں اگر اسلامی اُمت شارح ہے تو نصرانی اُمت ناقل ہے

اگر وہ اصل ہے تو یہ اس کی فرع ہے۔ اگر وہ اساس ہے تو یہ اس پر تعمیر شدہ ایک نقشہ ہے جس کے تمام مظاہر انہی اساس مصادر کے تابع ہیں اور گویا اُمت نصرانیہ کو اُمتِ اسلامیہ سے ایک ایسی مخصوص نسبت ہو جاتی ہے جو دنیا کی اور اقوام کو اس اُمت سے حاصل نہیں ہے۔

حضرت عیسوی اور بارگاہ محمدی کی باہمی نسبت اصل و فرع اور ابوّة و بنوّة کی ہے۔

اس مقدمہ کو یاد کر لینے سے ایک لطیف مقصد اور ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب تمام اُمتوں کی ذہنیت اپنے مقتدیانِ اولین کی ذہنیت کا ثمرہ ہوتی ہے اگر اُن میں وہ کمال نہ ہوتا تو اُن تربیت یافتوں میں کہاں سے آتا (چنانچہ ثابت ہو چکا ہے) تو یہیں سے یہ بھی نکل آتا ہے کہ اُمتوں میں بلحاظ ذہنیت جو نسبت بھی قائم ہوگی وہ در حقیقت اُن کے مقتداؤں ہی کی باہمی نسبت کا ثمرہ ہوگی اگر انہی مربیوں میں یہ نسبت نہ ہوتی تو اُن تربیت یافتوں میں کہاں سے آجاتی؟ کیونکہ یہ باہمی نسبت ذہنیت کے تفاوت سے قائم ہوتی ہے۔ اور ذہنیت اُوپر کا ثمرہ ہے تو لامحالہ نسبت بھی اُوپر ہی کا ثمرہ ہونا چاہیئے پس اگر اُمتِ اسلامیہ اور اُمت نصرانیہ میں بلحاظ حقیقت و صورت منشا اور ناشی یا اصل اور فرع کی نسبت ہے تو ضرور ہے کہ اُن کے مقتدیانِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح علیہ السّلام میں بھی اصل و فرع اور منشا و ناشی کی نسبت ہو گویا اگر بلحاظ کمالات حضور کی ذاتِ اقدس ایک پاک حقیقت ہو تو بلحاظ جمالات حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی ذاتِ مبارک اُس کی ایک پاک صورت ہو جس میں حضور ہی کی معنوی شباہت کام کر رہی ہو کہ اصل و فرع میں تناسب و تشابہ ایک قدرتی چیز ہے۔ اندریں صورت یہ دعویٰ شاید حق بجانب اور معقول ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السّلام کو حضور کی ذاتِ اقدس کے ساتھ علاوہ اُس عام استفادہ

کمالات باطن کی نسبت کے جو تمام انبیاء علیہم السّلام کی طرح انہیں بھی حاصل ہو ایک ایسی ظاہری اور حسّی نسبت بھی حاصل ہو جو اُن کے حسّی وجود کو بھی حضور ہی کی طرف منسوب کر سکے تاکہ اُن کے حضور آثار کارنامے آپ کے حقیقت افزا کارناموں کا اظہار ہو سکیں اور حقیقت و صورت کی وہ ذکر کردہ نسبت اپنے پورے کمال کے ساتھ اُن مبارک ذوات میں نمایاں ہو تا آنکہ یہی نسبت پھر اُن کی اقوام میں بھی ایک بنیادی رنگ میں ظاہر ہونے لگے مگر یہ ظاہر ہے کہ معنوی تناسب یا حسّی تعلق اور ظاہری ربط قائم ہونے کیلئے ظاہری اتصال اور حسّی قرب شرط ہے کہ اس کے بغیر حسّی رابطہ نمایاں ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی حضور سے خصوصی مناسبتیں

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسّی اتصالات کی جو انواع حضرت مسیح علیہ السّلام کو حضور کی ذات سے حاصل ہیں وہ کسی نبی کو بھی میسّر نہیں ہیں جیسے قربِ زمانی۔ قربِ مکانی۔ قربِ تصویری۔ قربِ افعال۔ قربِ منصبی اور قربِ نسبی وہ اتصالات ہیں جو بداہتہً نمایاں نظر آتے ہیں۔

قربِ زمانی قربِ زمانی کو لو تو عہدِ عیسوی عہدِ محمدی سے ایسا ملحق و متصل ہے کہ اُن کے درمیان میں کوئی دوسرا عہدِ نبوّۃ ہی حائل نہیں خود ارشادِ نبوی ہے۔

انا اولی بعیسیٰ ابن مریم فانہٗ	میں ہی حضرت عیسٰے سے قریب تر ہوں کہ اُن کے
لیس بینی وبینہٗ نبیٌّ ۔	اور میرے درمیان میں کوئی نبی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ قربِ زمانی اور اتصالِ عہد کو استفادۂ کمالات میں خاص دخل ہے۔ آخر حضور کے زمانہ مابعد میں سب سے قریب تر حضرات صحابہ ہیں جنہوں نے برکاتِ نبوت سے بلاکسی واسطہ و ترجمان کے کسبِ فیض کیا

اور آفتاب نبوت کی کرنوں سے بلا کسی حائل و حجاب کے مستنیر ہوئے۔ اس لئے دنیائے اسلام جانتی ہے کہ اُن کے علمی و اخلاقی کمالات بلندی کی کس سطح پر پہونچے؟ انکا زمانہ خیر القرون ہوگیا اور انکا طبقہ قیامت تک کے تمام طبقات خیر سے مقدس ترین طبقہ بنگیا۔ اسی طرح حضورؐ کے زمانہ ما قبل میں بھی جو طبقہ یا فرد کسی نہ کسی جہت سے بھی آپ سے قریب تر ہو اور خصوصاً وہ کہ حضور اپنے ہی کو اُس سے قریب تر فرمائیں یقیناً اس کا رنگ بھی حضورؐ سے اقرب ترین الوان ہونا چاہئے اور اُس میں حضورؐ کے کمالات کا نقش کچھ ایسی طرح منعکس ہو جانا چاہئے جو اوروں میں ممکن نہو۔

طبقہ انبیاء علیہم السّلام میں چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا دور نبوت حضورؐ کے عہد نبوت سے بلا واسطہ ملحق اور متصل ہے اس لئے نقش کمالات محمدی کا وہ عکس جو قلب عیسوی پر پڑ سکتا تھا اور قلوب کے لئے ضروری نہ تھا۔

قرب حسّی و تصویری اور اُس کے قرائن

اسی کے ساتھ وہ مخصوص قرب اور حسّی اتصال جس نے عیسیٰ علیہ السلام کو حضورؐ کے باطن ہی سے نہیں ظاہر سے بھی مستفید کیا یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السّلام کنوارپن میں بلا نکاح اور بلا شوہر حاملہ ہوئیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اُن کے بطن میں پہنچا دیئے گئے۔ مگر حمل کی یہ صورت حضرت مریم کیلئے کوئی بدنما صورت نہ تھی جبکہ قرآن کریم کے دعوے کے مطابق یوں واقع ہوئی۔

اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا	جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ایک ایسے مکان میں
مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ	جو شرق کی جانب میں تھا غسل کیلئے گئیں۔ پھر اُن
مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا	لوگوں کے سامنے سے انہوں نے پردہ ڈال لیا پس ہم نے

إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا	ان کے پاس اپنے فرشتہ جبریل کو بھیجا اور وہ انکو
بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّيٓ	سامنے ایک پورا آدمی بنکر ظاہر ہوا۔ کہنے لگیں
أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن	کہ میں تجھ سے اپنے خدائے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں
كُنتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠	اگر تو کچھ خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاوے گا)۔
رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ	فرشتہ نے کہا کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا
لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا ۝۔	فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔

اس روح پاک کا یہ تمثل مریم صدیقہ کے سامنے ایک نہایت ہی کامل الخلقۃ موزون الاعضا معتدل القامتہ اور بہت ہی خوبصورت نوجوان کی شکل میں ہو۔ کیونکہ بشر سوی اُسی کو کہتے ہیں جس کے جوڑ بند چال ڈھال میں کوئی ادنی نقص بھی نہ ہو اور بشری خوبیاں جو ممکن سے ممکن خوشنمائی اور تناسب اعضاء ہو وہ اُس میں موجود ہو۔ پس اس انتہائی خوبصورت پیکر اور نہایت ہی خوش ادا ہیئت نے مریم کے گریبان میں پھونک ماری جو بمنزلہ القاء نطفہ کے تھی جس سے وہ حاملہ ہو گئیں یہ ایسی مکمل ہیئت کس کی تھی؟ اور ایسا بے انتہا خوشنما البشری جامہ کس شخصیت کا تھا؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے اِس پر غور کرو کہ جس شریعت نے ہمیں یہ پتہ دیا ہے کہ یہ پھونک مارنے والی ہیئت اپنی بدنی بناوٹ میں ایسی اعلیٰ سے اعلیٰ اور اکمل سے اکمل تھی کہ عالم میں جس کا نظیر نہ ہو اسی شریعت سے ہمیں یہ بھی دریافت کرنا چاہئے کہ آیا اس کے نزدیک دنیا میں کوئی ایسا بشر سوی پیدا بھی ہوا ہے جس کی یہ شبیہ تھی؟ یا یہ محض کوئی فرضی صورت تھی جو مریم کے سامنے پیش کر دی گئی؟ سو نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے (واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم) کہ عالم میں

ظاہری جوڑ بند کے لحاظ سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل الخلقت اور تام الہیئۃ اور کوئی نہیں گذرا۔

اوّل تو اس بنا پر کہ دائرہ بشریت میں آپکے باطنی کمالات انتہائی ہیں کہ ان سے بڑھ کر بشری جامہ میں اور کمال سما جانا متصور ہی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل نفس اپنے ہی مناسب کسی ایسی ہی کامل ہیئت پر فائز ہو سکتا ہے پس ضروری تھا کہ آپکا بدنی ڈھانچہ اور بشری سانچہ بھی اس قدر مکمل ہو کہ اس سے بڑھکر بشر کے تصور میں نہ آسکے تاکہ اُس میں یہ انتہائی کمالات والا نفس پاک ڈھل سکے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ معقول حقیقت صراحت کے ساتھ خود شریعت ہی سے نکل رہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حق میں دعا فرما رہے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ كَمَا اَحْسَنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ۔ — اے اللہ جیسے تو نے میری صورت بہترین بنائی ہے ایسے ہی میری سیرت بہترین کر دے۔

اس دعا میں باطنی کمالات کو ظاہری کمالات سے مطابقت و مشابہت دیکر طلب کرنا اور خلقت کی خوبی کا حوالہ دیکر اخلاق کی خوبی مانگنا یا صورت کی خوبی کو ذریعہ بنا کر سیرت کی خوبی کا سوال کرنا بتلا رہا ہے کہ عامۃً باطنی موزونیت ظاہری ساخت کی موزونیت ہی کی قدر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں عام ارشاد ہے۔

اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِيْ حِسَانِ الْوُجُوْهِ (کنز العمال) — خیر کو یعنی حسن خصلت کو اچھی صورتوں میں تلاش کرو۔

گویا ظاہر سانچہ ہے اور باطن اُس میں ڈھلنا ہوتا ہے پس سانچہ جس وضع کا ہوگا اُسی وضع کی حقیقت کا اُس میں ڈھلاؤ ہوگا۔

اس دعا سے صاف نمایاں ہو رہا ہے کہ حضور اپنی ظاہری خلقت میں بھی سارے عالم سے اکمل تھے کیونکہ دعا میں طلب اس کی ہو کہ جیسی ظاہری خلقت ہے ویسی ہی باطنی خلقت (اخلاق) بھی مجھے عطا کی جائے اور یہ ظاہر ہے کہ باطنی اخلاق حضور کو وہ عطا ہوئے جو اگلوں اور پچھلوں میں کسی کو نہیں ملے تھے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور یہ اخلاقی کمال بدنی کمال کی قدر ہی دعا میں مانگا گیا تھا تو اس سے صاف نکل آیا کہ بدنی کمال بھی حضور کو وہ عطا ہوا جو اگلے اور پچھلوں میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس لئے حقیقتاً اگر کوئی پیکر علی الاطلاق بشر سوی کہلائے جانیکا مستحق ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضور ہی کی ذات اقدس کا پیکر ہو سکتا ہے۔

نیز حدیث میں حضرت یوسف علیہ السّلام کے حسن کے متعلق ارشاد نبوی ہے۔

فاذا قد اعطی شطر الحسن (مسلم) — یعنی (نصف حصہ حسن کا سارے عالم کو دیا گیا اور) نصف حصہ تنہا یوسف علیہ اسلام کو عطا ہوا۔

پس یوسف علیہ السّلام حسینان عالم میں یکتا ہوئے ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جاءنی جبریل فقال ان اللہ یقرئ علیک السلام و یقول لک حبیبی انی کسوت حسن یوسف من نور الکرسی و کسوت حسن وجھک من نور عرشی رواہ ابن عساکر (خصائص کبریٰ صہ ۶۲ ج ۱)

جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا اللہ تعالیٰ آپکو سلام کہتا ہے اور کہتا ہے اے میرے محبوب میں نے یوسف کو حلہ جمال "کرسی" کے نور سے پہنایا ہے اور تمہارے لئے حسن و جمال ذاتی کی خلعت اپنے نور عرش سے تیار کی ہے۔

اس روایت میں حسن نبوی کو حسن یوسف پر اسی درجہ فوقیت دی گئی ہے جس درجہ عرش کو کرسی پر فضیلت حاصل ہے۔ نیز صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے حسن و جمال کو بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ زنان مصر نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو دیکھکر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اگر ہمارے حبیب کو کہیں دیکھ پائیں تو اپنے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن یوسف تو سارے عالم سے بڑھکر ہے اور حسن محمدی حسن یوسف سے بڑھکر ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ عالم میں حسن محمدی کا کوئی نظیر و مثل نہیں ہے چہ جائیکہ اس سے بڑھکر کسی کا حسن ہو۔ اسی لئے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حسب روایت ترمذی و بیہقی و طبقات ابن سعد اور برا ابن عازب رضی اللہ عنہ حسب روایت بخاری و مسلم فرماتے ہیں

ما رأیت شیئاً احسن من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (خصائص کبریٰ جلد اول صـ)	میں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی چیز ہی نہیں دیکھی۔

نیز حضرت علی ابن ابی طالب ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ حضور کو کبھی چاند سے تشبیہ دیکر کبھی چاندی سے کبھی چمکتے ہوئے سورج سے کبھی انتہار سے زیادہ چمکدار اور روشن چیزوں کی تشبیہ دیکر فرماتے ہیں۔

لم ار قبلہ ولا بعدہ مثلہ (خصائص کبریٰ جلد اول صـ)	میں نے حضور جیسا پہلے کبھی دیکھا نہ بعد میں۔

ان حضرات کا پہلے نہ دیکھنا ظاہر ہو کہ علم کا دعویٰ ہے یعنی ہمیں علم ہے کہ پہلے بھی ایسا مجسمہ حسن و جمال نہیں گذرا۔ اور بعد میں نہ دیکھنا پیشینگوئی ہے یعنی بعد میں بھی ایسا مظہر حسن و جمال پیدا نہ ہوگا بس یہاں رُویت حسّی مراد نہیں ہے بلکہ رویت علمی۔ گویا اپنے علم کی رُو سے یہ حضرات مدعی ہیں کہ پہلے

کوئی ایسا حسین گذرا نہ بعد میں گذریگا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت صحابہ جیسے ارباب دین وتقوی کا علم تخمینی یا ظنی نہیں ہے۔ بلکہ بیان واقعات میں اور وہ بھی ماضی ومستقبل کے حالات میں اور وہ بھی بصورت دعوی ضروری ہے کہ ان کے پاس صریح نقل ہو یا کسی نقل ہی صحیح استنباط ہو۔ اس لئے اس دعوی کا حاصل یہ نکل آیا کہ ہم شرعی علم کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایسی پاکیزہ صورت وہیئت نہ کبھی پہلے ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔

اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بیان حسن نبوی میں نفی کے ساتھ اثباتی پہلو پر آتے ہیں تو یوں کہتے ہیں۔

عن البراء قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن الناس وجہاً واحسنہم خلقاً (بخاری ومسلم خصائص کبریٰ ص)	حضرت براء سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم تمام دنیا سے زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق تھے۔
وعن عبداللہ بن بریدۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان احسن البشر (خصائص ص)	حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولاد آدم سے زیادہ حسن وجمال کے مالک تھے۔

بہرحال ان تمام تعبیرات سے جو حسن نبوی کے بیان کیلئے صحابہ کی زبانوں پر آئی ہیں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ جس طرح نوع بشر میں بلحاظ کمالات باطن یکتا اور جوہر فرد تھے اسی طرح کمالات ظاہر اور حسن وجمال میں بھی اکمل اور تام الخلقت تھے جو بشر سوی کا صحیح ترجمہ ہے۔

اگر وہ اصل ہے تو یہ اُس کی فرع ہے۔ اگر وہ اساس ہے تو یہ اُس پر تعمیر شدہ ایک نقشہ ہے جس کے تمام مظاہر اُنہی اساسی مصادر کے تابع ہیں اور گویا اُمت نصرانیہ کو اُمت اسلامیہ سے ایک ایسی مخصوص نسبت ہو جاتی ہے جو دنیا کی اور اقوام کو اس اُمت سے حاصل نہیں ہے۔

حضرت عیسوی اور بارگاہ محمدی کی باہمی نسبت اصل و فرع اور اُبُوّۃ و بُنُوّۃ کی ہے۔

اس مقدمہ کو باور کر لینے سے ایک لطیف مقصد اور ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب تمام امتوں کی ذہنیت اپنے مُقتدایان اولین کی ذہنیت کا ثمرہ ہوتی ہے اگر اُن میں وہ کمال نہ ہوتا تو اُن تربیت یافتوں میں کہاں سے آتا (چنانچہ ثابت ہو چکا ہے) تو یہیں سے یہ بھی نکل آتا ہے کہ اُمتوں میں بلحاظ ذہنیت جو نسبت بھی قائم ہوگی وہ درحقیقت اُن کے مقتداؤں ہی کی باہمی نسبت کا ثمرہ ہوگی اگر اُنہی مربیوں میں یہ نسبت نہ ہوتی تو اُن تربیت یافتوں میں کہاں سے آجاتی؟ کیونکہ یہ باہمی نسبت ذہنیت کے تفاوت سے قائم ہوتی ہے۔ اور ذہنیت اُوپر کا ثمرہ ہے تو لامحالہ نسبت بھی اُوپر ہی کا ثمرہ ہونا چاہئیے پس اگر ملت اسلامیہ اور اُمت نصرانیہ میں بلحاظ حقیقت و صورت منشا اور ناشی یا اصل اور فرع کی نسبت ہے تو ضرور ہے کہ اُن کے مقتدایان اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح علیہ السّلام میں بھی اصل و فرع اور منشا و ناشی کی نسبت ہو گویا اگر بلحاظ کمالات حضورؐ کی ذات اقدس ایک پاک حقیقت ہو تو بلحاظ جمالات حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی ذات مبارک اُس کی ایک پاک صورت ہو جس میں حضورؐ ہی کی معنوی شباہت کام کر رہی ہو کہ اصل و فرع میں تناسب و تشابہ ایک قدرتی چیز ہے۔ اندریں صورت یہ دعویٰ شاید حق بجانب اور معقول ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السّلام کو حضورؐ کی ذات اقدس کے ساتھ علاوہ اُس عام استفادہ

کمالات باطن کی نسبت سے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح انہیں بھی حاصل ہے ایک ایسی ظاہری اور حسی نسبت بھی حاصل ہو جو اُن کی حسی وجود کو بھی حضور ہی کی طرف منسوب کر سکے تاکہ اُن کے صوری آثار کارنامے آپ کے حقیقت آفرار کارناموں کا اثر ظاہر ہو سکیں اور حقیقت وصورت کی وہ ذکر کردہ نسبت اپنے پُورے کمال کے ساتھ اُن مبارک ذوات میں نمایاں ہو تا آنکہ یہی نسبت، پھر اُن کی اقوام میں بھی ایک بنیادی رنگ میں ظاہر ہونے لگے مگر یہ ظاہر ہے کہ صوری تناسب یا حسی تعلق اور ظاہری ربط قائم ہونے کیلئے ظاہری اتصال اور حسی قرب شرط ہے کہ اس کے بغیر حسی رابطہ نمایاں ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی حضور سے مخصوص مناسبتیں

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسی اتصالات کی جو انواع حضرت مسیح علیہ السلام کو حضور کی ذات سے حاصل ہیں وہ کسی نبی کو بھی میسر نہیں ہیں جنمیں سے قرب زمانی۔ قرب مکانی۔ قرب تصویری۔ قرب افعال۔ قرب منصبی اور قرب نسبی وہ اتصالات ہیں جو بداہتہً نمایاں نظر آتے ہیں۔

قرب زمانی قرب زمانی کو لو تو عہد عیسوی عہد محمدی سے ایسا ملحق و متصل ہے کہ اُن کے درمیان میں کوئی دوسرا عہد نبوۃ ہی حائل نہیں خود ارشاد نبوی ہے۔

اَنَا اَوْلٰی بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فَاِنَّہٗ	میں ہی حضرت عیسےٰ سے اقرب تر ہوں کہ اُن کے
لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ نَبِیٌّ۔	اور میرے درمیان میں کوئی نبی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ قرب زمانی اور اتصال عہد کو استفادۂ کمالات میں خاص دخل ہے۔ آخر حضور کے زمانہ مابعد میں سب سے قریب تر حضرات صحابہ ہیں جنھوں نے برکات نبوت سے بلا کسی واسطہ و ترجمان کے کسب فیض کیا

اور آفتاب نبوت کی کرنوں سے بلا کسی حائل و حجاب کے مستنیر ہوئے۔ اس لئے دنیائے اسلام جانتی ہے کہ اُن کے علمی و اخلاقی کمالات بلندی کی کس سطح پر پہونچے؟ اُنکا زمانہ خیر القرون ہو گیا اور اُنکا طبقہ قیامت تک کے تمام طبقات خیر سے مقدس ترین طبقہ بنگیا۔ اسی طرح حضورؐ کے زمانہ ماقبل میں بھی جو طبقہ یا فرد کسی بکسی جہت سے بھی آپؐ سے قریب تر ہو اور خصوصاً وہ کہ حضور اپنے ہی کو اُس سے اقرب تر فرمائیں یقیناً اس کا رنگ بھی حضورؐ سے اقرب ترین الوان ہونا چاہئے اور اُس میں حضورؐ کے کمالات کا نقش کچھ ایسی طرح منعکس ہو جانا چاہئے جو اوروں میں ممکن نہو۔

طبقہ انبیاء علیہم السّلام میں چونکہ عیسٰی علیہ السلام کا دور نبوت حضورؐ کے عہد نبوت سے بلا واسطہ ملحق اور متصل ہے اس لئے نقش کمالات محمدی کا وہ عکس جو قلب عیسوی پر پڑ سکتا تھا اور قلوب کے لئے ضروری نہ تھا۔

قرب حِسّی و تصویری اور اُس کے قرائن

اسی کے ساتھ وہ مخصوص قرب و حِسّی اتصال جس نے عیسٰی علیہ السلام کو حضورؐ کے باطن ہی سے نہیں ظاہر سے بھی مستفید کیا یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السّلام کنوارپن میں بلا نکاح اور بلا شوہر حاملہ ہوئیں۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السّلام اُن کے بطن میں پہنچا دیئے گئے مگر حمل کی یہ صورت حضرت مریم کیلئے کوئی بدنما صورت نہ تھی جبکہ قرآن کریم کے دعوے کے مطابق یوں واقع ہوئی ۔

اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا	جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ایک ایسے مکان میں
مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ	جو مشرق کی جانب میں تھا غسل کیلئے گئیں۔ پھر اُن
مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا	لوگوں کے سامنے سے انہوں نے پردہ ڈال لیا پس ہم نے

اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا	ان کے پاس اپنے فرشتہ جبریل کو بھیجا اور وہ انکو
بَشَرًا سَوِیًّا ۞ قَالَتْ اِنِّیْٓ	سامنے ایک پورا آدمی بنکر ظاہر ہوا۔ کہنے لگیں
اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ	کہ میں تجھ سے اپنے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں
كُنْتَ تَقِیًّا ۞ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا	اگر تو کچھ خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاویگا)
رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ	فرشتہ نے کہا کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا۔
لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ۞ ۔	فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔

اِس روح پاک کا یہ تمثل مریم صدیقہ کے سامنے ایک نہایت ہی کامل الخلقۃ، موزوں الاعضا معتدل القامۃ اور بہت ہی خوبصورت نوجوان کی شکل میں ہوا کیونکہ بشر سوی اُسی کو کہتے ہیں جس کے جوڑ بند چال ڈھال میں کوئی ادنیٰ نقص بھی نہ ہو اور بشری خوبیوں میں جو ممکن سے ممکن خوشنمائی اور تناسب اعضاء ہو وہ اُس میں موجود ہو۔ پس اس انتہائی خوبصورت پیکر اور نہایت ہی خوش ادا ہیئت نے مریم کے گریبان میں پھونک ماری جو بمنزلہ القاء نطفہ کے تھی جس سے وہ حاملہ ہو گئیں یہ ایسی اکمل ہیئت کس کی تھی؟ اور ایسا بے انتہا خوشنما بشری جامہ کس شخصیت کا تھا؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے اس پر غور کرو کہ جس شریعت نے ہمیں یہ پتہ دیا ہے کہ یہ پھونک مارنے والی ہیئت اپنی بدنی بناوٹ میں ایسی اعلیٰ سے اعلیٰ اور اکمل سے اکمل تھی کہ عالم میں اُس کا نظیر نہ ہو اسی شریعت سے ہمیں یہ بھی دریافت کرنا چاہیئے کہ آیا اس کے نزدیک دنیا میں کوئی ایسا بشر سوی پیدا بھی ہوا ہے جس کی یہ شبیہ تھی؟ یا یہ محض کوئی فرضی صورت تھی جو مریم کے سامنے پیش کر دی گئی؟ سو نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) کہ عالم میں

ظاہری جوڑ بند کے لحاظ سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل الخلقت اور تام الہیئۃ اور کوئی نہیں گذرا۔

اول تو اس بناء پر کہ دائرہ بشریت میں آپکے باطنی کمالات انتہائی ہیں کہ ان سے بڑھ کر بشری جامہ میں اور کمال سما جانا متصور ہی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل نفس اپنے ہی مناسب کسی ایسی ہی کامل ہیئت پر فائز ہو سکتا ہے پس ضروری تھا کہ آپکا بدنی ڈھانچہ اور بشری سانچہ بھی اس قدر مکمل ہو کہ اس سے بڑھکر بشر کے تصور میں نہ آسکے تاکہ اس میں یہ انتہائی کمالات والا نفس پاک ڈھل سکے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ معقول حقیقت صراحت کے ساتھ خود شریعت ہی سے نکل رہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حق میں دعا فرما رہے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ کَمَا اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ۔ اے اللہ جیسے تونے میری صورت بہترین بنائی ہے ایسے ہی میری سیرت بہترین کردے۔

اس دعا میں باطنی کمالات کو ظاہری کمالات سے مطابقت و مشابہت دیکر طلب کرنا اور خلقت کی خوبی کا حوالہ دیکر اخلاق کی خوبی مانگنا یا صورت کی خوبی کو ذریعہ بنا کر سیرت کی خوبی کا سوال کرنا بتلا رہا ہے کہ عامۃً باطنی موزونیت ظاہری ساخت کی موزونیت ہی کی قدر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں عام ارشاد ہے۔

اُلْتَمِسُوا الْخَیْرَ فِیْ حِسَانِ الْوُجُوْہِ (کنز العمال) خیر کو یعنی حسن خصلت کو اچھی صورتوں میں تلاش کرو۔

گویا ظاہر سانچہ ہے اور باطن اُس میں ڈھلا ہوا ہے۔ پس سانچہ جس وضع کا ہوگا اُسی وضع کی حقیقت کا اُس میں ڈھلاؤ ہوگا۔

اس دعا سے صاف نمایاں ہورہا ہے کہ حضور اپنی ظاہری خلقت میں بھی سارے عالم سے اکمل تھے کیونکہ دعا میں طلب اس کی ہو کہ جیسی ظاہری خلقت ہے ویسی ہی باطنی خلقت (اخلاق) بھی مجھے عطا کی جائے اور یہ ظاہر ہے کہ باطنی اخلاق حضور کو وہ عطا ہوئے جو اگلوں اور پچھلوں میں کسی کو نہیں ملے تھے وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور یہ اخلاقی کمال بدنی کمال کی قدر ہی دعا میں مانگا گیا تھا تو اس سے صاف نکل آیا کہ بدنی کمال بھی حضور کو وہ عطا ہوا جو اگلے اور پچھلوں میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس لئے حقیقتاً اگر کوئی بیکر علی الاطلاق بشر سوی کہلائے جانیکا مستحق ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضور ہی کی ذات اقدس کا پیکر ہو سکتا ہے۔

نیز حدیث میں حضرت یوسف علیہ السّلام کے حسن کے متعلق ارشاد نبوی ہے۔

فاذا قد اعطی شطر الحسن (مسلم)	یعنی نصف حصہ حسن کا سارے عالم کو دیا گیا اور نصف حصہ تنہا یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا۔

پس یوسف علیہ السّلام حسینان عالم میں یکتا ہوئے ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جاءنی جبریل فقال ان اللہ یقرئ	جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا اللہ تعالیٰ آپکو سلام کہتا
علیک السلام ویقول لک حبیبی	ہے اور کہتا ہے اے میرے محبوب میں نے یوسف
انی کسوت حسن یوسف من	کو خلہ جمال کرسی کے نور سے پہنایا ہے اور تمہارے
نور الکرسی وکسوت حسن جھلک	لئے حسن وجمال ذاتی کی خلعت اپنے نور عرش
من نور عرشی رواہ ابن عساکر (خصائص کبریٰ ص۶۳)	سے تیار کی ہے۔

اِس روایت میں حسنِ نبوی کو حسنِ یوسف پر اسی درجہ فوقیت دی گئی ہے جس درجہ عرش کو کرسی پر فضیلت حاصل ہے۔ نیز صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہ آپ کے حسن جمال کو بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ زنانِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اگر ہمارے حبیب کو کہیں دیکھ پاتیں تو اپنے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حسنِ یوسف تو سارے عالم سے بڑھکر ہے اور حسنِ محمدی حسنِ یوسف سے بڑھکر ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ عالم میں حسنِ محمدی کا کوئی نظیر و مثل نہیں ہے چہ جائیکہ اُس سے بڑھکر کسی کا حسن ہو۔ اسی لئے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حسب روایت ترمذی و بیہقی و طبقات ابن سعد اور براء ابن عازب رضی اللہ عنہ حسب روایت بخاری و مسلم فرماتے ہیں

مارأیت شیئاً احسن من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خصائص کبریٰ جلد اول ص۶۲)	میں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی چیز ہی نہیں دیکھی۔

نیز حضرت علی ابن ابی طالب، ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ حضور کو کبھی چاند سے تشبیہ دیکر کبھی چاندی سے کبھی چمکتے ہوئے سورج سے کبھی انتہا رسے زیادہ چمکدار اور روشن چیزوں کی تشبیہ دیکر فرماتے ہیں۔

لم ار قبلہ ولا بعدہ مثلہ (خصائص کبریٰ جلد اول ص۶۲-۶۳-۶۴-۶۵)	میں نے حضور جیسا پہلے کبھی دیکھا نہ بعد میں۔

ان حضرات کا پہلے نہ دیکھنا ظاہر ہو کہ علم کا دعویٰ ہے یعنی ہمیں علم ہے کہ پہلے بھی ایسا مجسّمہ حسن و جمال نہیں گذرا۔ اور بعد میں نہ دیکھنا پیشینگوئی ہے یعنی بعد میں بھی ایسا مظہر حسن و جمال پیدا نہ ہوگا۔ پس یہاں رُؤیت حسّی مراد نہیں ہے بلکہ رؤیت علمی۔ گویا اپنے علم کی رُو سے یہ حضرات مدعی ہیں کہ نہ پہلی

کوئی ایسا حسین گذرا نہ بعد میں گذریگا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ جیسے ارباب دین وتقوی کا علم تخمینی یا ظنی نہیں ہے۔ بلکہ بیان واقعات ہیں اور وہ بھی ماضی ومستقبل کے حالات ہیں اور وہ بھی بصورت دعوی ضروری ہے کہ ان کے پاس صریح نقل ہو یا کسی نقل صحیح سے استنباط ہو۔ اس لئے اس دعوی کا حاصل یہ نکل آیا کہ ہم شرعی علم کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایسی پاکیزہ صورت وہیئت نہ کبھی پہلے ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔

اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بیان حسن نبوی میں نفی کے ساتھ اثباتی پہلو پر آتے ہیں تو یوں کہتے ہیں۔

عن البراء قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن الناس وجھاً واحسنھم خلقاً (بخاری ومسلم خصائص کبریٰ ص۲۰۰)	حضرت براء سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا سے زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق تھے۔
وعن عبداللہ بن بریدۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان احسن البشر (خصائص ص۲۰۰)	حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولاد آدم سے زیادہ حسن وجمال کے مالک تھے۔

بہر حال ان تمام تعبیرات سے جو حسن نبوی کے بیان کیلئے صحابہ کی زبانوں پر آئی ہیں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آپ جس طرح نوع بشر میں بلحاظ کمالات باطن یکتا اور جوہر فرد تھے اسی طرح کمالات ظاہر حسن وجمال میں بھی اکمل اور تام الخلقت تھے جو بشر سوی کا صحیح ترجمہ ہے

حتیٰ کہ اسلام کا مشہور فلسفی اور حکیم بو علی ابن سینا ان روایات کو دیکھ کر علمی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ عالم میں اعدل المزاج اکمل القویٰ اور اتم الاعضاء ذات اقدس نبوی کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

ان شواہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس شریعت نے یہ خبر دی تھی کہ مکان شرقی میں مریم عذراء کے سامنے ایک بشر سوی و تام الخلقت مرد کی لاجواب شبیہ پیش کی گئی تھی اُسی شریعت نے یہ بھی بتلایا کہ ایسی لاجواب اور بے نظیر شبیہ اگر عالم میں پیدا کی گئی ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ تو کیا شریعت کی ان دونوں خبروں سے بے تکلف یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مریم بتول کے سامنے جبرئیل کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں پیش کیا گیا اور اس طرح آپ کی شبیہ مبارک ادھر مریم کیلئے بمنزلہ زوج کے قرار دیا گیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کیلئے بمنزلہ والد کے۔ لیکن ابھی تک یہ نظریہ ایک قیاس اور وجدانی صورت میں تھا اور قرائن و شواہد کے ماتحت ایک لطیفہ و نکتہ کی حیثیت رکھتا تھا جس میں حجیت کی شان کچھ مغلوب تھی اور اس وجہ سے کچھ اور بھی ناقابل التفات تھی کہ ایک ناکارہ علم و عمل کے فکر کی اُس میں آمیزش بھی۔ اسی لئے اس نظریہ کو زبان و قلم پر لانے اور بطور دعویٰ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن جبکہ بعض مسلم حقانیوں کا میلان خاطر بھی اس نظریہ کی طرف محسوس ہوا (جیسا کہ آگے آرہا ہے) تو ہمت بندھ گئی کہ اس نظریہ کو سطح کاغذ پر پیش کر دیا جائے۔

چنانچہ شیخ عبدالغنی نابلسی نے انجیل کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے جو حقائق پیش کئے ہیں اُن سے اس نظریہ پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ انجیل میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے جبکہ اُس کی آیت کی تفسیر سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے خاتم المفسرین

صاحب روح المعانی نقل فرماتے ہیں کہ انجیل کی بسم اللہ جس سے اس کتاب مقدس کا آغاز ہوتا ہے متی کی ایک روایت سے ماخوذ ہے جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک وصیت کا ذکر کرتے ہوئے متی نے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

بسم الاب و الابن و روح القدس	شروع باپ کے نام سے اور بیٹے کے اور روح القدس کے

نصاریٰ اس کی جو بھی تفسیر کریں لیکن علماء اسلام نے دیانت کے ساتھ انجیل کی آیتیں اور پیغمبر انجیل علیہ السلام کی شان عبدیت کو سامنے رکھکر اس بسم اللہ کی جو کچھ تفسیر کی ہے ایک متلاشی حقیقت کے لئے وہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔

شیخ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ نے قرآن کریم اور انجیل کی بسم اللہ میں فرق دکھلانے کیلئے ایک مستقل رسالہ (کشف الغین عن الفرق بین البسملتین) تصنیف فرمایا جس میں انجیل کی بسم اللہ کی حسب ذیل تفسیر کی گئی ہے۔

فالاب اشارة الی الروح الذی هو	پس باپ کے لفظ سے اشارہ ہے اُس روح کی طرف جو اللہ
اول مخلوق اللہ تعالیٰ کما فی الخبر	کی سب سے پہلی مخلوق ہے جیسا کہ احادیث میں خبر دی گئی
هو المسمّی بالعقل والقلم و الحقیقة	ہے اور اسی کا نام کہیں عقل اور کہیں قلم اور کہیں حقیقت
المحمدیة ویضاف الی اللہ فیقال	محمدیہ ہے اور اس روح کی نسبت تکریماً اللہ کی طرف کی جاتی
روح اللہ للتشریف والتعظیم کناقة اللہ۔	ہے تو روح اللہ کہا جاتا ہے جیسے ناقۃ اللہ۔
و روح القدس اشارة الیه ایضاً	اور روح القدس سے اشارہ پھر اسی روح کی طرف ہے
باعتبار ظهوره بصورة البشر	لیکن بلحاظ اس کے ظہور کے بشری کی صورت میں

السری النافخ فی درع مریم علیہا السلام۔	جس نے مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونک ماری۔ (اور وہ اسی دم حاملہ ہوگئیں)
والابن اشارۃ الی عیسیٰ علیہ السلام وھو ابن لذلک الروح باعتبار ان تکونہ بسبب نفخہ انتھی (روح المعانی جلد ۵ تحت آیۃ ولا تقولوا ثلثۃ)	اور ابن سے اشارہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اور وہ اس روح کے بیٹے ہیں اس اعتبار سے کہ ان کی پیدائش اس روح کے پھونک مارنے سے عمل میں آئی۔

شیخ کی اس تفسیر سے اتنا ضرور واضح ہوگیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی تکوین و تولید میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والد کی حیثیت میں دخل ضرور ہے پھر ہم نے تو صرف یہی دعویٰ کیا تھا کہ حضور کی صرف شبیہ مبارک ہی حضرت عیسیٰؑ کیلئے بمنزلہ باپ کے ہے جس میں جبرئیلؑ نمایاں ہو کر مریمؑ کے گریبان میں پھونک مدی۔ لیکن شیخ کے کلام میں اس سے بھی بڑھ کر یہ دعویٰ موجود ہے کہ مریم عذراء کے سامنے نہ صرف شبیہ محمدیؐ ہی نمایاں ہوئی بلکہ حقیقتِ محمدی بھی اس میں کارفرما تھی۔ جو حمل عیسویؑ کا ذریعہ بنی۔ بہرحال انجیل کی بسم اللہ اور شیخ کی تفسیر اور پھر مسلک جمہور سے بطور قدر مشترک یہ ضرور نکل آتا ہے کہ مریم بتول کے سامنے آکر پھونک مارنے والی حقیقت صورت محمدیؐ کا جامہ پہنے ہوئے تھی اب خواہ وہ حقیقت بھی حقیقت محمدیہ ہی تھی جیسا کہ شیخ کا نظریہ ہے یا جبرئیل علیہ السلام تھے جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے مگر ہمارا دعویٰ دونوں صورتوں میں بے غبار رہتا ہے کہ بہر دو صورت شبیہ محمدی ہی مریم عذراء کے سامنے آئی جس نے پھونک مار کر حضرت مسیح علیہ السلام کو بطن مادر میں پہنچایا۔ نہیں بلکہ اگر فکر سلیم سے کام لیا جائے تو میرے خیال میں جمہور اور شیخ کے مسلکوں میں بھی کوئی تعارض یا تخالف نہیں رہتا ہوسکتا ہے کہ شبیہ محمدی میں آنے والے تو جبرئیل ہی ہوں لیکن حقیقت محمدی سے مستنیر اور

اُس کے حامل بنکر آئے ہوں تاکہ ایک طرف تو اُن کیلئے شبیہ محمدی اختیار کرنا بامعنی ہو جائے اور اوپر حقیقت عیسوی حقیقت محمدیؐ سے قریب تر ہو جائے جس کا راز یہ ہو کہ اُمت مسیحیہ کے بعد ہی اُمت محمدیہ کا دور شروع ہونے والا تھا گویا اُمت مسیحیہ اُمت مسلمہ کیلئے ایک تمہید تھی جو اصل مقصود سامنے لانے والی تھی (چنانچہ بشارت عیسوی سے (جسکو قرآن کریم نے آیت کریمہ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ میں ذکر کیا ہے) واضح ہے۔) اس لئے مناسب تھا کہ نبی اسلام کی حقیقت سے نبی نصرانیہ خلقۃً آشنا کر دیا جائے۔ تاکہ اُمت نصرانیہ کسی حد تک اسلام کے لون سے قریب ہو کر اُس کی تمہید بننے اور اُسے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے پس اس طرح جبرئیل ہی پر جبکہ وہ حقیقت محمدیہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے آئے وہ اسی کی شبیہ کا جامہ پہنکر نمایاں ہوئے حقیقت محمدیہ کا اطلاق کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس تقریر کے بعد جمہور کے مسلک اور شیخ نابلسی کے کلام میں کوئی تخالف باقی نہیں رہتا اور ان دونوں دعووں کی توفیق و تطبیق سے ہمارا یہ نظریہ کلام جمہور کے تو خلاف نہیں پڑتا اور کلام شیخ سے واضح طور پر مؤید ہو جاتا ہے۔

حضرت عیسوی کی شان ابنیت کو وضع قرار دو حضور سے انکی مناسبت و مشابہت کی جہات

بہر حال علماء حکماء اور فلاسفہ اور پھر انجیل کی ایک تفسیر شدہ آیت سے جس نظریہ کی تائید ہوتی ہو اور اسی کے ساتھ ان نصوص شرعیہ سے اُس کی تقویت ہوتی ہو جو ابھی عنقریب پیش کی جانیوالی ہیں تو یہ دعویٰ تخیل یا وجدان محض کی حد سے گذر کر ایک شرعی دعویٰ کی حیثیت میں آ جاتا ہے کہ مریم عذراء کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری وہ شبیہ محمدی تھی۔

اِس ثابت شدہ دعوے سے بیّن طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اِس

شبیہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں جبکہ اُس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت صاحب شبیہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت مریم علیہا السلام جنت میں زوجہ بنا کر دی جائیں گی۔ کہ وہ دنیا میں بھی حضور کی شبیہ مبارک کے سامنے بصورت زوجہ ہی کے آچکی تھیں چنانچہ معجم طبرانی اور مسند ابویعلی وغیرہ میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں ارشاد نبوی ہے۔

عن سعد بن جنادة العوفي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله زوجني في الجنة مريم بنت عمران الخ (رواه ابن الكثير تحت قوله تعالى ثيبات وابكارا)	سعد بن جنادۃ عوفی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے حضرت مریم بنت عمران (والدۂ حضرت عیسی علیہ السلام) کو جنت میں میری زوجہ بنایا ہے۔

جبکہ یہ واضح ہوگیا کہ مریم علیہا السلام اُس شبیہ مبارک کے تصرف سے حاملہ ہوئیں اور اُس شبیہ کیلئے بمنزلہ زوجہ کے ہوئیں حتی کہ آخرت میں حقیقی طور پر صاحب شبیہ مبارک ہی کی زوجہ بھی بنیں۔ تو پھر اُس میں اب کیا شبہ رہجاتا ہے کہ یہی شبیہ مبارک حضرت عیسوی کے لئے بمنزلہ باپ کے تھی اور حضرت عیسی اُس کے سامنے مثل اولاد کے تھے۔ پس جبکہ ولادۃ عیسوی میں صورت محمدی کا واسطہ دخل ہوا تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مسیح صورت محمدی کی اولاد تھے۔

اسی بنا پر قرین عقل و صواب تھا کہ حضور کے ظہور نبوی کے بعد بھی حضرت عیسی علیہ السلام کو دنیا میں ظہور کا موقعہ دیا جائے تاکہ اُن کی آمد اسی طرح حضور کے بعد ہو جس طرح ایک بیٹا باپ کی پیدائش کے بعد ہی ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ پس حضرت عیسی علیہ السلام کو اس تمثلی ابنیۃ کے ظہور کے بعد اُن کی عمر کے تقریباً نصف حصہ میں اُنہیں آسمان پر اٹھایا گیا اور قرب قیامت میں اُمت محمدیہ کے

ذیل میں نہیں اُتارا جائیگا تاکہ اُن کی ایک صوری نشأۃ حضور کے بعد بھی نمایاں ہو۔ اور عمر
تیمیری کے لحاظ سے بھی اُن میں ابنیت کی یہ نسبت کھلے طور پر نمایاں ہو جاوے۔ پس عیسیٰ علیہ
السلام کی نشأۃ اُولیٰ میں تمثّل بشری کے وقت تو نفخ کا ظہور مثالی تھا اور ولادۃ عیسوی حقیقی
تھی جو اُس پر مرتب ہوئی لیکن عیسیٰ علیہ السّلام کی اس نشأۃ ثانیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
نفخ تو حقیقی ہے جو پہلے سے پیش آمدہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا دُرود ایک مجازی ولادۃ ہوگا جو
آسمان سے نازل ہونیکی صورت میں نمایاں ہوگا۔ بہر دو صورت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور حضور ہی
کے نفخ کا ثمرہ اور اس کی فرع ثابت ہو جاتا ہے۔ جس سے حضور کی یہ تمثالی اُبوۃ اور عیسیٰ علیہ السّلام
کی یہ تمثلی ابنیت خوب ہی کھل جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس روحانی ابنیت کے علاوہ جو تمام
انبیاء علیہم السّلام کو استفادۂ کمالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منبع کمال ذات سے حاصل ہے
خصوصیت کیساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اس تمثالی ابنیت کا فخر حاصل ہے۔

شانِ خاتمیت (۱۱) اسی خصوصیت ابنیت کا یہ ثمرہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
عام آثار و احوال اور کرامت و کمالات بہت کچھ مشابہ ہیں کمالات محمدی کے۔ چنانچہ اگر جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ السّلام کو کمالات نبوت سے بالآخر ختم نبوت کے انتہائی مرتبہ عظیم کیساتھ خاتم الانبیاء
بنایا گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک نوع کی خاتمیت کے ساتھ خاتم الانبیاء بنی اسرائیل کیا گیا۔
حضور تو بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو کر کل انبیاء کے خاتم قرار پائے اور عیسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل میں پیدا
ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کئے گئے جس سے ختم نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا
ہو گئی کہ الولد سرٌ لابیہ۔

وضع مقبولیت (۲) پھر چونکہ خاتمیت ایک جامع کمالات مرتبہ ہے جس میں اس دائرہ کے تمام کمالات وحقائق مندرج ہوتے ہیں اس لیے خاتم کی مقبولیت اور اُس کے آوردہ پیغام کی اشاعت کا عام ہونا بھی ایک فطری رفتار ہے اس اُصول کے مطابق اگر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کیلئے وعدہ دیا گیا ہے کہ وہ بالآخر سارے عالم میں پھیل کر رہے گی اور اُس کا دین ہر بیت وبر وہر بیت مدر میں داخل ہو کر رہیگا بعز عزیز ہو یا بذل ذلیل تو حضرت خاتم الانبیاء بنی اسرائیل (عیسیٰ علیہ السلام) کے متعلق بھی ایسی ہی خبر دی گئی ہے کہ دنیا کے آخری دور میں خروج دجال سے پہلے اُمت نصرانیہ کا شیوع وغلبہ بھی سارے ہی عالم پر ہوگا کہ فی الحقیقت منصب خاتمیت کا مقتضا ہی حلقۂ اثر کا ہمہ گیر ہو جانا ہے۔

غلبۂ رحمت (۳) پھر مرتبہ خاتمیت کے لئے اخلاق کا سب سے اُونچا مقام درکار تھا اور وہ ملکہ رحمت ہے کہ اُس کے بغیر محبوبیت عام پیدا نہیں ہو سکتی جس پر خاتم کے مشن کی ہمہ گیری موقوف ہے (اور اسی بناء پر حق تعالیٰ نے بھی اپنی کائنات سے تعلق قائم فرمانے کے لئے صفت رحمت ہی کیساتھ عرش پر استواء فرمایا جو کہ ساری کائنات پر محیط ہے) اس لئے اِن دونوں خاتموں کی شان غالب بھی رحمت ہی فرمائی گئی جو من اللہ عالم پر بھیجی گئی ہو۔ حضورؐ کے متعلق ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ — خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ اُنکے ساتھ نرم رہے۔

ٹھیک اسی نہج سے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا — تاکہ ہم اُس عزیز کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنہ دیں اور باعث رحمت بنائیں

پھر صحابہ نبوی کی شان غالب اگر رحمت فرمائی گئی رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحیم ہیں) تو

حواریین عیسوی کی شان بھی یہی رحمت فرمائی گئی کہ

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً — اور ہم نے متبعین عیسٰی کے دلوں میں نرمی اور رحم ڈالا

پھر جیسے صحابۂ نبوی کی شان غالب تواضع اور خاکساری فرمائی گئی اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (مہربان ہو گئے وہ مسلمانوں پر) اسی طرح مسیحی قسیسوں اور رُہبانوں کی شان غالب بھی عدم استکبار اور تواضع ظاہر فرماتے ہوئے کہا گیا۔

وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ — اور اس سبب سے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔

مقام عبدیت (۴) پھر ظاہر ہے کہ رافت و رحمت اور تذلل للہ کا اصلی منشا عبدیت ہے جو بشری کمالات میں سب سے اونچا اور رفیع مقام ہے۔ پس جبکہ ان دونوں خاتموں میں کمال رحمت و لینت کیا گیا تھا تو اس کے یہ معنی تھے کہ انہی دونوں کو کمال عبدیت سے بھی نوازا گیا ہے۔ عبدیت کی نوعیت میں وہ تفاوت بھی جو ان دونوں خاتموں کی خاتمیت میں ہے مگر غلبہ عبدیت دونوں میں اس درجہ پر ہے کہ قرآن کریم نے امتیازی شان کے ساتھ بطور لقب عَبْد کا کلمہ انہی دو پیغمبروں کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے یوں سب ہی اس کے عباد اور عبید ہیں۔ حضورؐ کے بارہ میں ایک موقعہ امتنان و احسان میں ارشاد ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ — وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا

دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے۔

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ — جب خدا کا خاص بندہ خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے۔

ادھر عیسٰی علیہ السلام کو بھی دو ہی جگہ اسی لقب مبارک سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک جگہ انہی کی

زبان سے گہوارہ میں کہلایا گیا۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ۔ میں اللہ کا خاص بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی

دوسری جگہ حق تعالیٰ نے اسی لقب سے انہیں یاد فرمایا۔

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ مسیح ہرگز خدا کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے۔

بہرحال اگر خاتمیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو حضورؐ سے کامل مناسبت دی گئی تھی تو اخلاق خاتمیت اور مقامات خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسوی کو بارگاہ محمدی سے خلقاً و خُلقاً رتبتاً و مقاماً ایسی ہی مناسبت ہے جیسی کہ ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ بیٹوں میں ہونی چاہیئے۔

شانِ معصومیت | پھر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ معصومیت بھی حضورؐ کی شانِ معصومیت سے بہت اشبہ اور اوفق ہے کیونکہ عصمت کی ضرورت ظاہر ہے کہ معاصی ہی سے بچنے کیلئے ہو سکتی ہے اور معاصی کا سبب صرف دو ہی چیزیں ہیں ایک اپنا نفس اور ایک شیطان گویا ایک دشمن اندرونی ہے اور ایک بیرونی ہے جس سے کُلیتہً بچاؤ کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مقامِ عصمت پر فائز کیا جاتا ہے۔ پس نفس کی انتہائی معصومیت تو یہ ہو سکتی ہے کہ نفسیت تو معصیت اس سے کوئی ادنیٰ لغزش و زلت بھی سرزد نہ ہونے پائے اور شیطانی اثرات سے معصومیت کی انتہا یہ ہے کہ اغوا میں آجانا تو درکنار اُس کا کوئی اثر تک بھی نفس میں نہ پہنچنے پائے۔ سو ان دونوں قسم کی پاکیوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انتہائی مرتبہ عطا کیا گیا ہے اس میں حضورؐ سے اشبہ اگر کوئی نبی ہے تو وہ صرف عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ انہی کو حضورؐ سے اس مخصوص اہلیت کی نسبت بھی دی گئی

(۷) چنانچہ دونوں حضرات کے نفسانی تقدس وتنزہ کا عالم تو یہ ہے کہ یوم قیامت میں ہر نبی کی زبان کی کسی نہ کسی لغزش اور زلت کا اظہار ہوگا۔ لیکن یہ دونوں خاتم زلات سے بھی قطعاً مبرا ظاہر ہوں گے۔ یوم محشر میں جبکہ آدم علیہ السلام کا کنبہ محشر کی ہولناکیوں سے پریشان ہو کر شفاعت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کریگا اور ہر نبی اپنی کوئی نہ کوئی زلت ولغزش سامنے لاکر شفاعت سے معذرت کردیگا صرف حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی شفاعتِ کبریٰ کے لئے مستعد ہوں گے کہ آپ کی کوئی زلّت ولغزش ہی نہ ہوگی جو درمیان میں آئے۔ ٹھیک اسی نوع کی شان حضرت خاتم انبیاء بنی اسرائیل (عیسیٰ علیہ السّلام) کی بھی ظاہر ہوگی کہ وہ شفاعتِ کبریٰ سے یہ کہکر انکار نہ کریں گے کہ مجھ سے کوئی لغزش ہوگئی ہے جس سے میں شافع بننے میں خوفزدہ ہوں بلکہ یہ کہکر انکار فرمادیں گے کہ میرے زمانہ غیبت میں میری قوم نے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا کہا تو خدا کے آگے جاتے ہوئے مجھے شرم بھی دامنگیر ہے اور خوف بھی آتا ہے کہ کہیں یہ نہ کہلایا جائے کہ کیا وہ تمہیں ہو جسے ہماری مسندِ الوہیت وجلال پر لا کھڑا کیا گیا اور ہمارا کفو بادر کرادیا گیا تھا؟ یہ سنکر میں تو غرقِ عرق ہوجاؤنگا اور کہیں کا نہ رہونگا۔ نہ زبان اٹھ سکے گی نہ نگاہ؟ اس معذرت کا حاصل بجز اُن کی کوئی لغزش نہیں جیسا کہ انبیاء سابقین نے اپنی اپنی لغزشیں سامنے لاکر معذرت کردی تھی۔ بلکہ قوم کی جاہلانہ روش کا شکوہ ہے کہ اُس نے مجھے شفاعت کے قابل ہی نہ رکھا تو میں کیا شفاعت کروں اور کس منہ سے بارگاہ حق میں ایسی نابکار قوم کے لئے حرف شفاعت زبان پر لاؤں؟ پس عیسیٰ علیہ السلام کی شان معصومیت بھی حضور کی شان سے اشبہ ہی کہ درحقیقت خاتمیت کا منصب جس درجہ میں بھی عطا ہوا اُسی درجہ کی پاکبازی اور پاکی کا بھی ظہور ہوا یعنی نہ وہاں کسی ذاتی زلت کا نشان تھا نہ یہاں ہے۔

(۸) دوسری صورت شیطانی تاثیرات سے مبرا و منزہ رہنے کی تھی سو اس میں بھی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو ذات بابرکات نبوی کیساتھ ایک ممتاز شباہت حاصل ہے کیونکہ برو ئے حدیث نبوی پیدا ہوتے ہی بچہ کو شیطان چھو کے لگا کر اس میں اپنے اثرات پہنچاتا ہے جس سے یہ نومولود پیدا ہوتے ہی چلا پڑتا ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن اس اثر اندازی سے تمام جماعت انبیاء میں سے اگر کسی کی تنزیہ و تقدیس ثابت ہوتی ہے تو انہی دو خاتون کی چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں تو ارشاد نبوی یہ ہے

ما من بنی آدم مولود الا یمسّہ	بنی آدم میں سے کوئی بھی بچہ نہیں کہ شیطان اُسے پیدا ہوتے
الشیطان حین یولد فیستہل صارخا	ہی چھوتا نہ ہو اور اُسی چھونے سے بچہ رو پڑتا ہے
من مسّ الشیطان غیر مریم وابنہا	سوائے حضرت مریم اور ان کے بیٹے (عیسیٰ علیہ
(مشکوٰۃ صـ۱ باب الوسوسہ)	السلام) کے۔

اور اپنے بارہ میں ارشاد یہ ہے

ما منکم من احد الا وقد وکّل	تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس پر ایک ساتھی شیاطین
بہ قرینہ من الجن وقرینہ من	میں سے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو۔ صحابہ نے
الملٰئکۃ قالوا وایاک یارسول	عرض کیا کہ کیا آپ بھی یہ دونوں قسم کے ساتھی مسلط
اللّٰہ قال وایای ولکن اللّٰہ اعاننی	ہیں فرمایا ہاں مجھ پر بھی لیکن اللہ نے میری مدد فرمائی وہ
علیہ فاسلم فلا یامرنی الا بخیر	میرا مطیع ہو گیا یا مسلمان ہو گیا (علی اختلاف القراۃ)
(مشکوٰۃ باب الوسوسہ صـ۱۸)	پس اب وہ بھی مجھے خیر ہی کیطرف توجہ دلاتا ہے۔

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسوی تک شیطان کو اپنے اثرات پہنچانے کی کوئی قدرت نہ تھی۔ اور دوسری حدیث سے ثابت ہوا کہ بارگاہ محمدی تک شیطان اپنا اثر تو کیا پہونچاتا وہ خود اپنا متاثر ہو گیا کہ اُسے حضور کی اطاعت کرتے ہی بن پڑی۔ پس اس حد تک تو ذات محمدی اور ذات عیسوی میں اشتراک و تشابہ ہے کہ شیطان اپنا اثر ان کے نفوس قدسیہ تک نہ پہونچا سکا اور اس حد سے آگے پہونچکر تفضیلات محمدی ثابت ہو جاتی ہے کہ خود شیطان نے عیسوی اثر تو قبول نہ کیا مگر محمدی تاثیرات سے بے تاثیر رہا بھی نہ گیا۔ پس یہ فرق تو درحقیقت ان دونوں خاتموں کے مراتب کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن نفس منصب خاتمیت کے لحاظ سے یہ شیطانی اثرات سے عصمت اور بچاؤ کی مخصوص صورت یکساں اور باہم متشابہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کیلئے ثابت نہیں ہوتی جس سے نوعیت عصمت میں ذات عیسوی ذات محمدی کیساتھ حد درجہ مشابہ نمایاں ہوتی ہے۔

علم و معرفت (۹) پھر عصمت کے بعد علمی کمالات کو لو تو باہم اس درجہ تناسب ہے کہ جو چیز ایک مشکوٰۃ نبوت سے نکلتی ہو اس کا ظہور دوسری مشکوٰۃ سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ یوم محشر میں حق تعالیٰ کی مکالمہ کے وقت اظہار حال اور ادا جوابات میں اس درجہ تناسب و تشابہ ہوگا کہ تقریباً الفاظ بھی ایک ہی ہوں گے۔ چنانچہ قوم کی گمراہی اور ابن اللہ کہتے رہنے کی نسبت جب عیسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ ہوگا اور کہا جائیگا کہ کیا یہ ابن اللہ کہنے کی تعلیم تم ہی نے دی تھی تو جواب میں عرض کریں گے۔

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ	عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ میں تو آپکو منزہ سمجھتا ہوں مجھکو کسی طرح زیبا
اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ	نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں۔

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ	اگر میں نے کہا ہوگا تو آپ کو اس کا علم ہوگا۔ آپ تو
تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ	میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں آپ
مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ	کے علم میں جو کچھ ہے اس کو نہیں جانتا تمام غیبوں
عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ	کے جاننے والے آپ ہیں۔ میں نے تو ان سے اور
لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ	کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جو آپ نے مجھ سے کہنے کو کہا
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ	کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا
وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ	بھی رب ہے۔ میں ان پر مطلع رہا جب تک ان میں رہا۔
فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ	پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا تو آپ ان پر مطلع رہے۔
عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝	اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں اگر
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ	آپ ان کو سزا دیں گے تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر
تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ	آپ ان کو معاف فرما دیں تو آپ زبردست ہیں
الْحَكِیْمُ ۝	حکمت والے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جب اُمت محمدیہ کے گمراہوں کی نسبت حضور سے سوال ہوگا تو بعینہٖ یہی جواب حضور بھی دیں گے چنانچہ حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں

فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ	میں وہی کہوں گا جو عبد صالح یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا قول تھا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس مشکوٰۃ سے وہ کلام نکلا ہے اسی مشکوٰۃ سے یہ کلام بھی ادا ہوا ہے پس فطرت عیسویٰ کو کچھ طبعاً فطرت محمدیہ سے شباہت مخصوص ہوتی ہے جو حضور کی امت

تمثالی نُبوۃ اور عیسیٰ علیہ السلام کی اس تمثلی ابنیت کو خوب واضح کر رہی ہے۔

توضیحِ ہجرت و جواز حریت | (۱۰) یہی وجہ ہے کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں خالص مظہرِ جمال رکھکر کفار مکہ کی سختیوں کے مقابلہ میں ادنیٰ تشدد کی بھی اجازت نہ تھی صبرِ جمیل اور سختیاں جھیلتے رہنے کا حکم تھا کہ عفو و درگذر تبسم اور رحمت و شفقت کا مظہر اتم بنے رہیں۔ تلوار و نیزہ اور تیر و تفنگ تو بجائے خود رہے زبان سے بھی تیز کلمہ بولنے کی اجازت نہ تھی حتیٰ کہ دشمنانِ حق کی حد سے گذر جانے والی چیرہ دستیاں دیکھکر بھی وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر کر دیا جانا تو گوارہ کیا گیا اور ہجرت فرض کر دیگئی مگر اس ابتدائی دور میں مقابلہ یا دفعتاً کی اجازت کسی طرح بھی نہ دی گئی لیکن ہجرت کے ذریعہ مکہ سے مدینہ پہونچا کر اب ایک نہایت ہی طاقتور اعادہ کے ساتھ حضور کو جب پھر مکہ لوٹایا گیا تو جمال کے ساتھ ساتھ مظہرِ جلال و جبروت بنا کر واپس کیا گیا۔ کہ ہاتھ میں تلوار ہے۔ فاتحانہ شوکت قدموں پر ہے اور انہی اہل حجاز کے سامنے جن کی انتہائی ایذا رسانیوں سے چیں ابرو کو ذرا بھی جنبش نہوتی تھی اس شان سے ذات اقدس جلوہ گر ہے کہ بس یا اسلام قبول کرو یا تلوار فیصلہ کرے گی۔ اس ملک حجاز کے لئے جس کے دار الخلافہ نے اللہ کے نبی کو بے گھر اور بے یار و مددگار کر کے نکالا تھا قتل و اسلام کے درمیان جزیہ کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ یا مُسلم ہو یا خدا کی زمین چھوڑو۔ جزیہ اور ذمیت صرف غیر حجازیوں کے لئے ہے جنھوں نے اخراج رسول کی ظالمانہ معصیت کا ارتکاب نہیں کیا پس ابتدائی زندگی اگر جمال محض تھی تو انتہائی زندگی کمالِ محض ثابت ہوئی اور جمال و جلال و نوں جمع کر دیئے گئے تاکہ دُنیا دونوں شانوں کا مشاہدہ علی وجہ الاتم کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت

خاتم انبیاء بنی اسرائیل کو مبعوث کرنے کے بعد انکا وہ ابتدائی دور جو رفع سماوی سے پہلے کا ہے انتہائی جمالی زندگی اور اس تعلیم کے ساتھ نمایاں ہے کہ کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی سامنے کردو۔ حلم و عفو ضروری ہے، صفح جمیل لازمی ہے۔ تشدد کا نشان نہیں۔ انتقام لینا جائز نہیں۔ یہود انتہائی چیرہ دستیوں پر اتر کر پھانسی دینے کا سامان کرتے ہیں اور خدا کے اس جلیل القدر پیغمبر کو بے یار و مددگار کر کے محبس میں بند کر دیتے ہیں تب بھی ہاتھ پیر ہلانے کی اجازت نہیں بلکہ صبر و تحمل کا ارشاد ہے۔ ہاں مگر خود حکمت و غیرتِ الٰہیہ آگے بڑھتی ہے اور اپنے محبوب پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرائی جاتی ہے جس سے دشمنانِ دین خائب و خاسر ہو جاتے ہیں ہاں مگر ہجرت کے بعد آسمان سے پھر ایک ایسے طاقتور اعادہ کیساتھ لوٹایا جاتا ہے کہ وہی جمالی نبی خالص جلال و جبروت کا مجسمہ بنکر آتا ہے اور ساری دنیا کے مقابلے میں جس کو دجال کا دجل و فریب تباہ کر چکا ہوگا ایک ایسی عظیم الشان جنگ قائم کرتا ہے جس میں یا تلوار و قتل ہے یا اسلام اور قبول حق جزیہ کا درمیان میں کوئی واسطہ نہیں۔ یا اسلام قبول کرو یا زمین کو اپنے نجس وجود سے پاک کرو۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی شان تو وہ تھی جو سید آدم کے حجاز کی ابتدائی شان تھی اور آخری شان وہ تھی جو ان کی آخری شان تھی۔ پس شان جمال اور صفتِ جلال دونوں کا مظاہرہ اپنے اپنے دورہ میں نہایت اکمل اور اشبہ طریق پر کرایا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ادھر اگر حضورؐ کے لئے ہجرت فرض ہوئی تو ادھر حضرت مسیح کیلئے بھی ہوئی یہاں اگر بنی اسمٰعیل نے جنکا دنیا پر کوئی اثر نہ تھا اخراج رسول کا جرم کیا تو صرف انہی کو دنہ کہ جہان کو، جزیہ کی نعمت سے محروم کر کے حجاز کو یا اسلام سے بھر دیا گیا یا مشرکوں سے پاک کر دیا گیا تو وہاں چونکہ بنی اسرائیل نے جنکو عالم پر

فضیلت دی گئی تھی جن کا فعل گویا جہان کا فعل تھا جب عیسیٰ علیہ السّلام کو وطنِ دنیا ہی سے ترک پر مجبور کیا تو سارے ہی مشرک جہان کو عیسیٰ علیہ السّلام جزیہ کی رعایت سے محروم کر دیا گویا اسلام سے بھر دیں گے یا غیر مسلموں سے دنیا کو پاک کردیں گے۔ غرض ہجرت سے پہلے کی زندگی کا جو نمونہ ریگزارِ عرب میں نظر آتا ہے وہی بعینہ سبزہ زارِ شام میں بھی نمایاں ہے اور جس طرح ہجرت کے بعد اعادہ و واپسی اعلیٰ شوکت اور فاتحانہ قدرت کے ساتھ حضورؐ کے لئے مکہ کی طرف ہوتی ہے کہ وہیں سے نکالنے کی فکر میں حجازی قوم لگی ہوئی تھی اسی طرح ہجرت سماوی کے بعد حضرت مسیح علیہ السّلام کی واپسی اعلیٰ ترین شوکت کے ساتھ زمین کی طرف ہوتی ہے کہ زمین ہی سے نابود کرنے کی فکر میں یہود لگے ہوئے تھے۔ اور جس طرح حضورؐ نے اپنی قوم بنی اسمٰعیل کے حق میں جزیہ قبول نہیں فرمایا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کے حق میں بھی جزیہ قبول نہ کریں گے کہ وہی قوم کفر و عناد میں اسوقت زمین پر پھیلی ہوئی ہوگی۔ غرض زندگی کا دور اور طریق اجراءِ احکام میں حضرت مسیح علیہ السلام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی ہی مناسبت و مشابہت ہے جیسا کہ اپنے کسی سُلالہ بدن اور جگر گوشہ کیساتھ ہو سکتی ہے۔

حضرت مسیح کی ولیعہدی (۱۱) پھر جس طرح کہ بیٹا ہی اپنے باپ کا حقیقی ولی عہد اور قائم مقام بن سکتا ہے کہ باپ کے مہمات امور میں اُس کی جانشینی کرے اور اُس کی طرف آفات بڑھیں تو سینہ سپر ہو کر مدافعت کرے دوسرے کو یہ منصب نہیں ملتا اسی طرح جبکہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں خاتم الدجالین خروج کر کے فساد برپا کرے گا تو آپ کے ابن تمثالی اور بوجہ ابنیۃ

قائم مقام اور ولیعہد ہونیکی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو آسمان سے اُتارا جائیگا کہ اُمت محمدیہ کو فتنۂ دجّال سے پاک کریں کہ خصوصاً وصف خاتمیت اور عموماً سلسلے ہی اودار زندگی میں اگر کوئی ذات حضوؐر سے مناسبت کاملہ بلکہ مشابہت تامّہ رکھتی ہے تو وہ صرف عیسیٰ علیہ السّلام ہی کی ذات مقدس ہے پس وہ باطل اور دجل و فساد کا تام تار و پُود بکھیر کر دین کی ایسی مکمل تجدید کریں گے کہ اس سے پہلے ایسی کبھی نہوئی ہوگی پس جس طرح عیسیٰ علیہ السلام تورات کے آخری مجدّد تھے اسی طرح وہ قرآن کریم کے بھی آخری عارف اور خاتم مجددین اسلام ہوں گے گویا اُس تمثل اور شبہ محمدی کی برکت سے حضوؐر کی شان خاتمیت کا مکمل اثر یہ ہوگا کہ انہیں دونوں اُمتوں (بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل) میں اپنے اپنے دائرہ کی خاتمیت کا منصب تفویض ہوگا اور وہ حضوؐر سے پہلے اگر ایک خاص نسل کی نبوّت کے خاتم ہوں گے تو حضوؐر کے عہد نبوّت میں داخل ہو کر وہ سارے عالم کی عام مجددی کے خاتم قرار پائیں گے اور یہی دوہری خاتمیت کی طاقت ہوگی جس سے عیسیٰ علیہ السّلام دجّال اعظم کی ساری تلبیسات اور مکر و فریب کا جال بہت جلد توڑ کر اُس کے سارے کروفر کو خاک میں ملا دیں گے۔

اور پھر جس طرح کہ باپ اپنے ولیعہد کو کسی عظیم الشان مہم سر کر لینے کے بعد انتہائی پیار و محبّت سے اپنی آغوش شفقت میں لیلے اور کبھی جان بھی اپنے سے جُدا کرنا پسند نکرے بالکل اسی طرح جب عیسیٰ علیہ السّلام حضوؐر کی قائم مقامی میں آپکے دین کو سارے عالم میں شائع کر کے اپنی روحانیت سے غیر اسلام کا کوئی اثر عالم میں نہ چھوڑیں گے، اور قتل دجّال کی اصل مہم سے فارغ ہو کر اپنی زندگی کا ناسوتی دور ختم کر کے بالآخر جام موت نوش فرمائیں گے تو حسب فرمان

نبوی اُن کی قبر مبارک گنبد خضرا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو ہوگی جس کی جگہ اُسی وقت سے ابتک چھوٹی ہوئی موجود ہے اور خاص اسی لئے چھوڑکر باقی رکھی گئی ہے گویا حضور نے اپنے تمثالی ابن اور اپنی شبیہ خاص کو جبکہ اُس کے ذریعہ مفوضہ مقصد پُورا ہوگیا اپنی آغوش میں لیلیا اور اب قیامت تک اور قیامت سے تا اختتام حشر اور حشر سے لیکر ابد الدہر تک دونوں میں اپنے سے جُدا نفرمادیں گے۔

مرتبۂ تکمیل عبادت

(۳۲) پھر جس طرح حضورؐ کی ذاتِ اقدس دین کی مبلغ بنکر آئی جس کا واحد مقصد اشاعت و ترویج دین تھا اور یہ ظاہر ہے کہ تکمیل اشاعت کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ تکمیل اشاعت کیفیت اور باطنی قوت کے لحاظ سے ہو اگرچہ مسلمانوں کا عدد کم ہی ہو دوسرے یہ کہ اشاعت کی تکمیل کمیت اور عدد و شمار کے لحاظ سے ہو یعنی عالم میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔

سو ظاہر ہے کہ حضورؐ نے اپنے مبارک دور میں دین کی جس اشاعت کو حدِ کمال پر پہنچایا وہ کیفی اشاعت تھی یعنی زمانہ نبوی میں تبلیغ پاک سے جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے گو انکا عدد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک پہونچا جو ساری دنیا کے مقابلہ میں کچھ بہت زیادہ نہ تھا۔ لیکن کیفیت اور باطنی قوت کے اعتبار سے صحابہ کی یہ جماعت وہ زبردست جماعت ہے کہ سارا عالم ملکر بھی اُن کے دین کی ٹکر نہیں لیسکتا انہی کی معنوی برکات آج تک تقسیم ہورہی ہیں اُنہی میں سے دس کو دس سو کی برابر قرار دیا گیا تھا۔ پس حضورؐ نے اُن کے قلوب میں دینی کیف ایسا رچا دیا تھا کہ اُن میں سے ایک ایک فرد ایک ایک اُمت کی برابر ہوگیا تھا۔ اور اُن کی کیفیت ساری دُنیا کی کمیتوں پر چنانچہ حدیث ابی سعید خُدری میں ارشاد نبوی ہے۔

لا تسبوا أصحابي فلو أن أحدكم أنفق مثل أحدٍ ذهبًا ما بلغ مدّ أحدهم ولا نصيفه متفق عليه (مشکوٰۃ باب مناقب صحابہ)

تم میرے صحابہ کو برا نہ کہو اس لئے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر دے تو وہ اُن کے ایک مد یا اُس کے نصف کی برابر بھی نہ ہوگا۔

اس لئے یوں کہنا چاہیئے کہ حضورؐ نے دین و عبادت کی تکمیل بلحاظ کیفیت تو اپنے زمانہ میں خود فرما دی لیکن دوسری تکمیل کمیت کے لحاظ سے باقی تھی جس کی تکمیلی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ سارا عالم دین اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے اور کوئی گھر کچا ہو یا پکا خالی نہ رہے کہ اُس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے سو وہ تکمیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد ہوئی جسے وہ نازل ہو کر انجام دیں گے جیسا کہ احادیث میں صراحت کے ساتھ اُس کی خبر دی گئی ہے چنانچہ حضرت مقداد کی روایت میں ارشاد نبوی ہے کہ

لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام بعز عزيز أو ذل ذليل إما يعزهم الله فيجعلهم من أهلها أو يذلهم فيدينون لها قلت فيكون الدين كله لله۔ (رواہ احمد مشکوٰۃ باب الکبائر)

روئے زمین پر کوئی خیمہ اور کوئی گھر ایسا نہ رہیگا جس میں اللہ پاک کلمۂ اسلام نہ پہنچا دے خواہ آبرو دار کی عزت و آبرو کے ساتھ خواہ کسی ذلیل کی توہین و تذلیل کے ساتھ یعنی یا تو اللہ پاک انہیں عزت دے گا اور ان کو حلقہ بگوش اسلام بنا دے گا یا ذلیل و خوار کر دیگا تو مجبوراً اسلام کی اطاعت کریں گے میں نے کہا۔ پھر تو تمام دین اللہ ہی کے لئے ہو جائیگا۔

پس تکمیل دین کا جو منصب حضورؐ کے لئے ثابت ہوا بعینہٖ وہی منصب حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے بھی ثابت ہوا فرق اگر ہے تو وہی حقیقت و صورت کا ہے کہ حضورؐ چونکہ ایک حقیقت پاک ہیں اس لئے تکمیل بھی آپ سے حقیقی ہی کرائی گئی جس میں کمیت کا زیادہ دخل

نہیں اور مسیح علیہ السلام چونکہ ایک پاک صورت ہیں اس لئے تکمیل بھی اُن سے صوری اور حسّی ہی واقع ہوگی جس میں قرن اول کی سی حقیقت نہ ہوگی گو نوعیت وہی رہیگی جو قرن اول کی تھی کہ اول با آخر نسبتے دارد مگر جیسا کہ کمیت کے لئے اصل اور بنیاد کیف ہی ہوتا ہے کمیت محض کیفیت کا ظہور ہوتا ہے اس لئے اس تکمیل عیسوی کی اصل فیوض محمدی ہی رہیں گے۔

مشابہت علامت قیامت (۱۳) اور پھر جس طرح کہ حضور نے سلسلۂ انبیاء میں اپنے آپ کو قیامت کی علامت شمار فرمایا ہے

بعثت انا والساعۃ کھاتین ۔ میں ان دو انگلیوں کی طرح قیامت سے بالکل متصل بھیجا گیا ہوں

بعینہٖ اسی طرح نبیوں میں عیسیٰ علیہ السلام کو بھی علامت قیامت فرمایا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا اور بیشک وہ عیسیٰ قیامت کی ایک نشانی ہیں۔

کہ حقیقتاً یہ علامت ہونیکی شان حضورؐ ہی کا ورثہ ہے جو ابن تمثالی ہونے کے سبب حضرت عیسیٰ ہی کو عنایت ہوئی۔ اور وہ بطور علامات کبریٰ قرب قیامت میں نزول فرمادیں گے۔

دربعد بشارت (۱۴) اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انتہائی تعلق اور شغف کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد و نزول کی خبریں دے رہے ہیں اُن کی تکمیل و تجدید دین بیان فرماتے ہوئے نام لیکر ان کی بشارت اس طرح سنا رہے ہیں۔

کَیْفَ تَھْلِكُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وہ اُمت کیسے ہلاک ہوسکتی ہے جس کے شروع میں میں

وَسْطُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُھَا مشکوٰۃ شریف ہوں بیچ میں مہدی اور آخر میں مسیح۔

ٹھیک اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کا اہم مقصد ہی یہ ظاہر فرما رہے ہیں

کریں حضور کی بشارت دینے اور دنیا کو ان کی تشریف آوری سے مطلع کرنے آیا ہوں چنانچہ
وہ بھی نام لیکر ہی بشارت دے رہے ہیں جیسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي	اور جبکہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا اے بنی
إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم	اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں
مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ	کہ مجھ سے پہلے جو توراۃ ہے میں اُس کی تصدیق
التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ	کرنیوالا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنیوالے ہیں جن کا
يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ	نام احمد ہوگا میں اُن کی بشارت دینے والا ہوں

بہرحال چونکہ حضرت عیسوی کے وجود میں آنے کا باعث صورت محمدی کا تمثل ہوا ہے
اور آپ حضور کے ابن تمثالی ثابت ہوتے ہیں اس لئے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّاَبِیْہِ کے اصول پر ذات
عیسوی کو حضور کی ذات اقدس سے وہ خاص خصوصیات پیدا ہوگئیں جو قدرتی طور پر
اور انبیاء علیہم السلام کو نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ منصب خاتمیت طور مقبولیت مقام
عبدیت غلبۂ رحمت شان معصومیت و قمع علم و معرفت نوعیت ہجرت و جہاد حریت مرتبہ
تکمیل عبادت درجۂ بشارت مکالمۂ قیامت وغیرہ جیسے اہم و اعظم امور میں اگر حضور کی ذات
اقدس سے کسی کو کمال اشتراک و تناسب ثابت ہوتا ہو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مقدس کو
( ) شاید اسی بناء پر جبکہ حضور نے نجات ابدی کو اپنی نبوت ماننے پر معلق فرمایا ہے تو باوجودیکہ
اور تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت ماننا بھی جزو ایمان تھا لیکن خصوصیت سے اپنی ساتھ صرف عیسیٰ
علیہ السلام اور آن پر ایمان لانے کو متوازی طریق پر ذکر فرمایا ہے۔

عن عبادۃ بن الصامت قال قال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
من شھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا
عبدہ ورسولہ وان عیسی عبداللہ ورسولہ
وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ والجنۃ حق
والنار حق ادخلہ اللہ الجنۃ علی ما کان علیہ
من العمل متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب الایمان)

عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا کہ جو اس بات کی شہادت دے (ایمان رکھے) کہ
خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلعم اُسکے بندے اور رسول
ہیں اور عیسیٰ بھی اُسکے بندے اور رسول اور ایسے کلمہ کا مصداق
ہیں جسکو اسنے پاک مریم کی طرف ڈالا تھا اور اللہ کی بادی ہوئی
روح ہیں اور جنت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق تو اُسکو اللہ پاک ضرور
جنت میں داخل کر دیں گے اُس کے عمل کیسے ہی ہوں۔

خلاصہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ شبیہ محمدی کی اولاد تھے اس لئے اُن کیساتھ یہ خصوصیات قدرتی طور پر قائم ہوئیں اور جبکہ ذات عیسوی کی یہ تقویم صورت محمدی کا اثر تھی تو اُن سے صورت و نمود ہی کے کمالات کا ظہور بھی زیادہ ہونا چاہیے تھا۔

موجودہ تمدنی کمالات بھی فیوض محمدی ہی کا اثر ہیں

چنانچہ احیاء اجسام جیسے مردوں کو زندہ کرنا۔ تخییر صور جیسے پرندوں کی ہیئتیں بنا کر اُڑا دینا۔ تزئین اشکال جیسے مادرزاد اندھوں کو سوانکھا کر دینا۔ تزئین ہیئات جیسے مبروصوں کو صحیح البشرہ کر دینا۔ تجمیل ابدان جیسے لاعلاج مریضوں کو بھلا چنگا کر دینا۔ تشکیل اخبار جیسے لوگوں کا گھروں میں کا رکھا ہوا بتلا دینا۔ تصویر غیبیات جیسے آسمان کے پردوں میں سے مائدہ نمایاں کر دینا وہ تصویری کمالات ہیں جن میں جسم نمائی۔ صورت آرائی۔ پیکر سازی اور نمود ظواہر ہی معجزہ کی روح نظر آرہی ہے گویا اعجازی دائرہ صرف مادہ جسم اور عالم رنگ و بو ہی تک محدود نکلتا ہے کہ اُن کی ایجاد میں مؤثر ہی تصویری طاقت ہوئی ہے اسی لئے اِن معجزات کی حسن و خوبی صورت ہی پر ختم

ہوجاتی ہے اور صورت کا تعلق ظاہر ہے کہ صرف اجسام ہی سے ہوسکتا ہے اس لئے اعجاز عیسوی کا تعلق بھی صورت وجسم ہی سے ماننا پڑیگا۔

اور پھر جبکہ پیغمبر کی اسی تصویری ذہنیت سے قوم کی تربیت ہوئی تو وہی ذہنیت اُن میں بھی منتقل ہوئی۔ تصویر سازی۔ ہیئت نمائی۔ ایجادِ اشکال۔ تزئین ہیئات۔ اور صوری احیاء وغیرہ کے جذبات قدرتی طور پر اُمت مسیحیہ میں نمایاں ہوئے۔ ہر چیز میں صورت پسندی۔ نمائش دوستی۔ ظاہر داری اور بناوٹ اس درجہ غالب آئی کہ گویا حقیقت شناسی معرفت بواطن۔ فہم مخفیات اور ادراک مغیبات کا کوئی شمہ بھی اس قوم کے حصہ میں نہیں آسکا ہے وہ اگر اجسام میں حضرت عیسوی کی مانند الٰہی روح نہیں پھونک سکتے تو کم از کم اسٹیم۔ پیٹرول گیس اور برق کی ہی ارواح سے بھاری بھاری اجسام کو حرکت میں لاتے رہتے ہیں۔ وہ اگر اعجازِ عیسوی کی طرح مٹی سے ہیئت طیر بنا کر نہیں دوڑا سکتے تو کم از کم ٹین ہی کے پرندوں کی ہیئتیں بنا کر اسپرنگ سے اُنہیں اُچھلتا کودتا کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال ذوق اور رنگ وہی ہے گو اسکی اصلی رُوح یعنی معرفت عیسوی نہیں ہے۔ الحاصل جبکہ اس قوم کی صورت آرائی حضرت عیسوی کی تصویری ذہنیت کا ثمرہ ہے اور اُن کی صوری و تمثالی تکمیل شبیہ محمدی کا اثر ہے جو بشر عیسوی کے رنگ میں آئی۔ تو ہمیں اب یہ کہنے کی بھی جرأت ہوتی ہے۔ کہ مسیحی اقوام میں ان تصویری اور ایجادی کمالات کا مادے تو اُس صورت محمدی کا طفیل ہیں جس کے واسطے سے اُن کے مربی اعظم عیسیٰ علیہ السّلام کا ظہور ہوا گویا خود اُس قوم کی قومیت کی بنیاد پڑی اور پھر ان ایجادی مادوں کے استعمال اور بروئے کار لانے کی اہلیت اُنہیں اُس حقیقت محمدی کا طفیل ہے جو قرآنی علوم کے واسطے سے

عالم میں آشکارا ہوئی اور جس کی بدولت دنیا قرآنی علوم و معارف سے آشنا ہوئی اور اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی اس مخصوص ذہنیت کی تقویم جس سے موجودہ ترقیات و اختراعات کا تعلق ہے ہر پہلو سے بارگاہ محمدی ہی کا ثمرہ ہے فرق یہ ہے کہ اس تصویری ذہنیت کا وجود تو حضور کے تمثل صورت اور جمال سے ہوا اور اس کا ظہور اور جزئیاتی پھیلاؤ حقیقت محمدیہ کے علمی کمالات (یعنی علوم قرآن) سے ہوا۔ اس لئے اس قوم کی ابتدا و انتہا ربالآخر حضور ہی کی ذات کمالات کا پرتو ثابت ہو جاتی ہے۔

امت مسلمہ اور امت مسیحیہ کے روحانی و مادی کارناموں کا تقابل

اور جب یہ ہے تو پھر اب دنیا کی اقوام میں سے اس قوم کے سوا اور کونسی قوم ہوتی جو ان تصویری کمالات اور صوری و مادی ایجادات کی مالک بنتی؟ ضرور تھا کہ مادی دنیا کے یہ عجیب و غریب کرشمے اور سائنس کے یہ محیر العقول کارنامے اسی قوم کے ہاتھ پر ظاہر ہوں اور وہ ان اختراعات میں تمام اقوام سے گوئے سبقت لیجائے۔ کہ صورت محمدی کے اثرات سے ایسے نایاب عجائبات کا نمایاں ہونا کچھ زیادہ عجیب نہ تھا جس طرح کہ امت مسلمہ کے سوا کونسی دوسری قوم ہو سکتی تھی کہ علمی موشگافیوں اور لطائف و معانی کے سربستہ راز اس کے ذریعہ کھلتے، ضرور تھا کہ روحانیات کے یہ حیرتناک دقیقے اور اسرار غیبیہ کے یہ نادر روزگار لطیفے جو قرآن کی رہنمائی سے شائع ہوئے اسی امت اجابت کے قلب و زبان پر جاری ہوں اور یہ قوم دنیا کے تمام روحانیوں سے بازی لیجائے کہ حقیقت محمدی کی برکات سے ایسے پاکیزہ علوم کا پردۂ دنیا پر نمایاں ہونا کوئی بڑی چیز نہ تھا۔ غرض ایک امت کی تقویم صورت محمدی سے ہوئی ہے تو ایک کی حقیقت محمدی سے اس لئے امت مسلمہ مدارج روحانیت کیطرف بڑھی تو امت نصرانیہ مدارج مادیت کیطرف

ایک کی علمی دنیا اگر مادیت کی شعائر کا گہوارہ بنی تو ایک کی عملی سرگرمی روحانی شعائر کا مجموعہ ثابت ہوئی۔ حقیقت پسندوں کی بستیوں کی طرف بڑھو تو دور ہی سے مساجد کے مینارے خانقاہوں کے برج اور مقبروں کے گنبد انہیں روشناس کرائیں گے جو حقیقتاً شعائر روحانیت ہیں لیکن صورت پسندوں کی متمدن آبادیوں کی طرف چلو تو۔ ملوں کی چمنیاں گھنٹہ گھروں کے منارے وائرلیس کے کھمبے۔ ریڈیو اور برقی سلسلہ کے ستون۔ ہسپتالوں کے گنبد سینما کی سر بفلک عمارتیں میوزیم اور عجائب خانوں کے بلند برو کار۔ ممتاز شخصیتوں کے سنگین بت اُن شہروں کا تعارف کرائیں گے جو درحقیقت شعائر مادیت یا صرف نفسانی تعیش اور رہائشی تمتع ہی کے آثار و علائم ہو سکتے ہیں۔ اگر وہاں مشاہدہ حقیقت کرنے کے لئے خانقاہوں میں ہزارہا طالب و مرید جمع ہوتے ہیں تو یہاں مشاہدہ صورو تماثیل کرنے کے لئے سینما ہال میں ہزارہا تماشائی سیٹیں پر کرتے ہیں۔ اگر پہلے مشاہدہ سے ذوق تدین بڑھتا ہے تو دوسرے مشاہدہ سے شوق تمدن ترقی پذیر ہوتا ہے وہاں کشف معانی کی جدوجہد ہے یہاں کشف صور کی۔ ایک قوم کی روحانی سیر اور اُس کی تیز رفتاری نے عرش کی پیمائش کر ڈالی۔ اور ایک کی مادی سیر اور اس کے تیز رفتار وسائل نے فرش کو ناپ ڈالا۔ ایک نے مادی وائرلیس سے ارض کی معلومات حاصل کیں اور ایک نے روحانی لاسلکی سے ملکوت کی آوازیں سنیں۔ وہ اوپر چڑھتے گئے یہ نیچے دھنستے گئے۔ غرض ایک قوم آرائش ظواہر کی طرف بڑھ گئی اور ایک تہذیب بواطن کی طرف۔ وہ اگر کمالات نفس و روح کی موجد ٹھہری تو یہ اختراعات مادیہ کی موجد ہوئی۔ اُس کے انکشافات نے اگر روح کی راحت کے سامان فراہم کئے تو اُس کے اختراعات نے جسم کے آرام کے ڈھنگ نکالے۔ اُس نے تصنیف واشاعت

اور مدارس جامعہ کے ذریعہ علوم قلب سے دنیا کو آشنا کیا تو اُس نے طباعت و دعایت اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ فنون قالب یعنی صنعت و حرفت اور فنون معاش سے دنیا کو آگاہ کیا اور دونوں نے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق قرآن کے اُن علمی اُصول سے جنہیں حقیقت نمائی اور صورت آرائی دونوں کی کامل صلاحیت تھی اپنی اپنی راہ لی اُمتِ مسلمہ نے حقائق کی راہ لی تو عمل کی تمام وہ صورتیں جو قرآن نے اُس کے سامنے واشگاف کیں اس اُمت کے حق میں حقیقت شناسی اور حق رسی کا ذریعہ بن گئیں اور اُمتِ نصرانیہ نے جو بذاتہ صور و اشکال پر مائل تھی اُنہی قرآنی علوم سے صورت سازی کی راہ اختیار کی۔ تو عمل کی جو راہ بھی اس کتاب سے قائم ہوئی اُنہوں نے اپنی طبیعت کی رہنمائی سے اُسے صورتوں اور مادیات ہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا اور اُن کیلئے اُن علمی اُصول سے جو راستہ بھی نکلا وہ عالم رنگ و بو ہی کیطرف نکلا۔ غرض یہ کھل گیا کہ ان دونوں اُمتوں کے نظام اور کاروبار میں وہی نسبت ہے جو جسم و روح اور صورت و حقیقت میں ہوتی ہے اور اس لئے ہے کہ اُن کے مقتدایان اعظم میں بھی باہم وہی صورت و حقیقت کی نسبت قائم ہے۔ اور اسی لئے ان دونوں اقوام کے نظاموں میں باوجود کامل تقابل کے کامل تشابہ اور تطابق بھی پایا جاتا ہے جیسا کہ متعدد جزئیات اور مثالوں سے واضح کیا جا چکا ہے۔

اس مقام پر پہنچکر ایک عقدہ اور حل ہوا۔ وہ یہ کہ سب جانتے ہیں کہ حقیقت و صورت میں سے حقیقت تو مقصود بالذات ہوتی ہے اور صورت اُسکے تعارف اور پہچنوانے کا محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔

مسلم اور مسیحی نظاموں میں تطابق و تشابہ اور اس کا راز

اگر حقیقت کو پہچان سکنے کی کوئی صورت بلا صورت کے ممکن ہوتی تو پھر کہ صورت سے روشناس کرایا جاتا یہی وجہ ہے کہ گو صورت و حقیقت میں

بلحاظ ماہیت مشرق و مغرب کا فرق ہے کہ حقیقت ایک غیبی لطیفہ ہے اور صورت ایک شہودی کثیفہ مگر پھر بھی ساخت اور وضع کے لحاظ سے ان میں باہم یکرنگی اور یک وضعی ہوتی ہے ورنہ ایک دوسری کیلئے ہرگز وجہ تعارف نہ بن سکتی حتی کہ اگر حقیقت کو صورت سے الگ کر کے کوئی آنکھ دیکھنے لگے تو اس کی شکل و شمائل بعینہ ویسی ہی نظر آئے گی جیسی اُس کی صورت کی ہوتی۔ اِسی اُصول کی بنا پر ان دونوں اُمتوں (مسلمہ مسیحیہ) کے کارناموں میں صورت و حقیقت کی نسبت قائم ہوئی اور اسی لئے دونوں کے نظاموں میں ہمرنگی اور مطابقت بھی تدریجی طور پر نمایاں ہوئی تو ضرور تھا کہ نصرانیوں کا تصویری نظام اسلام کے حقیقی نظام کیلئے اِسی طرح وجہ تعارف ہو جس طرح صورت اپنی حقیقت کے لئے باعث تعارف و پہچان ہوتی ہے۔ یعنی جسے اسلامی تشریع کے دقیق حقائق پہچاننے ہوں وہ نصرانی تمدن کی صور و اشکال کو آنکھوں کے سامنے لے آئے تو ان حقائق کو جلد پہچان سکیگا گویا یہ دونوں کا مادی اور روحانی نظام ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں جو ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہیں اور اِس لئے ہیں کہ ایک ہی قرآنی اُصول نے دونوں پروگراموں کی تشکیل کی ہے اور ایک ہی ذاتِ اقدس نبوی کے درخشاں آثار نے دونوں قومیتوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ ایک کی حقیقت محمدی سے اور ایک کی شبیہ محمدی سے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ وہی فطری اُصول جنہیں قرآن کی روشنی نے واکر پیش کیا جب اس تصویری قوم کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے تو اُنہوں نے مادی تمدن کی بنیاد ڈالدی اور وہی اُصول جب مسلمانوں کی حقیقت پرست قوم کے قلب و لسان پر جاری ہوئے تو اُنہوں نے ایک مکمل تشریعی نظام کی اساس قائم کردی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اُصولِ الٰہیہ جب اللہ کے

کلام میں علمی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں تو اُنکا نام تشریع ہو جاتا ہے اور جب یہی اُصول
اللہ کے کلام میں فعل کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں تو انکا نام تکوین ہو جاتا ہے مگر تشریع و تکوین
ایک ہی شے کے دو رُخ ہوتے ہیں اسی لئے ایک کی مثال دوسری میں ملتی ہے اور تشریع
کے علمی حقائق کو واضح کرنے کی اس سے بہتر صورت نہیں سمجھی جاتی کہ تکوین کی حسی مثالوں سے
انہیں سمجھایا جائے۔ چنانچہ یہی معنی کلام الٰہی کے فطری ہونے کے بھی ہیں کہ وہ اللہ کے فطری
کاموں کے نمونوں پر منطبق ہونے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہو اور اس طرح تکوین الٰہی تشریع
ربانی کے سمجھانے اور دلنشین کرنیکا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ پس تشریع و تکوین میں ایک ہی
اُصول کا جلوہ ہوتا ہے مگر ایک جگہ علمی رنگ میں اور ایک جگہ حسی رنگ میں اسی طرح جبکہ اُمّت
اسلامیہ کے حقیقی پروگرام اور اُمت مسیحیہ کے تصویری نظام میں ایک ہی قرآنی اُصول کی جلوہ گری ہے
تو ان دونوں پروگراموں کو ایک دوسرے پر منطبق بھی ہونا چاہئے اور ساتھ ہی تصویری نظام
کو تحقیقی نظام کے لئے ذریعہ تعارف بھی ہونا چاہئے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قرآن کی تدریجی
روشنی میں اُمّت مسیحیہ کو ان مادی لائنوں پر چلایا جانا درحقیقت اسلام ہی کی جامع ترین حقائق
کے اثبات و تعارف کے لئے مقدر کیا گیا تھا۔ اگر اسلامی حقائق نہ ہوتیں تو اُن تصویری نمونوں۔
کی بھی حاجت نہ پڑتی اور زمانہ کو ہرگز اُن سے روشناس کرائے جانیکی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

راز اس کا یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہونے کی وجہ سے انتہائی جامعیت اور ایک نہایت
ہی گہرے رنگ فطرت کا مالک بنایا گیا ہے جس قدر تفصیل کے ساتھ اُس نے اسرارِ غیب، علمی حقائق
اور دقائق معرفت کا پتہ دیا پھر جس قدر حقائق نفس اور مقامات رُوح کا نشان بتلایا ہے دنیا کی کسی

مذہب نے اُن تفصیلات کیطرف رہنمائی نہیں کی۔ اُس کی یہ نادر اور عجائب روزگار تحقیقات اعلیٰ درجے کی روحانی دقائق کی یہ تفصیلات دنیا کیلئے بالکل نئی تھیں ان اچھوتی اور بہت ہی بالاتر حقائق کے پیش نظر بعید نہ تھا بلکہ عادتاً ضروری تھا کہ دنیا کی نارسا عقلیں اور پست ذہنیتیں جو عموماً محسوسات کی خوگر اور مشاہدات کی دلدادہ ہوتی ہیں ان غیر محسوس حقائق کا تصور بھی نہ کر سکتیں اور اس لئے تصدیق میں پس و پیش ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اسلام باوجود آخری پیغام اور مدار نجات ہونیکے ایک نامکمل مذہب سمجھا جاتا اس لئے ضرورت تھی کہ مذہب اسلام غیبی سلسلوں کی جسقدر تحقیقیں پیش کرے عالم محسوسات میں اتنی ہی اُنکی مشابہ نظیریں بھی پیدا کیجائیں وہ جس قدر روح کے لطیف انکشافات کا پردہ فاش کرے اُسی قدر مادہ میں اُن کے مشابہ صورتیں بھی نمایاں ہوں گویا ہر باطن کے لئے ظاہر میں ایک مثال ہاتھ لگ جائے۔ تاکہ یہ محدود عقلیں اور کند ذہنیتیں محسوس کو دیکھکر معقول کو سمجھ سکیں اور مشاہدات کے ذریعہ مغیبات کا دل سے یقین کر سکیں یہانتک کہ کسی منکر اور معاند کیلئے قبول دین میں کوئی عذر باقی نہ رہے اور اسلامی مسائل دنیا کیلئے اوفق بالقبول ہو جائیں۔ اگر روحانی اپنی قوت یقین سے مانیں تو مادی طبقہ ان مادی نظائر ہی کو سامنے رکھکر تسلیم کرے اور اس طرح یہ مادی اختراعات اسلام کی روحانی تحقیقات تک رسائی کا پورا ذریعہ ثابت ہوں۔

نصرانی تمدن اسلامی تمدن کے لئے ذریعہ تعارف ہے

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ جس طرح اسلام روحانیات میں خاتم الترقیات تھا اسی طرح اُس کے زمانہ کا تمدن مادیات میں بھی خاتم الترقیات ہونا چاہیے تھا تاکہ روحانیات کا ہر مخفی پہلو مادیات کی اُس رفعت کے

محسوس پہلو سے مشاہد اور نمایاں ہو سکے مگر اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ اُمتِ مُسلمہ اِن رُوحانی اِکتشافات کے ساتھ خود ہی مادّی ترقی بھی کرتی لیکن اس صورت میں خطرہ تھا کہ اُس کی رُوحانی ترقی رُک جاتی اور اُس کا ایک قلب دو کام بیکدم نہ کر سکتا نیز جبکہ اُمتِ مرحومہ کو ہر ہر ساعت اور ایک ایک لمحہ روحانی ترقی ہی اصل مقصود تھی تو وقت بھی اُس کے لئے کونسا تھا کہ وہ مادّی اختراعات میں اس شان سے مشغول ہوتی اس لئے جہاں یہ ضروری تھا کہ روحانی اِکتشافات کے لئے مادّی اور تصویری اکتشافات ہوں وہیں یہ بھی لازم تھا کہ اس کیلئے کوئی دُوسری اُمت کھڑی کی جائے اور وہ بھی وہ ہو جسے صُورت پسندی کا طبعی ذوق ہو جو تصویری جذبات سے لبریز ہو اور صورت آرائی کی خلقی طور پر دلدادہ ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی اشد ضروری تھا کہ اُس ظاہر پرست قوم کی ظاہر داریاں اسلام ہی کی باطنیات سے مناسبت رکھتی ہوں یا اُنہی حقائق کی نظیریں اور ٹھیک اُسی کی مثالیں ہوں گویا یہ ظواہر اُس کے بواطن کا دوسرا رُخ ہوں ظاہر ہے کہ اتنی قیود و شروط کیساتھ ان مادّی اختراعات کیلئے اگر کوئی مزدور مل سکتا تھا تو وہ عیسائی اقوام کے سوا دوسرا کون تھا۔ کہ فی الحقیقت اپنے مربیِّ اوّل کی تربیت کے ماتحت ذوقِ صورت پسندی اور شوقِ نمائش انہی کا پہلا اور آخری مقصد ہو اور ساتھ ہی ان کے یہ تصویری کارنامے اسلامی حقائق سے اس بناء پر کامل مشابہت ہی رکھتے تھے کہ اوّل تو اسلام ہی کے اُصولِ علوم نے اُن میں نمایاں ہو کر اُن کی تشکیل کی تھی دوسرے اس لئے بھی کہ حضرت داعیِ اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی صورت پاک کی شبیہ نے اُن میں بواسطہ عیسیٰ علیہ السّلام تصویری ذہنیت قائم کی جس سے یہ صورت طرازیوں اور ظاہر آرائیوں کا مخزن ثابت ہوئی سو جس طرح خود حضور کی

صورت پاک آپ کی حقیقت پاک سے اقرب تر اور اس کی ترجمان تھی اسی طرح آپ کی صورت پاک کے اثرات سے پیدا شدہ صورتیں آپ کی حقیقت پاک سے پیدا شدہ حقیقتوں سے اقرب تر اور ان کے لئے ترجمان ہونی چاہئیں تھیں اور وہی حقیقتیں اسلامی شریعت کے اجزا ہیں اس لئے نصرانیوں کے ساختہ تمدن اور اس کے ان تصویری کارناموں کا اسلامیوں کے تدین اور اس کی حقائق سے مشابہ تر اور ان کیلئے ذریعہ تعارف ہو جانا ایک امر فطری تھا۔

پس اُمت مسلمہ قرآنی علوم سے تربیت پا کر جن حقائق کو واشگاف کر سکتی تھی اُمت نصرانیہ انہی اُصول علوم سے روشنی پا کر ان حقائق کے مطابق صور و تماثیل نمایاں کر سکتی تھی گویا اسلامی فطرت کا باطنی رُخ اگر اُمت مسلمہ کے ہاتھوں وجود پذیر ہو سکتا تھا تو اسلام ہی کی فطرت کا دوسرا حسی اور مادی رُخ اس قوم کے ہاتھوں کھلنا چاہئے تھا اس اُمت مسلمہ کے سامنے اسلام کا تشریعی میدان کھول دیا گیا کہ اس نے اُصول اسلامیہ کا پابند ہو کر اس کے علم سے تربیت پائی تھی اور اُمت نصرانیہ کیلئے اسلام کی تکوینی صورتوں اور اس کے حسی تمثلات کی شاہراہ وسیع کر دی گئی کہ انہوں نے داعیٔ اسلام کا اتباع کئے بغیر محض علمی صورتوں سے روشنی حاصل کی تھی پس جونہی اس کا وقت آپہنچا کہ دنیا کے سامنے اسلامی حقائق واشگاف کی جائیں اور بلحاظ کیفیت ساری دنیا کی مختلف الخیال اقوام کو اسلامی مقاصد سے آشنا بنایا جائے وہ بھی صورت پسند نصرانی اُمت کو انہی قرآنی اُصول کی روشنی میں سلیقہ دیا گیا کہ وہ ہر اسلامی حقیقت کی بالمقابل اس کی ایک دلچسپ مادی مثال مہیا کرے تاکہ حس پسند اقوام اور ظاہر بینوں کیلئے اسلامی حقیقت دلپذیر ہو جائے اور کسی مادی یا طبعی انسان کو بھی اس کے انکار پر جرأت نہ ہو۔ پس جوں جوں اُمت مرحومہ اپنے علمی اُصول کے ماتحت الٰہی حقائق کھولتی

جاتی ہے یہ اُمت وُوں وُوں اُن عمیق حقائق کے لئے مادّی اور صوری نظائر مہیا کرتی جاتی ہے جو حیرتناک طریقہ پر اُن حقائق پر لباس کی طرح چست اور مطابق آتی جارہی ہیں۔

تعارفِ دین کی چند مثالیں

نطق اعضاء کی مثال (۱) مثلاً جب اُمّت مرحومہ نے اعتقادات کا یہ مسئلہ پیش کیا کہ یوم جزا میں تمام اعضاء بدن اپنے اپنے کئے ہوئے اعمال پر خود بول اُٹھیں گے اور بدن کا ذرہ ذرہ انسانی کرتوت پر گواہ بن جائیگا تو مادہ پرست عقلوں کی طرف سے شبہات کئے گئے کہ بدن کی کھال، رہیاں یا گوشت پوست کیسے بول سکتے ہیں لیکن مادیات میں گریموفون کی ایجادات نے اُنہیں سمجھا دیا کہ مسالہ کے ایک سیاہ رنگ ریکارڈ کو اگر ایک چھوٹی سی سوئی سے چھیڑ دیا جائے تو وہ فوراً سب کچھ بتلا دیتا ہے جو اُس میں انسانی صنعت نے بھر دیا تھا۔ تو پھر کیا بعید ہے کہ انسانی جسم بھی جو اُس کی پوری زندگی کا ایک پورا ریکارڈ ہے جب قدرت الٰہی کی سوئی لگتے ہی بجنا شروع ہوگا تو وہ سب کچھ اُگل دیگا جو اُس میں انسان نے اپنے کسب سے بھر لیا تھا۔

معراج جسمانی کی مثال (۲) اسی طرح جب اُمّت مرحومہ کی طرف سے کہا گیا کہ خدا کے پیغمبر کو رات ہی رات بُراق کے ذریعہ انتہائی سرعت سیر کیساتھ تمام آسمانوں کی جسمانی معراج کرائی گئی تو یہ برق رفتاری یہ جسمانی عروج یہ آسمانوں تک پل بھر میں پہنچکر واپس آجانا مادہ پرستوں کی عقل پر شاق گذرا اور اُنہوں نے معترضانہ زبان کھولی لیکن جونہی یورپ کے بلند پرواز سائنسدانوں اور ماہرین ہیئت نے اپنے تیز رفتار فضائی وسائل کے بل بوتہ پر چاند کے سفر کا ارادہ کیا اور اُسکا قریبی امکان بتلایا حتّٰی کہ

اُس کی دریافت کردہ آبادیوں میں تصرفات کرنے کا عزم بھی ظاہر کیا تو اُن کے مقلدین کیلئے اِس امکان ہی سے آخر کار حضورؐ کے عروج جسمانی کا امکان تسلیم کر لینے میں بھی کوئی حجت باقی نہیں اگر یورپ کے مادی اور مادہ پرست انسان جو رات دن ہر نوع کی مادی غذاؤں سے اپنے بدنوں کو پالنے اور فربہ کرنے میں منہمک ہیں اگر ہزارہا من وزنی طیاروں پر محض پٹرول کی گیس یا برقی طاقت سے کئی کئی سو میل فی گھنٹہ آسمانی فضاء میں پرواز کر سکتے ہیں تو اللہ کے سچے رسول کے جسم پاک کا (جو ویسے انتہا تقلیل غذا اور تقلیل لذائذ کے سبب الطف ترین اجسام تھا پھر روحانیت کی آمدن کی مجاورت سے ہمرنگ روح ہو کر اقوی ترین ابدان بھی تھا) براق جیسی برق رفتار سواری کی مدد سے بجلی کی طرح پل بھر میں تمام آسمانی فضاؤں کو طے کر لینا آخر کیوں ممکن نہیں ہے پس طیاروں کی برق رفتاری نے اور سفر چاند کے امکانات نیز چاند کی اقلیم میں حکومت کرنیکے تخیلات نے مسئلہ معراج جسمانی کیلئے مادیات کی نظیریں اس طرح مہیا کیں کہ گویا یہ مادی ایجاد صرف اسی حقانی مسئلہ کو سمجھانے کیلئے پردۂ دنیا پر نمایاں کی گئی تھی۔ اور کم از کم اِس قوم کو اس میں تامل کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔

انتشار صورت کی مثال (۳) اِسی طرح تاریخ کے صاف و روشن اوراق نے ہم تک روحانیات کا یہ محیر العقول کرشمہ پہنچایا کہ نائب نبوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں ممبر پر کھڑے کھڑے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر ساریہ کو اپنی یہ آواز پہنچائی کہ اے "ساریہ پہاڑ کی آڑ پکڑ" مادی عقلیں روح کے اِس روشن کارنامے کو برداشت نہ کر سکیں۔ اور یہاں تک نہ پہنچ سکیں کہ ایک اسباب کا پابند انسان بلا کسی ظاہری واسطہ کے کس طرح اتنی دور تک اپنی آواز پہونچا سکتا ہے

لیکن وائرلیس کی ایجاد نے ان کٹھ حجت عقلوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور بتایا کہ اگر ایک مادّی انسان کی آواز بلا کسی خطا ہر دو جہ سلسلہ اوقات کے یورپ ایشیا اور مشرق سے مغرب تک لمحوں میں پہنچ سکتی ہے تو اس میں کونسا اشکال ہے کہ ایک روحانی فرد کی دینی صدا محض روح کے مخفی سلسلوں کے ماتحت مدینہ سے ساریہ کے کانوں تک پہنچ جائے؟ پس گویا وائرلیس کا وجود اسلام کی ایسی ہی کرامتوں کے اثبات کے لئے کرایا گیا تھا۔

پس پشت دیکھنے کی مثال (۴) یا مثلاً شریعت اسلام نے یہ واقعی خبر ہمارے کانوں تک پہنچائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیٹھ پیچھے کی چیزیں بھی اسی طرح دیکھ لیتے تھے جس طرح آپ آنکھوں کے سامنے کی چیزیں معاینہ فرماتے تھے۔ گرفتاران اسباب خوگران عادت نے اسے محض خوش عقنادی کہکر اڑا دیا۔ لیکن یورپ کے ماہرین علم بصارت کی اس تحقیق نے انہیں چونکا دیا کہ ایک آنکھوں ہی میں نہیں بلکہ انسان کی پوری جلد میں قوت باصرہ پھیلی ہوئی ہے اور اس کی جلد کے نیچے سارے جسم میں چھوٹے چھوٹے ذرات پھیلے ہوئے ہیں جو ننھی ننھی آنکھیں ہیں اور ان میں بھی اسی طرح تصویر اُتر آتی ہے جس طرح آنکھ کی تپلی میں۔ اور بقول "ڈاکٹر فرگول" آج سے ہزاروں سال پیشتر آنکھوں کے بغیر پڑھنے کا ہنر اپنے کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ آنکھوں سے بھی وہی کام لے سکتا ہے جو بدن کی جلد سے لیتا ہے تو اس نے جلد سے دیکھنے کا طریقہ ترک کر دیا اور بالآخر جلد سے دیکھنے کی قابلیت اس میں سے مفقود ہو گئی ہے۔ گویا یورپ کے ڈاکٹروں کا یہ انکشاف محض اس لئے تھا کہ حضور کا یہ معجزہ مادی عقلوں کے قریب تر کر دیا جائے۔

تحفظ اصوات کی مثال | (۵) آج سے قرن ہا قرن پہلے قرآن نے یقین دلایا تھا کہ تمہارے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات محفوظ ہے۔ پہلے دنیا کے سامنے

انسانوں نے جو کچھ بھی زبان سے نکالا ہے وہ محفوظ ہے اور بالآخر وہ ساری آوازیں تمہارے سامنے آجائیں گی۔ آنکھوں کے بندے حیران تھے کہ اس نادیدہ دعویٰ کو کس طرح قبول کریں لیکن سائنس کے جدید انکشافات نے مشاہدہ کرا دیا کہ دنیا کی ابتک کی آوازیں اسی آسمانی فضا میں محفوظ ہیں جو جدید آلات کے ذریعہ ہمارے کانوں میں آنے لگی ہیں مگر ایک ایسے شور کی صورت میں کہ آوازوں کا باہمی امتیاز مفقود ہے۔ امید ہے کہ ہم بہت جلد امتیاز کے ساتھ یہ آوازیں محسوس کرنے لگیں گے اور کیا عجب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ خطبہ سنوا سکیں جو انہوں نے حواریوں کے سامنے دیا تھا۔ گویا اس انکشاف نے نہ صرف تحفظ اصوات ہی کا مسئلہ حل کر دیا ہے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی بھی (جس کی اطلاع اسلام نے دی تھی) تمہید ڈال دی ہے۔

شجر و حجر کی بول چال کی مثال | (۶) اسلام نے خبر دی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یک ملی اشارہ پر درخت جھک جاتے تھے اپنی جگہ سے نقل و حرکت کرنے لگتے تھے یا انہوں نے حضور کو سلام کیا تو آپ کی طرف سے الہامی طریق پر مائل ہوئے وہ تسبیح و صلوٰۃ میں مشغول ہوتے ہیں جو انہی کی فطری وضع کے مطابق ہوتی ہے۔ مادی طبائع پر اس کا یقین ایک بار گراں ثابت ہوا۔ اور انہوں نے اس کے مقابلہ کے لئے وہی اپنا پرانا ادعا کر خود دو معذرت نامہ پیش کیا کہ ایسا تو کبھی دیکھا نہیں گیا۔ لیکن ماہرین نباتات کی سائنسی تحقیقات نے اس کا مشاہدہ کرا دیا ہے کہ پودے دیکھتے اور سنتے ہیں وہ آپس میں بات چیت کرتے ہیں وہ بیمار و تندرست ہوتے ہیں وہ سوتے اور جاگتے ہیں حتیٰ کہ عشق و محبت کے جذبات بھی ان میں سرایت کرتے ہیں انہیں دواؤں کا بھی اثر

ہوتا ہے وہ انسانوں اور اُن کی تحریک پر شر ملتے بھی ہیں اور خلاصہ یہ کہ جس شعور کے تمام وہ مدارج ہو ایک جاندار پر آسکتے ہیں اُن میں بھی اپنی قابلیت کے مطابق موجود ہیں چنانچہ بنگال کے مشہور ماہر نباتات ڈاکٹر جگدیش چندر بوس نے انہی حقائق کو باور کرانے کیلئے کلکتہ میں ایک مستقل یونیورسٹی قائم کی ہے جس کو خود احقر نے بھی دیکھا ہے اور ساتھ ہی وہ ایک مستقل تصنیف میں بھی لگے ہوئے ہیں جو اسی نباتاتی حقائق پر مشتمل ہوگی پس ان ماہرین کا یہ تجربہ و مشاہدہ گویا اسی قرآنی حقیقت کو قریب الی الفہم کرا دینے کیلئے تھا جو اس طرح مادی محسوسات کے ذریعہ نمایاں کیا گیا۔

وزن اعمال کی مثال (۷) اسی طرح شریعت حقہ نے یقین دلایا تھا کہ تمہارے وہ اعمال جنہیں تم کرنے کے بعد ہوا میں گم شدہ اور معدوم خیال کرنے لگتے ہو بجنسہ محفوظ ہیں اور یوم جزا میں انہیں تولا جائیگا۔ اور انہیں کے وزن پر اعمال کا بدلہ دیا جائیگا مادی جبلت پر یہ چیز سخت شاق ہوتی اور اگر سائنس کی موشگافیاں اس کا مشاہدہ نہ کرا دیتیں کہ آج خود ہوا بھی تولی جانے لگی ہے اور ٹائر اور ٹیوب میں وزن کر کے بھری جاتی ہے اور اُسی کے وزن پر اُس کی قیمت کا مدار ہوتا ہے تو اس عقیدہ کا تیقن بندگان مشاہدہ کے لئے ناممکن ہو جاتا۔ جرمنی نے کچھ ایسے کانٹے بھی ایجاد کرلئے ہیں جنمیں اعمال تو بجائے خود رہے انسانی اخلاق بھی تول لئے جاتے ہیں پس اس قسم کی ایجادات حقیقتاً انہی غیبی معانی و حقائق کی تفہیم کیلئے خدا کی فیاض حکمت نے اس دور کے فلاسفروں کے ہاتھ پر ظاہر فرمائی ہیں۔

شق صدر کی مثال (۸) اسی طرح جبکہ اخبار صادقہ نے ہمیں یقین دلایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفولیت و شباب میں حضور کا سینہ مبارک چاک کر کے ملائکہ غیب نے اُسمیں

علم و حکمت اور نور معرفت بھرا اور پھر سینہ مبارک بدستور درست کر کے برابر کر دیا۔ تو بہت لوگ جس کو اس کے تسلیم کرنے میں سخت پس و پیش ہوا۔ کہ آخر سینہ چاک کر دینے کے بعد بقاء حیاۃ کی کیا صورت ہو سکتی ہے جو اس واقعہ کو باور کیا جائے؟

لیکن دور حاضر کی ترقی یافتہ سرجری اور فن جراحی نے نازک سے نازک آپریشنوں کی مثالیں پیش کر کے اس سچے واقعہ کو مادی عقلوں سے بھی اتنا نزدیک کر دیا کہ اب انہیں شبہ تک کرنے کا بھی کوئی حق نہ ہونا چاہیئے۔ آج ماہر سرجنوں کے ہاتھوں سینہ و شکم بھی چاک ہوتا ہے پھر اس چاک سے جگر بھی نکال لیا جاتا ہے جگر کو علیحدہ کر کے نیچے سے پتہ بھی کھینچ لیا جاتا ہے پتہ کھولکر اندرونی آلائشیں صاف کیجاتی ہیں پیدا شدہ رسولیاں اور پتھریاں نکالی جاتی ہیں اور ساری قطع و برید اور صفائی کے بعد چاک کردہ اعضاء کو برابر کر کے ٹانکا بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن نظام بدن میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا بلکہ بسا اوقات یہ چاک شدہ اعضاء پہلے سے زیادہ بہتر طریقہ پر اپنے وظائف طبعی ادا کرنے لگتے ہیں۔ پھر کیا ایک مادی ڈاکٹر تو اس قطع و برید اور تصفیہ و تدارک پر اپنے حسّی آلات کی بدولت ایسی قدرت رکھے۔ لیکن وہ قادر و توانا جس کے ادنیٰ اشارہ پر سارے روحانی اور مادی نظام چکر کھا رہے ہیں یہ قدرت نہ رکھے کہ اپنے غیب کے سرجنوں کے غیر محسوس ہاتھوں سے اپنے مقدس نبی کے سینہ و قلب کا آپریشن کر کے اسمیں سے لڑکپن اور جوانی کے مضر مقتضیات کی آلائش نکلوائے اور کمالات غیب سے اسے بھروائے اور پھر سینہ و قلب بدستور برابر ہو جائے؟ پس یوں سمجھنا چاہیئے کہ گویا اس خارق عادت شق صدر کو ہی باور کرانے کیلئے خدا کی فیاض حکمت نے آج کی فن جراحی کو اس حد کمال پر پہنچایا ہے تاکہ حسیات کے بندے بھی ان روحانیات میں کسی نکتہ چینی اور شبہ

کی مجال نہ پا سکیں۔

بہرحال جبکہ یہ مادی مثالیں اسلام کی علمی و معنوی حقائق کے اثبات کیلئے بطرز ایک آئینہ کے ثابت ہوئیں جنہیں ہی روحانیات کے باریک سے باریک خدوخال بہت واضح طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں اور دنیا کیلئے اسلامی حقائق کے سمجھ لینے کا راستہ ان شفاف شیشوں نے اس طرح کھول دیا گویا انکا وجود ہی ان حقائق کے دکھلانے کیلئے بنایا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ایک مستقل حقیقت ثابت ہوئی کہ یہ تمام مادی ایجادات اسلام ہی کے دور دورے میں ہونی چاہیئے تھیں اور ہو سکتی تھیں کیونکہ یہ آثار صرف انہی جامع تعلیمات سے ذہنوں میں قایم ہو سکتے تھے جنہیں سے مادیات اور روحانیات کی طرف پہلو بہ پہلو راستہ جاتا ہو اور ایسی جامع تعلیم بجز قرآن کریم اور کسی کتاب نے نہیں دی۔ نہ قرآن کریم علم کے اتنے پہلو واشگاف کر کے ذہنیتوں کو منور کرتا اور نہ ذہنیتیں مادہ و روح کے متعلق مرتبہ از کھولتیں پس ملت قرآنیہ کے دورہ سے قبل نہ ایسی ایجادات و اختراعات کیطرف ذہن التفات کر سکتے تھے اور نہ فی الواقع اُن کی حاجت ہی تھی اسلام ہی کی جامع حقائق ایسی جامع صورتوں اور نمونوں کی متقاضی ہو سکتی تھیں ورنہ دوسرے مذاہب نے نہ مغیبات کی ایسی تفصیلات ہی کی تھیں کہ انکے سمجھنے کیلئے ایسے محسوس شواہد کی ضرورت پڑے اور نہ اُن مذاہب کے دور دورے میں ذہنیتوں میں یہ روشنی ہی پیدا ہو سکتی تھی کہ طبائع ایسی ایجادات پر قدرت پا جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی خوب کھل گیا کہ اسلامی دور دورے میں مادی ترقیات کا یہ سلسلہ صرف عیسائی اقوام ہی کے ذریعہ چھڑنا چاہئے تھا کہ ملت اسلامیہ کے معنوی مقاصد کے مناسب اور ٹھیک ٹھیک مطابق مادی مثالیں اور تصویری ایجادات صرف یہی قوم نمایاں کر سکتی تھی

جو خود بھی اسلام ہی کے تصویری رُخ سے وجود پذیر اور اُس کے صوری برکات سے تربیت یافتہ ہوا اور وہ
صرف عیسائی ہی ہو سکتے تھے جن کے قومی وجود کی تشکیل ہی (بواسطہ عیسیٰ علیہ السلام) حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ صورت مبارک سے ہوئی ہے اور اس لیے اُس میں اور ملت مسلمہ میں
صورت و حقیقت کی نسبت قائم ہوئی۔

رُوحانی و مادی نظاموں کی ہمہ گیری ہمیں اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اسلام آخری مذہب ہونے کی وجہ سے جامع مذاہب
اور سارے عالم کیلئے پیغام تھا اور اسی وجہ سے ضروری تھا کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے اور اُسکی حقائق دنیا کے چپہ چپہ پر منتشر ہوں
تو یہ بھی ضروری تھا کہ اُس کی ثابت کنندہ صورتیں تماثیل اور مادی نمونے بھی ساری دنیا میں منتشر ہوں بالفاظ دیگر اگر
اسلام کی تبلیغ عالمگیر ہو تو نصرانی تمدن بھی عالمگیر ہو اور دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے کہ جہاں تمدن و عیسائیوں کا اثر نہ
پہنچے تاکہ اسلام ہر جگہ قابل قبول ہو سکے یہی وجہ ہے کہ قرون خیر میں زمانہ ظہور مہدی و نزول عیسیٰ علیہما السلام جہاں
اسلام کی اشاعت عام کی خبر دیگئی جس سے کوئی قریہ و شہر اور کوئی گھرانہ خالی نہ رہیگا وہیں احادیث
میں نصاریٰ کے غلبۂ عام اور اُن کے تمدن کے مقبول عام ہونیکا پتہ بھی بتایا گیا ہے چنانچہ آج
اُس کی بنیاد بھی پڑ چکی ہے۔ وسائل سیر و سفر کی ہمہ گیری سے اگر یورپین تجارتیں اور اُنکی تمدنی ایجادات
پھیلتی جاتی ہیں تو ساتھ ہی تلاش مذہب کے سلسلہ میں اسلام بھی دلوں میں گھر کرتا جاتا ہے اور ان
تمدنی عجائبات میں گھر کر اگر کوئی مذہب انسانی زندگی کا ساتھ دینے والا ثابت ہو رہا ہے تو وہ صرف
اسلام ہی ہے پس سائنسی ترقیات کی رو میں اگر اور مذاہب کی تخریب ہو رہی ہے تو اسلامی
محبوبیت کی پختہ تعمیر ہو رہی ہے جتنی نئی ایجادات اسکو مجروح تو کیا کرتیں اور اس کے لئے مؤید بلکہ حسی
دلائل ثابت ہو رہی ہیں۔ اور اُن طبعی اشیاء سے اسلام کی فطرت اور اسکا طبعی ہونا اور زیادہ واضح

ہو رہا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے دوش بدوش اور انہی کی شانکی مناسب اس قوم کی ترقی ضروری تھی۔ پس عجیب ترنکات یہ ہیں کہ غلبہ عیسائیوں کا ہو رہا ہے اور اشاعت اسلام کی ہو رہی ہے اور دوستوں کی بجائے دشمن اس اشاعت کا ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں۔

وانّ اللّٰہ لیؤید ھٰذا الدین بالرجل الفاجر۔ | بیشک اللہ پاک برے آدمی سے بھی اس دین کو قوت پہنچا دیتا ہے۔

مسلم و مسیحی میں ایک دوسرے سے لگاؤ اور اس کی وجہ

پھر اسی صورت و حقیقت کی نسبت کو سامنے رکھکر ایک اصولی حقیقت اور ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر حقیقت کو اپنی صورت کیطرف میلان ہوتا ہے اسی لئے آدمی اپنی صورت اور بدن کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی آرائش کرتا ہے اسے سرد و گرم سے بچاتا ہے اور اس کی صورت پر اگر کوئی حملہ کسی مرض کا ہو جائے تو معالجہ کر کے پھر صورت کی زیبائش کو بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر صورت و شکل اور بدنی ہیئت کے ساتھ کوئی الفت و انس نہ ہو تو اندرونی حقیقت کی جانب سے صورت کی یہ نگہداشت و ملاطفت بھی نہ ہو وجہ ظاہر ہے کہ حقیقت کو مخفی کمالات کو ظہور کا ذریعہ صورت ہی ہے۔ اگر حقائق صورتوں کا لباس نہ پہنیں تو وہ دنیا میں کبھی روشناس ہی نہیں ہو سکتیں اس لئے فطرتاً حق تعالیٰ کو اپنی صورتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہاں مگر یہی حال بعینہٖ صورت کا بھی ہے کہ وہ جب ترجمان حقیقت ہے اور اسکا وجود ہی اس بنا پر ہے کہ وہ اپنی حقیقت کی ترجمانی کرے تو ظاہر ہے کہ اُسے اپنا وجود سنبھالنے کیلئے حقیقت کیطرف رجوع کرنا لازمی ہے اگر عوارض کے سبب سطحی طور پر وہ برائے چندے حقیقت سے الگ بھی ہو جائے تب بھی انجام کار اُسے اپنی ہی حقیقت کیطرف جھکنا اور اسی کے تابع بننا ناگزیر ہے ورنہ کامل انقطاع کے بعد

صورت کا کسی درجہ میں بھی وجود نہیں رہ سکتا۔ اِس طبعی اصول کے ماتحت ناگزیر ہے کہ حقیقت پسند مسلم کو تو صورت پرست عیسائی کے تمدن کی طرف طبعی رغبت ہو اور عیسائی کو بالآخر اپنی ہی حقیقت یعنی اسلام کیطرف جھکنا پڑ جائے۔ چنانچہ ایک طرف تو احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمان خصوصیت کیساتھ نصاریٰ کیساتھ تمام تمدنی اور غیر تمدنی اُمور میں مشابہت پیدا کر کے عیسائیوں کے ہمرنگ سا ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔

لتتبعن سنن من قبلکم شبراً بشبر	تم اپنے سے پچھلی اقوام کی ہو بہو پیروی ضرور کرو گے
وذراعاً بذراع قالوا الیہود	ہاتھ ہاتھ بھر دو دو ہاتھ بھر۔ انگل انگل اور پورا پوری
والنصاریٰ قال وھل الناس	پورے یعنی خفیف و کبیر تمام باتوں میں صحابہ نے عرض کیا
الا ھم او قال فمن؟	یہود و نصاریٰ کی؟ فرمایا اور کون؟

دوسری حدیث میں ارشاد ہے جسکو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں

لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل	میری اُمت پر وہ ساری باتیں آویں گی جو بنی اسرائیل
حذو النعل بالنعل حتی ان کان	پر آچکی ہیں ایسی مطابقت کیساتھ جیسے جوتے کا تلا دوسرے
منھم من اتی امہ علانیۃ لکان	تلے پر منطبق ہو جاتا ہے حتی کہ اگر اُنمیں کسی نے اپنی ماں
فی امتی من یصنع ذلک وان بنی	کیساتھ علانیہ زنا کیا ہو گا تو ایسا کرنے والے میری اُمت
اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین	میں بھی ہوں گے اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے
ملۃ وتفترق امتی علی ثلث وسبعین	تھے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائیگی
ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ	جن میں سب کے سب جہنمی ہوں گے۔ صرف ایک فرقہ

قالوا من هي یا رسول اللہ، قال ما انا — بچیگا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ کونسا فرقہ ہوگا؟

علیہ و اصحابی (مشکوٰۃ ص۳۰ باب الاعتصام بالسنۃ) — فرمایا وہ جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا۔

اس حدیث میں علم اور عمل دونوں میں تشبہ اور باہمی مشابہت کی خبر دیگئی ہے عمل کے سلسلہ میں بدترین فعل زنا ہے اور وہ بھی ماں کے ساتھ اور علم کے سلسلہ میں بدترین چیز جدال و نزاع ہے سو دونوں میں مشابہت مطلقہ کی خبر دی گئی ہے۔ انہی احادیث کی شرح میں ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

انتم اشبہ الامم ببنی اسرائیل سمتا — تم اے مسلمانو بنی اسرائیل سے بہت زیادہ مشابہ ہو

وھدیا۔ (اقتضاء الصراط المستقیم) — خصلتوں میں اور عادتوں میں۔

ادھر عیسائی جب کہ مادی دقائق اور محیر العقول ایجادی کارناموں کے ذریعہ اسلام کے علمی اصول کی عملی مشق کرتے کرتے خواہ مخواہ بھی اُن کی تحتانی حقائق اور حقیقی معانی یعنی شرائع سماویہ تک جا پہنچیں گی تو انجام کار اسلام اُن کیلئے اجنبی نہ رہیگا اس لئے شریعت اسلامیہ اسی کے ساتھ یہ بھی خبر دیتی ہے کہ آخری دور کے سارے ہی عیسائی داخل اسلام ہو کر رہیں گے چنانچہ عیسیٰ علیہ السّلام کی آمد پر تمام عیسائیوں کا دائرہ اسلام میں آنا اور عیسیٰ علیہ السّلام کے واسطے سے اسلام کی اطاعت کرنا کتاب وسنت کی تصریحات میں موجود ہے۔ عیسیٰ علیہ السّلام پیروی اسلام کیساتھ آئیں گے شعائر اسلام کو قائم کریں گے شعائر نصرانیہ کو مٹائیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کو توڑ دینگے جزیہ کو اٹھا دیں گے اسلام کے سوا کوئی چیز قبول نہیں کیجائیگی کفر کے ہوتے ہوئے موت اور قتل کے سوا کوئی سزا نہ ہوگی گویا اُسوقت عیسائیوں کیلئے وہی حکم ہوگا جو صدر اول میں مشرکین کیلئے تھا۔

کہ ان کے حق میں یا اسلام تھا یا تلوار درمیان میں جزیہ کا واسطہ ہی نہ تھا۔

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ اور کوئی شخص اہل کتاب سے نہیں رہتا مگر وہ عیسیٰ علیہ السّلام کی اپنے مرنے سے پہلے ضرور تصدیق کر لیتا ہے۔

پس جس طرح کہ نصرانی تمدن کیطرف مسلمانوں کے طبعی میلان کی خبر دیگئی ہے بالکل اسی طرح اسلامیوں کے تدین کیطرف نصرانیوں کے طبعی رجوع کی بھی اطلاع دی گئی ہے۔ پس اگر آج مسلمان صورت و وضع کے لحاظ سے عیسائی تمدن میں غرق ہوتے چلے جا رہے ہیں تو آج یورپ بھی خصوصیت کیساتھ اسلامی پروگرام کیطرف ڈھلتا چلا آ رہا ہے گو نام اسلام کا نہ لے لیکن عملاً کتنے ہی اسلامی اعمال اس نے بھی اختیار کر لئے ہیں پس عمل بہت حد تک اسلامی ہو چکا ہے صرف کھلے انقیاد اور اقرار کی دیر ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ بہرحال نصرانی تمدن کے غلبۂ عام کے وقت مسلمانوں کا نصرانیت کی طرف ڈھل جانا اور اسلام کے غلبۂ عام کے وقت خصوصیت سے عیسائیوں کا اسلام کیطرف جھک پڑنا حقیقتاً اسی صورت و حقیقت کی نسبت کا اثر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس طرح صورت تعارف حقیقت کا ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح عیسائی اقوام کی یہ تمدنی شکلیں اور تصویری ایجادیں اسلامی حقائق کے حق میں باعث تعارف ہو کر پہلے عیسائیوں ہی کو اسلام کی چوکھٹ پر جھکائیں گی اور پھر ان تمام اقوام کو جو ان کے تمدن کو قبول کر کے انہی کی لائن پر چل پڑی ہوں گی۔

پس مسلمان اگر ان کے تمدن پر مائل ہوتے ہیں تو اس لئے کہ وہ انہی کے مذہب کی تصویر ایک حسی اور مادی رخ ہے اور عیسائی اگر مسلمانوں کے تدین پر جھکتے آتے ہیں تو اس لئے کہ اس تصویری

تمدن کا بطانہ اور حقیقت یہی مذہب اور اُسی کے حقائق ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ اہل حقیقت اگر صورت پرست بننے لگیں تو یہ اُن کے حق میں تنزل اور نفسانی خسارت ہوگی اور اہل صورت اگر حقیقت پرست ہونے لگیں تو اُن کے حق میں ترقی اور صحیح جذبات کا استعمال ہوگا کہ صورت و حقیقت میں مقصود حقیقت ہی ہوتی ہے نہ صورت پس وسائل سے مقصود کیطرف آنا تو ترقی ہے اور مقصود سے بہک کر وسائل میں پھنس جانا انتہائی تنزل اور پستی ہے۔

مسلمانوں کو سب سے زیادہ عیسائیوں سے ہی عداوت ہوسکتی ہے اور اُسکی وجہ

پھر یہ ایک قدرتی حقیقت ہے کہ اگر صورت اپنی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہوئی اُس کے تابع بنکر رہے تو حقیقت کیلئے صورت سے بڑھکر کوئی دوسری چیز معین بھی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر صورت مسخ ہو جائے اور اپنی حقیقت کے تابع ہونے کے بجائے اُس سے اعراض کرے یا خود اُسی کو اپنا تابع اور زیر فرمان بنانے کی ٹھہرائے گویا جسم و رُوح کو اپنا تابع اور غلام کرنیکی تدبیر کرنے لگے تو پھر صورت سے بڑھکر حقیقت کا کوئی دشمن بھی دوسرا نہیں ہوسکتا اور اس لئے حقیقت کو ایسی صورت سے جتنی بھی نفرت و عداوت ہو کم ہے پس اگر عیسائی اقوام دائرہ اسلام کیطرف چلتے ہوئے صحیح معنی میں عیسائی ہوں گویا صحیح معنوں میں مسلمانوں کی صورت ہوں اور صورت کی طرح اپنی حقیقت کے تابع اور زیر اثر رہکر زندگی بسر کریں استکبار کے بجائے تواضع و انقیاد اور راہ انحراف چھوڑ کر جادۂ اطاعت اختیار کرلیں تو اُمت مسلمہ کو اُن سے وہ قربت و مودت ہوگی جو دوسری اقوام سے ہرگز نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا — اور اُن میں مسلمانوں کیساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ	آپ اُن لوگوں کو پاویں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ
بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا	اس سبب سے ہی کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک دنیا
وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔	درویش ہیں۔ اور اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔

لیکن جبکہ وہ مسخ شدہ صورت کی طرح حقیقت اسلام اور گویا اپنی ہی حقیقت کو خیرباد کہہ ڈالیں اور حقیقت ہی سے منحرف ہو کر اس طرح صورت محض بنجاویں جو حقیقت کی ترجمان اور معبّر ہو گویا حقیقت ہی کو مٹانے کی فکریں کرنے لگیں تو پھر اُمّت اسلامیہ کو اس قوم سے بغض بھی وہ ہو گا جو دوسری اقوام سے نہیں ہو سکتا اس لئے دوسری طرف قرآن کریم نے یہ اعلان بھی فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ	اے ایمان والو تم یہود اور نصاریٰ کو دوست مت
وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ	بنانا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ	شخص تم میں سے اُن کے ساتھ دوستی کریگا بیشک
فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي	وہ انہیں میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	نہیں دیتے ان لوگوں کو جو اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

مسیحی اقوام ہی اسلام کیلئے باعث تلبیس ہیں اور اس کی چند مثالیں

پھر اسی نسبت صورت و حقیقت کو سامنے رکھکر یہیں سے یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صورت گو اپنی حقیقت کو مٹانے کی فکر تو نہ کرے لیکن اپنی حقیقت کی ترجمانی کرنے کے بجائے اُسے تو چھپائے اور غیر حقیقت کو حقیقت بتلانے لگے تو پھر یہی صورت بجائے تعارف حقیقت کے اُلٹی تلبیس کا ذریعہ بنجاتی ہے کیونکہ صورت

بہر صورت ترجمان ہے اور جب وہ اپنی اصلی حیثیت کی ترجمانی نہیں کرتا تو لامحالہ غیر حقیقت
کی ترجمان بنے گی جو ایک فرضی حقیقت ہوگی یا غیر واقعی ہوگی مگر غیر حقیقت کو حقیقت باور کرانا تلبیس
اور دھوکہ ہے۔ اسکا ثمرہ یہی ہو سکتا ہے کہ اصلی حقیقت مشتبہ ہو کر گم ہو جائے اور غیر حقیقت
حقیقت ہو کر ثابت نظر آنے لگے۔

نہ بریں حالت ایسے سنجیدہ اور حقیقت پسند افراد معدودے چند ہی ہوتے ہیں کہ باوجود
ان تلبیسات کو پھر بھی حقیقت کو پہچانتے ہی رہیں اور صورتوں کی اس تلبیس سے دھوکہ نہ کھائیں
لیکن عام طبائع کیلئے یہ صورت حقیقت پر دہ پڑ جاتی ہے جس سے حقیقت کا روشن چہرہ پھر کبھی
بھی سامنے نہ آسکے۔

آج کی غیر مطیع ملت نصرانیہ کی صورت بھی یہی ہے کہ اُس نے حقیقت ناشناسی کیساتھ اپنی
خالص صورت آرائیوں سے علم و عمل میں اسلامی پیرایوں اسلامی عنوانات اور اسلامی پیکروں کو
تو قائم رکھا لیکن ان صورتوں کے ذریعہ اُنہی کی حقائق کی ترجمانی نہیں کی بلکہ ان کے ذریعہ اپنی
فرضی حقیقتیں باور کرائیں۔ صورتیں وہی رکھیں اور حقیقتیں بدل دیں یعنی عنوانات اسلامی رہے
اور معنون نصرانی بن گئے خم تو مشرقی رکھا مگر اس میں شراب مغربی بھر دی جس سے عامیانہ اور غیر
صحبت یافتہ افراد نے تلبیس کی رو سے اسی کو حقیقت باور کر لیا اور صورتوں یا الفاظ کو اشتراک
سے غیر معانی کو معانی سمجھنے کی بلا میں گرفتار ہو گئے۔ مثلاً آج تہذیب کا عنوان تو قائم کیا گیا۔
لیکن عنوان تہذیب کے نیچے حقیقت کیا رکھی ہے؟ کھڑے ہو کر موتنا۔ کاغذ سے بھر صاف کرنا
بائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ننگے ہو کر کلبوں میں ناچنا۔ زنا کو قانوناً جائز سمجھنا۔ جوئے اور قمار سے

دنیا کو کھا جانا۔ کیچ کے رنگیں گلاسوں میں شرابیں انڈیل کر پینا اور خلاصہ یہ کہ دنیا بھر کی عیاشی اور بدکاری میں قومی حیثیت سے وقت صرف کرنا آج تہذیب کا سب سے بڑا مفہوم ہے حالانکہ اسلام نے اس عنوان کی حقیقت نفس کا تزکیہ اخلاق ربانی سے نفوس کو متخلق کرنا اور ان اخلاق فاضلہ پر تمدن کی بنیاد استوار کرنا بتلایا تھا۔ مگر حقیقت مٹائی جا رہی ہے اور اس کے عنوان کی صورت برقرار رکھی جا رہی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اسی قسم کی خرافات کو بہت سوں نے اسلامی حقائق سمجھ لیا اور اسلام کی واقعی حقائق سے منزلوں دور ہو گئے۔

عنوان تمدن سے تلبیس | یا مثلاً تمدن کا اسلامی عنوان تو قائم رکھا جس کی حقیقت رفاہ عام۔ تعاون باہمی۔ ادائے حقوق تقسیم کار۔ صفائی معاملات۔ ہمدردی نوع اور ضبط نفس وغیرہ تھی لیکن اس کی جو حقیقت عملاً باور کرا دی گئی اس کا حاصل بجز کھانے کمانے تعیش کے اسباب فراہم کرنے سرمایہ جمع کرنے اور بےفکری سے عیش اڑانے کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے آج تمدن کے جو معنی باور کرائے گئے ہیں ان کا حاصل بجز خود مطلبی اور خود غرضی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ پس لفظ اسلامی ہے اور معنی غیر اسلامی جو سرتاسر تلبیس ہے۔

عنوان حریت سے تلبیس | یا مثلاً حریت کا اسلامی عنوان تو اختیار کر لیا گیا جس کی واقعی حقیقت نفس امارہ کی غلامی سے آزاد ہو کر غلامی حق میں منہمک ہونا تھی لیکن اس عنوان کے نیچے جو حقیقت دکھائی جا رہی ہے اس کا خلاصہ قید حق و صداقت سے آزاد ہو جانا۔ شرع کے جوئے کو کاندھوں سے اتار پھینکنا۔ روحانیت کی ہر ہدایت سے بےنیاز ہو جانا۔ اور ساتھ ہی نفسانی جذبات اور ہوا و ہوس کے اشارہ پر چلنا دین الٰہی پر بےباکی کے ساتھ نکتہ چینی کرنا اور اپنی عقل نارسا کو معصوم سمجھ کر اسی کا ہو رہنا ہے ظاہر ہے کہ

آج عنوان حریت کے نیچے اسی حیا سوز غلامی کو حریت سمجھ لیا جاتا ہے یہی تلبیس و فریب ہے۔

عنوانِ رواداری اور تلبیس اسی طرح رواداری کا عنوان تو اسلامی لیا گیا جس کی حقیقت وسیع الظرفی و دشمنوں تک سے جائز مصالحت اور اپنوں کی دلجوئی تھی لیکن آج اس کے تحتانی حقیقت مداہنت۔ حق پوشی۔ ناحق پر سکوت اور طمع و لالچ یا نفسانی دباؤ کے سبب حق گوئی سے باز رہنا باور کرائی جا رہی ہے۔

خودداری اور تلبیس اسی طرح خودداری کا پاکیزہ عنوان تو اسلامی ہی قائم رکھا گیا جس کی حقیقت اتقا و وقار۔ ذلت نفس سے احتراز۔ خشوعِ نفاق سے اجتناب تھی لیکن آج اس عنوان کے نیچے جو فرضی حقیقت عملاً داخل کی گئی ہے وہ نخوت و غرور۔ کبر و تعلی اور فخر و خیلاء کے سوا کچھ نہیں۔

غرض عنوانات اسلامی ہیں اور معنون الحادی ہیں جامۂ لفظ مشرقی ہے اور پیکر معانی مغربی۔ سطح کی اس تلبیس کا نتیجہ عوام کے حق میں جو محض صورت اور رسم کو دیکھنے کی آنکھ رکھتے ہیں۔ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا کہ وہ الفاظ کی اسلامیت اور عنوانوں کی قدامت دیکھ کر مائل ہوں اور ان لفظی خوشنمائیوں کے نیچے جو رطب و یابس بھی ہو اسے بھی اسلامی حقیقت سمجھ کر دل کے ہاتھوں سے اٹھا لیں اور انجام کار اس لفظی اور عنوانی جال میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے واقعی حقائق سے محروم ہو کر انہی فرضی معانی کو ان الفاظ کی حقیقت سمجھنے لگیں، جو عمل کے درجہ میں تلبیس اور علم کی لائن میں جہل مرکب ہے جس سے حق اور حقیقت کی طرف لوٹنے کی اسوقت تک توقع نہیں ہو سکتی جب تک کہ تلبیس کے پردے چاک نہ ہو جائیں۔ چنانچہ موجودہ تمدن کے حق نما الفاظ اور یورپین معانی کے سبب الحادی حقیقتیں دلوں میں گھر کر گئیں اور اسلامی حقائق دلوں پر مخفی ہو گئیں اور اس تلبیس نے اقوام کو

اسلام کا نام لیکر اسلام ہی سے شائستگی راہ ڈالدی اور اُس کی حقائق کو دلوں سے محو کرنے کے مؤثر راستے پیدا کردئیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے الفاظ رہ گئے اور معانی مفقود ہوگئے رسوم و نقوش باقی رہ گئے اور حقائق گم ہوگئے۔ اسی حقیقت کیطرف سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا تھا۔

یوشك ان یاتی علی الناس زمان	عنقریب ایک زمانہ لوگوں پر ایسا آئے گا کہ
لا یبقی من الاسلام الا اسمہ و	اسلام کا صرف نام رہجائے گا اور علم کے مٹے
لا یبقی من العلم الا رسمہ (مشکوٰۃ کتاب العلم)	مٹائے نشانات۔

پس جو صورت کہ حقیقت نمائی کیلئے تھی اس قوم کی بے انقیادی نے کجراہوں کے لئے اسے ہی حقیقت پوشی کا ذریعہ بنا دیا تا آنکہ اصولی طور پر آج اس قوم کا سب سے بڑا ہنر ہی غیر حقیقت کو حقیقت دکھلانا۔ جھوٹ کو سچ کر دینا اور تاریکی کو روشنی سمجھا دینا قرار پا گیا۔ اور آج اُس کی سب سے بڑی دانش ہی ڈپلومیسی۔ مکاری۔ دھوکہ۔ فریب اور چالبازی رہگئی ہے اور بس۔ پس اُمت مسلمہ جو کچھ کرتی ہے یہ اُمت از راہ تلبیس اُسی کو محض دکھلاتی ہے۔ وہ حقائق کو ثابت کرتی ہے یہ ان کے نام کی نمائش کرتی ہے۔ اس لئے عوام الناس جو نمائش ہی پر مرتے ہیں نمائشوں کو قبول کرتے کرتے بالآخر حقائق سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر چند دن کے بعد ان نمائشوں کو حقیقت باور کرنے لگتے ہیں۔ یہانتک کہ اسلامی حقائق کا نام رہجاتا ہے اور واقعی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔ ولا یبقی من الاسلام الا رسمہ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تلبیسات کی بدولت اُمت مسلمہ کو سامنے دو قسم کے اسلام آگئے ایک رسمی اسلام جس میں حقیقت نہیں اور دوسرا حقیقی اسلام جو اپنی ہی صورت پر ہو۔ نمود پرست

طبقے نے بھی اسلام ہی کو اسلام باور کرلیا اور حقیقت بینوں نے حقیقی اسلام کو مضبوط تھامے رکھا۔ اسکا قدرتی ثمرہ یہی ہونا تھا کہ اُمت میں جدت و قدامت کی جنگ چھڑ جائے چنانچہ یہی ہوا اور اُمت کو فرقہ بندی کے عذاب نے گھیر لیا جس کا نتیجہ قومی ضعف کی شکل میں نمودار ہوا اور وہ قوم جو اقوی ترین اقوام تھی آج اضعف ترین اقوام بنگئی جسکا اصل سبب اہل کتاب کی یہ مہلک تلبیسات ہوئیں، درہو رہی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے خصوصیت سے اسرائیلی اقوام ہی کو اس مہلک تلبیس سے روکا تھا کہ ان صورت پرستوں ہی سے اس تلبیس کا زیادہ سے زیادہ خطرہ ہو سکتا تھا۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ — اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ — کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے حق میں اگر کوئی قوم من حیث القومیت مار آستین کہلائے جانیکی مستحق ہے تو وہ یہی مسیحی اُمت ہے اور اسلام اور عالم اسلام کو جس قدر صدمات قدرتی طور پر اس سے پہنچ سکتے ہیں اور پہنچے وہ دنیا کی کسی دوسری قوم سے نہیں پہنچ سکتے اور اس بنا پر آئندہ کے خطرات بھی جو اس قوم سے ہو سکتے ہیں وہ دوسروں سے نہیں ہیں۔

مسیحی اقوام ہی سے مسلمانوں کا دائمی مقابلہ ہے	یہ دعویٰ کوئی تخمینی یا وجدانی یا محض تجرباتی ہی نہیں بلکہ ایک شرعی دعویٰ ہے جس کی تائید میں کتاب و سنت کمربستہ ہیں اور اس لئے یہ ایک ثابت شدہ

حقیقت ہے چنانچہ اسلام کو اپنے ابتدائی عہد میں چار دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا سب سے پہلا مقابلہ مشرکین عرب سے ہوا مگر یہ مقابلہ دائمی نہ تھا۔ بلکہ دائمی طور پر ختم ہو گیا کہ سارا عرب ہی کفر سے پاک ہو گیا

اور حضور نے ارشاد فرما دیا۔

اَلَا وَاِنَّ الشَّیطَانَ قَد اَیِسَ اَن	سُن لو! بلاشبہ شیطان اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ
یُّعبَدَ فِی بَلَدِکُم ھٰذَا اَبَدًا۔ الحدیث	تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش کی جائے۔

(مشکوٰۃ شریف صہ ۲۳۴)

دوسرا زبردست مقابلہ یہود سے پڑا جو حجاز میں پھیلے ہوئے تھے اور انکی ریشہ دوانیوں سے اسلام کے خلاف آگ بھڑکتی رہتی تھی لیکن وہ اس طرح ختم ہو گیا کہ اُن کے دو ہی تھوک لدے جتھے تھے۔ بنو قریظہ اور بنی نضیر سو ان میں سے اوّل الذکر قتل ہو گئے اور ثانی الذکر عرب سے ہمیشہ کے لیئے جلاوطن ہو کر ملک شام میں جا بسے پھر ساتھ ہی دائمی ذلت و پھٹکار کی اُن پر مہر کر دی گئی کہ کبھی سر نہ ابھار سکیں۔

وَضُرِبَت عَلَیھِمُ الذِّلَّۃُ وَالمَسکَنَۃُ	اور جم گئی اُن پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے عذاب
وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ذٰلِکَ بِاَنَّھُم	الٰہی کے یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے
کَانُوا یَکفُرُونَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقتُلُونَ	تھے احکام الٰہیہ اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو
النَّبِیّٖنَ بِغَیرِ الحَقِّ ذٰلِکَ بِمَا	ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ اُن لوگوں نے اطاعت
عَصَوا وَّکَانُوا یَعتَدُونَ ۝	نہ کی اور دائرہ سے نکل نکل جاتے تھے۔

تیسرا زبردست مقابلہ فارسی اقوام سے ہوا جن کی نہایت ہی متمدن اور عظیم الشان سلطنت قائم تھی مگر جبکہ فارس کے اُس کسریٰ نے جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ فرمان مبارک دعوت اسلام دی تحقیر سے نامہ مبارک چاک کر دیا تو آپ نے بطور پیشینگوئی ارشاد فرمایا۔

اِذَا ھَلَکَ کِسْریٰ فَلَا کِسْریٰ بَعْدَہٗ۔ جب کسریٰ ہلاک ہو گا تو پھر اس کے بعد کسریٰ نہ ہو گا۔

چنانچہ اس کسریٰ پر آفات کا نزول ہوا اور اس کی ہلاکت پر سارے فارس میں طوائف الملوکی پھیل گئی کوئی مستقل کسریٰ نہ رہا اور نہ ہو سکا یہاں تک کہ عہدِ فاروقی میں سارا ایران ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا اور یہ مقابلہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

پھر تھا زبردست مقابلہ مسیحی اقوام سے ہوا جنکی عظیم الشان سلطنت تمام روم و شام میں پھیلی ہوئی تھی یہ مقابلہ نہ ختم ہوا اور نہ ہو گا چنانچہ حضورؐ نے جیسے ان تین مقابلوں کی خبر دی تھی اس مقابلہ کے دائمی ہونے کی اطلاع دی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالرُّوْمُ ذَوَاتُ الْقُرُوْنِ اِذَا ھَلَکَ قَرْنٌ خَلَفَ قَرْنٌ۔ اَلْحَرْبُ بَیْنَنَا وَبَیْنَھُمْ سِجَالٌ یَنَالُوْنَ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْھُمْ

اہل روم کے مختلف دور ہوں گے ایک دور ختم ہو گا دوسرا اس کے قائم مقام۔ ہمارے اور ان کے درمیان جنگ برابر جاری رہے گی کبھی وہ غالب ہم مغلوب کبھی ہم غالب وہ مغلوب

پس یہی ایک قوم نکلتی ہے جو حقیقتاً مسلمانوں کی حریف اور مدِ مقابل قوم ہے اور تاریخی طور پر اسی کا مقابلہ دائمی طور پر جاری ہے۔ اور رہے گا یہاں تک کہ اسلام کلیۃً غالب آ جائے۔ اس سے پہلے کبھی یہ غالب کبھی وہ غالب۔ پھر ظاہر ہے کہ جلد ختم ہو جانے والی جنگ وہی ہوتی ہے جس میں کھلا مقابلہ ہو۔ لیکن وہ لڑائی جس میں امتداد ہو اور قرون و دھور بھی اس کیلئے کافی نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ تلبیس و مکر اور زور ہی کی جنگ ہو سکتی ہے اور تلبیس و مکر صورت آرائیوں ہی سے ممکن ہے اس لئے عقلاً بھی دائمی مقابلہ حقیقتاً اگر ہو سکتا تھا تو انہی صورت پرست مسیحی اقوام سے ممکن تھا جن کا سنگِ بنیاد ہی صورت پرستی اور تلبیس حقائق پر قائم ہے۔ اس لئے دائمی طور پر اگر مسلمانوں کا

کوئی حریف اور مد مقابل ہے تو وہ صرف عیسائی اقوام ہی ہو سکتی ہیں۔ اس لئے جنگ کے بارہ میں اگر مسلمانوں کو ان تھک ہمت و جرأت اور تیقظ کی ضرورت ہے تو حقیقتاً صرف اسی قوم کے مقابلہ کے لئے ہے ورنہ دوسری اقوام تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے مقابلہ کی اس لئے جرأت نہیں رکھتیں کہ نہ وہ بذاتہ حریف ہیں اور نہ مد مقابل۔ بلکہ اُن کا مقابلہ بھی اگر ہو سکتا ہے تو انہی کے بل بوتہ پر۔

اِس اصولی حقیقت کو ایک ہم ہی نہیں تسلیم کر رہے بلکہ خود عیسائی بجائے خود اسی طرح باور کئے ہوئے ہیں چنانچہ گورنر جنرل ہند لارڈ ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھتا ہے۔

"میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں"۔ (ان سپی انڈیا ۳۹۹)

(منقول از خطبۂ صدارت مسلم ایجوکیشنل علیگڈھ)

بہرحال فریقین کے اعتراف و اصول کے ماتحت فریقین کے حقیقی حریف فریقین ہی ثابت ہوتے ہیں جسکی جنگی استداد کی صورت تلبیس اور ڈپلومیسی ہی ہو سکتی ہے۔ جو ہمیشہ صورت آرائی اور نظر فریبی کے راستہ سے آتی ہے۔

نصرانی تمدن کا انجام خود اپنے تمدن کی تباہی

یہاں سے یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ جو صورت از راہ تلبیس یا کھلے بندوں اپنی ہی حقیقت کو مٹانے یا اُسے بغیر مستعار بنانے کا راستہ اختیار کرلے تو وہ حقیقتاً خود اپنے ہی کو مٹانے کی تدبیر کرتی ہے۔ کیونکہ کوئی حقیقت مٹنے کیلئے بنائی ہی نہیں گئی پھر وہ صورت اُسے کیا مٹا سکتی ہے جسکی خود عارضی بقا بھی اُسی حقیقت کے دم سے قائم ہے۔ اگر حقیقت

کچھ غبار پڑ بھی جائے تو انجام کار ایک ہوا کے جھونکے سے حقیقت کا چہرہ پھر اُسی طرح چمکتا ہوا
نکل آئیگا اور غبار کافور ہو جائیگا۔ پس نصرانی تمدن کی صورت آرائیوں نے اگر اسلامی تمدن
اور روحانی معاشرت کی حقائق پر تلبیس و کتمان کا غبار ڈال بھی دیا ہے۔ تو وہ اسلامی حقائق کی
لئے مضر نہیں بلکہ خود ایسی صورت آرا تمدن کیلئے فنا کا پیش خیمہ ہے اگر آج کی تمدنی جدتوں کو
حقیقت کشی کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے تو غور کرو کہ اس کی حقیقی مضرت کسے پہنچ رہی ہے؟
مسلمانوں کو یا عیسائیوں کو؟ ابتداء اور وسط کو چھوڑ کر انجام بینی کی چشم تیز سے دیکھو کہ اگر اس تصویری
قوم نے مسلمانوں کی اسلامی قوم کے بالمقابل مقاصد کی لائن چھوڑ کر وسائل محض اور خالص
رنگ و بو کی تنگ پٹیا اختیار کی یا مغز کو پھینک کر چھلکوں کو چبانا شروع کر دیا ہے تو صرف یہی
نہیں کہ انہوں نے حسن عاقبت اور خوبی آخرت ہی گنوا دی بلکہ جن تصویری وسائل کو مقصود ٹھہرا
لیا تھا انکی راحتوں سے بھی حقیقی طور پر منتفع نہ ہو سکے بلکہ ایسی ناقابل تلافی مضرتوں اور اذیتوں
میں مبتلا ہوئے کہ جنہوں نے روحانی ہی نہیں بلکہ حسی اور مادی چین بھی کھو دیا۔ کیونکہ روحانی
مقاصد سے بیگانہ ہو کر محض مادی منافع کے لاشوں کو سامنے ڈال لینا اور مردار پیکروں کی
آرائش و نمائش کرنا اُن کی واقعی گندگی اور تعفن کو جو بہت جلد اُبھر آتی ہے زیادہ دیر تک نہیں
چھپا سکتا۔ چنانچہ اُن کی سڑاند پھوٹنی شروع ہوئی اور باوجود اُوپر کی چمک دمک کے اندرونی خباثت
کھلی اور پھیل گئی پس اُن کی زبانیں تو چیختی ہیں کہ انہوں نے جدید تمدن و تہذیب سے آشنا بنا کر
عالم کو شاہراہ ترقی پر ڈالا ہے۔ لیکن انہی کے دل اُن سے برملا یہ کہلا رہے ہیں کہ انہوں
نے عالم کو ایک ایسے تنزل اور پستی کے غار میں ڈھکیل دیا ہے۔

نصرانی تمدن میں تہذیب اخلاق کی تباہی

کہ وہ عالم انسانیت کیلئے ننگ اور موجب شرم و عار ہے۔ کہ جس سے تہذیب اخلاق باقی رہی نہ تدبیر منزل اور نہ سیاست مدن بلکہ حکمت کے یہ تینوں ہی ستون گر پڑے جن پر انسانیت کی بلند پایہ اور سر بفلک عمارت کھڑی ہوئی تھی اس لئے ساری عمارت بھی آپڑی گویا بالفاظ دیگر اس نئے تہذیب و تمدن یا مادی زندگی نے انسان کو انسانیت سے نکالکر ڈھوروں اور ڈنگروں کے گلہ میں جا ملایا جس سے ان کی انسانیت ہی کا جوہر فنا ہو گیا۔ مادی تہذیب و ترقی کا یہ منحوس نتیجہ کسی مخالف کی زبان سے سننے کی ضرورت نہیں خود اسی تہذیب کے بانیوں اور تمدن کے پجاریوں کے اقرار و اعتراف سے سنو کہ ان کی ترقی نے انہیں بالآخر کہاں پہنچایا اور ان سے کیا کیا کہلوا کر چھوڑا؟ لندن کے مشہور پبلیشر مسٹر جارج ایلن اینڈ انون اپنی کتاب "تمدن" میں بعض مستند مؤلفین سے حسب ذیل حقائق کا اظہار کر رہے ہیں۔

تباہی اخلاص "موجودہ تمدن کا سارا لب لباب "منافقت" ہے لوگ اپنا عقیدہ ظاہر خدا پر کرتے ہیں" لیکن عملاً اپنی جانیں تک قربان مال پر کرتے ہیں۔ زبانوں پر آزادی کا دعویٰ رہتا ہے لیکن جو آزادی کے علمبردار ہوتے ہیں انہی کو سزائیں ملتی ہیں۔ دعویٰ مسیح کی پیروی کا ہے اور اطاعت مسولینی کی کی جارہی ہے۔ عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کئے جاتے ہیں لیکن عملی زندگیاں حرامکاری اور آتشک کیلئے وقف ہیں زبانی داد سچائی کی دیتے ہیں لیکن عملاً اقتدار و اختیار کی کرسیوں پر بد دیانتوں ہی کو بٹھائے ہوئے ہیں۔ زبانوں پر اخوت کے نعرے ہیں لیکن جو بھائی ان کی جنگ و طنیت یا قومیت کے بدمستانہ جلوسوں میں شریک نہیں ہوتے ان کے لئے پاگلخانہ ہے یا

بندوق کی گولیاں۔" (اخبار سچ لکھنؤ۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۳۰ء)

تباہی فہم | یورپ کا ایک مشہور فلاسفر برنارڈ شا اسی تہذیب کے انہی خاقیت سوز مفاسد اور مخرب اخلاق تمدن کا ماتم ان الفاظ میں کر رہا ہے۔ "تم سمجھتے ہو کہ ہم اگلے لوگوں کی نسبت بڑھ رہے ہیں اور دس ہزار سال آگے نکل چکے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم گھٹ رہے ہو اور یہ پستی اتنی ہے کہ اس حرکت نزولی کیلئے بیس ہزار سال کی مدت بھی کافی نہیں۔ ہم بڑھتے تو ہمارے دماغ اُن گذرے ہوئے لوگوں سے بڑے ہوتے۔ ہماری سمجھ اُن سے زیادہ صاف اور جچی تلی ہوتی بڑھتے تو پچھلوں کو اپنی طبیعت اور اُس کے فطری جذبات پر زیادہ قابو ہوتا پھر اگر ایسا ہوتا تو کینہ و بغض کے شعلوں میں ہم اس طرح نہ جلتے اور ہماری ہوسناکیاں جنوں کی حد تک نہ پہنچتیں۔ ہماری یہ جھوٹی بھوک ہم میں اُس ہیضہ کو نہ پھیلاتی جس میں ہم مبتلا ہو کر دم توڑ رہے ہیں اور جب ایسا ہے تو کس منھ پر یہ دعویٰ پھبتا ہے کہ پچھلے اگلوں سے آگے نکل گئے ہیں۔" (القاسم دیوبند۔ شوال ۱۳۴۳ھ)

انہی تمدنی مصائب کا رونا ایک امریکن دانشمند ان الفاظ میں رو رہا ہے۔

تباہی عفت و انسانیت | "ہم نے کیا کیا؟ تارپیڈو (تحت البحر کشتیاں) بنائیں زہریلے گیس اور ہوائی جہاز تیار کئے یہ تو باہر ہوا لیکن اندر کیا ہوا؟ ہم نے ہاں ہم نے ان آلات کے ذریعہ سے انسان کی صفت زندگی کی پرورش کی اور بنی آدم کی تباہی کے گویا ہم ٹھیکہ دار بن گئے۔ ہمارا سینما اور ہماری موٹر کاریں کیا ہیں؟ جرائم اور بدکاری

کی مبلغ (جس سے چوریوں میں بھی آسانی ہوتی ہے عورتوں کو بھگا لیجانے میں مدد ملتی ہے) فحش کاریوں میں اِن مخلوط مجامع سے کافی سہولتیں بہم پہنچ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج نہ مردوں میں عزت باقی ہے نہ عورتوں میں عفت۔ منزلی زندگی تباہ ہے۔ نہ آج کی آزاد عورتوں کو مرد کی پرواہ ہے نہ مرد کو عورت کی۔ دوست احباب کیلئے آج سب سے بڑا تحفہ بیوی اور بیٹی ہے اور عورت کیلئے سب سے زیادہ سرور کن نظارہ مرد کی نگاہ شہوت (القاسم شوال ۱۳۴۷ھ)

یہ تحریری شہادتیں خود انہیں کی ہیں جو اُس تہذیب و تمدن کے بانی اور موجد ہیں اُنہوں نے ان تصریحات میں امکانات سے بحث نہیں کی بلکہ واقعات سے ایک نے اِس تمدن کو "نفاق محض" بتلایا دوسرے نے "انسانیت کی انتہائی پستی" اور تیسرے نے "شہوتوں کی بستی" ظاہر ہے کہ ان مادی اختراعات اور نفسانی ترقیات کے بارہ میں جبکہ وہ اپنی ہی روحانی حقائق کے مقابلہ پر استعمال کیجائیں یعنی مادی نظام روحانیت کے فنا کرنے کے لیئے عمل میں لائی جائیں اُن کے موجدوں سے بڑھکر اور کس کی شہادت وقیع اور وزنی ہو سکتی ہے کہ وہ اُس کے اوّل و آخر کے تجربہ کار اور اُس کے آغاز و انجام پر اوروں سے زیادہ عبور رکھتے ہیں یہ شہادتیں اعلان کر رہی ہیں کہ اس بے روح نظام تمدن کے حسرتناک انجام اور ان اخلاقی پستیوں اور دناءتوں کے عبرت انگیز حشر نے اُنہی کے ایک سنجیدہ اخلاق دوست اور دور بین طبقہ کو آخر کار اظہار حقیقت پر مجبور کر دیا وہ تمدن کی گہرائیوں سے تنگ آکر ندامت کیساتھ کھڑا ہوا اور اُس نے واویلا کرتے ہوئے چاہا کہ اس مادی جدّ وجہد کی آگ کو جس نے روحانی اخلاق کا سارا ذخیرہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہے بجھائے لیکن چونکہ اسی تمدن کی عملی زنجیروں میں خود اُس کے دست و بازو بھی جکڑے ہوئے ہیں اسلئے وہ دیگر

پھر خاموش ہو جاتا ہے اور زمانہ کی ایک پلٹی کا منتظر ہے جو ایسی غیر طبعی رفتاروں کو ہمیشہ مشاق آئی ہے۔

ان تین فلاسفروں نے آخر اس تہذیب کا خلاصہ یا نتیجہ نفاق۔ شہوت۔ بدمستی اور دناءت اخلاق کہاں سے نکالا؟ اس کا جواب وہ واقعات دیں گے جنہوں نے تہذیب کے نام سے بدتہذیبی وحشت و بربریت بے حیائی اور بے غیرتی بہیمیت اور شہوت رانی کو ان متمدن انسانوں میں اس درجہ پھیلا دیا ہے کہ وہ حیوانوں اور بہائم کی حد تک پہنچ گئے اور بجز اس کے کہ ان کے انسانی شکل سے انہیں انسان کہدیا جائے اور کوئی وجہ انہیں انسان سمجھنے کی باقی نہیں رہی آج تہذیب دنیا کی انسانیت و تہذیب کا طغرائے امتیاز کیا ہے؟

تباہی حیا و حجاب۔ مثلاً یہ کہ مرد و عورت اور بچے بوڑھے جانوروں کی طرح برملا ایک دوسرے کے سامنے ننگے پھریں اور کھلم کھلا ایک دوسرے پر کتّوں اور خنزیروں کی طرح جست کریں۔ مدینہ اخبار لکھتا ہے۔

(۱) فرانس اور جرمنی میں مادر زاد برہنگی کا سلسلہ جاری ہے اس کے لئے باقاعدہ انجمنیں ہیں جن کے نام "انجمن علیہ برہنگی"۔ اور "ایوان فطرت" وغیرہ رکھے گئے ہیں ۱۹۲۶ء تک ان انجمنوں کے ارکان چار ہزار تھے جنمیں عورتیں بھی بکثرت شریک ہیں لیکن ۱۹۲۹ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ جرمنی میں اس کے ارکان چالیس ہزار تک پہنچ چکے ہیں۔ ان ایوان فطرت کے انتہا پسند مرد و عورت اور بچے بوڑھے اعلان کر چکے ہیں کہ وہ بالکل ننگے رہا کریں گے۔ (انتخاب از مدینہ۔ بجنور ۹ مئی ۱۹۲۹ء)

تباہی غیرت | (۲) "جو لوگ حیا کو خیرباد کہہ کر لباس ہی اُتار کر پھینک چکے ہیں انہیں بیغیرتی کے ناپاک مشاغل سے کون روک سکتا ہے؟ چنانچہ عصمت فروشی اور حرامکاری کی جو کثرت اور ہمہ گیری اس دور تمدن میں ہے اُس کی نظیر قرون ماضیہ کے بُرے سے بُرے زمانہ میں بھی ملنی دشوار ہے۔ لندن جیسے گہوارۂ تہذیب و تمدن کے صرف ایک تفریح گاہ ہائیڈ پارک میں دن دہاڑے پولیس نے صرف ایک سال میں بیحیائی کے ۲۲۵ حرامکاری کے ۱۳۶۹ اعانت جرم بالا کے ۳۶ دستانی کے ۲ برہنگی کا ایک زنا بالجبر کا ایک حملہ مجرمانہ کے ۱۲ اور توہین کے ۵۶ مجرم پکڑے جنکی میزان ۱۷۹۲ ہوتی ہے۔" (سچ - ۱۰ جولائی ۳۰ء)

یہ صرف ایک شہر کی تفریحگاہ کا ایک سالہ مآل ہے دوسرے شہروں کا اور پھر لندن جیسے غدار شہر کے دوسرے عام اجتماعی مقامات کا خود اندازہ کر لیا جائے۔ اور جبکہ ان کھلی ہوئی عام تفریحگاہوں اور سڑکوں پر اس کھلم کھلا بیغیرتی کے اعداد یہ ہیں تو خیال کر لیجئے کہ چھپے ہوئے مقامات، ہوٹلوں، بدمعاشوں کے اڈوں، تہ خانوں وغیرہ میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔

علانیہ بدکاری | (۳) "باوجودیکہ لندن میں قانوناً کسی عورت کو عصمت فروشی کا حق حاصل نہیں مگر ایک ذمہ دار میم صاحبہ تحریر کرتی ہیں کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۸ء تک تین سال کے اندر لندن میں عصمت فروشی میں بیس ہزار عورتیں گرفتار ہوئیں یہ وہ احمق عورتیں تھیں جنہوں نے پولیس کو گرفتاری کا موقع دیا ورنہ لاکھوں ایسی نیک بخت بھری پڑی ہیں جنکی عمریں اسی شغل میں بسر ہو گئیں اور پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" (انقلاب یکم جولائی ۳۰ء)

رسالہ محشر خیال دہلی ماہ جون ۱۹۳۵ء میں ایک انگریز مسٹر ٹیلر گرافٹ ساکن لندن کا مضمون

کے چند اقتباسات بعنوان "مدعیانِ تہذیب کے بے نقاب چہرے" شائع کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۴) "لندن شہر میں عام بے عصمتی سے قطع نظر کرکے اِن مخصوص پیشہ وروں کی تعداد جو باضابطہ لائسنس لئے ہوئے علانیہ اور خاموشی سے اِسی پیشہ کو کر رہی ہیں ۳۰ ہزار ہے۔" (محشر خیال جون ۱۹۲۵ء)

(۵) جان بل لکھتا ہے کہ نیویارک میں اس وقت چالیس ہزار بازاری عورتیں موجود ہیں اس تعداد میں وہ لڑکیاں داخل نہیں ہیں جنہوں نے اپنے گھروں ہوٹلوں اور دوسرے پبلک مقامات میں رفاہ عام کا کام جاری کر رکھا ہے حساب لگا کر دیکھا گیا ہے کہ نیویارک میں تقریباً ہر دس میں ان عورتوں میں ایک بازاری رنڈی ہے۔ اور اندازہ کیا گیا ہے کہ خاص شہر نیویارک میں یہ بازاری عورتیں سال بھر کے اندر ۰۰،۷۰،۳۰،۵ لاکھ مردوں کے ہاتھ اپنی متاعِ عصمت کو فروخت کرتی ہیں گویا دن بھر میں ۱۸۰،۱۵ مرد بازاری عورتوں کو استعمال کرتے ہیں جس سے تمام امراضِ خبیثہ کے شکار ہیں۔" (انقلاب۔ یکم جولائی ۱۹۲۹ء)

تمدن جدید اور مادی روشنی کے فرائض میں سیہ کاریوں کا روکنا نہیں بلکہ اس راہ میں تمامی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ "سالویشن آرمی" جو کہ خدمتِ خلق اور قومی خبرگیری کے نام پر ایک جماعتی نظام ہے اُس کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ جن ماؤں کو ناجائز بچے جننے میں دشواریاں پیش آتی ہیں اُن کے لئے زچہ خانہ کا انتظام کرے۔ اِس مشن کی ایک رپورٹ کے حوالے سے نیویارک کا ایک سالہ میڈیکل کرانک اینڈ گائیڈ بابت ۱۹۲۸ء لکھتا ہے جس کا اقتباس فارورڈ کلکتہ میں شائع ہوا ہے۔

(۶) "آج سے بیس سال قبل ان زچہ خانوں کی آبادی پختہ عمر کی عورتوں سے قائم تھی جو ہر طرح سوچ سمجھ کر بدکاری اختیار کرتی تھیں لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے اب ان زچہ خانوں میں

بڑی تعداد نوعمر طالبات علم اور اُن کمسن لڑکیوں کی آنے لگی ہے جنکے دن ماں بننے کی بجائے اسکول میں حاضری دینے کے ہوتے ہیں آخری اعداد کے مطابق اُن کی تعداد ۴۲ فیصدی ہے اِن لڑکیوں کا اوسط عمر ۱۶ سال ہے" (سچ - مختصراً ۱۳؍ جولائی ۱۹۳۶ء)

یہ تعداد اُس ملک کی ہے جہاں منع حمل (برتھ کنٹرول) کے بیشمار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں اور جہاں بلاقصد ماں بننا تقریباً غیر ممکن ہو گیا ہے گویا آوارگی کے سو دو سو واقعات میں سے کہیں ایک آدھ ہی کو اُن زچہ خانوں میں جانے کی نوبت آتی ہو گی۔

(۷) ابھی قریبی ستین کے اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ "شہر گلاسگو کے کالج میں پڑھنے والی طلبا کی اعانت کیلئے وہاں کی دوشیزہ بے نکاحی لڑکیوں نے اعلان کیا کہ ہم شاہراہوں اور سڑکوں پر چھ شلنگ میں اپنے بوسے فروخت کریں گے۔ اِس اعلان پر سینکڑوں من چلے نوجوان شلنگوں سے جیبیں بھر کر سڑکوں کا طواف کرنے لگے اور سینکڑوں پونڈ ان نازنینوں کے بوسوں کی بدولت کالج کو حاصل ہو گئے"!

کس قدر غیور وہ مرد ہوں گے جنھوں نے اپنی کنواریوں کی یہ پاک کمائی کھائی اور کس قدر غیرت دار وہ لڑکیاں تھیں جنھوں نے کالج کی ہمدردی میں اپنے حسن کو ان سستے داموں میں نیلام کر دیا۔

(۸) لندن میں دوشیزہ لڑکیوں کی انجمنیں ہیں جو عہد کرتی ہیں کہ ہم نکاح نہیں کریں گے۔ ہاں عشق بازی اور دوستی و آشنائی کے تعلقات اُن کے اُصول و قوانین کے خلاف نہیں ہیں

شہوت رانی کا جنون

(۹) پھر شہوت رانی کی یہ بے تحاشا بھوک اور خواہشات نفسانی کا یہ استغراق ضرورت یا محض خواہش کی حد تک نہیں رہا بلکہ جنون اور دیوانگی کی حد تک پہونچ چکا ہے۔ اور اب اُن

شہوت پرستوں کو اپنی شہوت رانی کے سلسلہ میں عورت مرد بلکہ انسان اور حیوان کی بھی کوئی تمیز باقی نہیں وہی ٹیسلر گرافٹ لکھتا ہے۔

"مردوں کیطرف میل رکھنے والے مردوں کے باضابطہ کلب ہیں سوسائیٹیاں ہیں اور اُن کے ارکان اور سرپرست بازار کے شہدے اور لفنگے نہیں بلکہ اسکولوں کے ماسٹر گرجوں کے پادری اور اسکاؤٹ ماسٹر حضرات ہیں یہ اپنے مرتبے اور اقتدار سے فائدہ اُٹھا کر کمسن لڑکوں کو پھانستے رہتے ہیں۔" (مختصر خیال دہلی - جون ۱۹۳۶ء)

آگے سحاق کے متعلق لکھتا ہے۔

"صنف نسواں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے جو عورتیں عورتوں کی طرف میل رکھتی ہیں وہ بدبختی سے زیادہ تختۂ مشق اپنی قریب ترین عورتوں ہی کو بناتی رہتی ہیں اور ایسیوں کی تعداد خطرناک حد تک زائد ہے۔" (مختصر خیال دہلی - جون ۱۹۳۶ء)

یہاں تک تو پھر انسانوں تک بس تھی۔ آگے جانوروں سے شہوت رانی کے متعلق لکھتا ہے۔

"خواہش نفسانی کے پورا کرنیکے لئے انسان کے بجائے جانوروں کا استعمال ایک ایسی حیوانیت ہے کہ جس سے مذاق سلیم کو استفراغ ہونے لگتا ہے۔ یہ خاص گندگی فاعلی حیثیت سے مردوں میں تو کم ہے مگر متعدد ڈاکٹروں نے جن میں سے دو کی پریکٹس اعلیٰ گھرانوں میں ہے مجھ سے زور دیکر بیان کیا کہ اس حرکت خبیثہ کا وجود صنف نسواں کے اعلیٰ گھرانوں میں زیادہ ہے جو خاص قسم کے کتے اسی غرض سے پالے رہتی ہیں۔"

"ہائیڈ پارک کے قریب ایک کتا خانہ خاص اسی غرض سے ایک عورت نے کھول رکھا تھا جس میں

وہ کتوں کو بھی کام کے لئے سدھاتی تھی۔" (محشر خیال دہلی۔ جون ۳۵ء)

ضعف رجولیت اور امراض | ان خبیث حرکتوں اور بد نفسیوں کا پیدا ثمرہ بدنی ضعف قوت رجولیت کا فقدان اور مختلف امراض کا ہجوم ہے۔ چنانچہ انقلاب پرپورٹن سے نقل کرتا ہوا لکھتا ہے

"مردمیت کی ڈینگ مارنے والوں کا حال ملاحظہ ہو جن کی حسین عورتیں قابل اور مردمیت رکھنے والے شوہروں کی تلاش میں دربدر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مگر وہ شوہر نہیں ملتے جنہیں رجولیت رہ گئی ہو۔ ایسی عورتیں جرمنی میں فی ہزار ۶۵ ہسپانیہ میں فی ہزار ۴۳ بلقان میں فی ہزار ۵۰ سوئیٹزرلینڈ میں فی ہزار ۵۶ انگلستان میں فی ہزار ۵۹ فرانس میں فی ہزار ۶۰ جنوبی امریکہ میں فی ہزار ۵۹ ہیں۔" (انقلاب لاہور۔ جلد ۳ نمبر ۳)

دماغی تباہی | ان فحش کاریوں اور شہوت رانیوں کی افراط کا اثر ناممکن تھا کہ دماغ قبول نہ کرے۔ بلکہ یہ آثار پہلے دماغ ہی کو بیکار کرتے ہیں۔ نیو ایج دی ورلڈ لنڈن، اکتوبر ۱۹۳۲ء رقمطراز ہے۔

"فتور عقل و دماغ کے سبب دیوانگی کے مریضوں کی تعداد پچھلے چھ سال تعداد ۴۵۷۰ ہزار سے ترقی کرکے ۶۱۵۲۲ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اور سال رواں کے شروع میں ۱۳۸۲۹۳ لاکھ تک ہو چکی ہے۔" (اخبار سچ۔ ۹ نومبر ۱۹۳۵ء)

ضعف بصارت | پھر دماغی قویٰ میں بھی خصوصیت سے ایسی عیاشیوں کا اثر نگاہ پر زیادہ ہوتا ہے چنانچہ ان متمدنوں کی قوت بصارت کا حال پانیر ۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء لکھتا ہے۔

"تازہ اعداد و شمار مظہر ہیں کہ آج سے بیس سال قبل برطانیہ عظمیٰ میں پچاس لاکھ انسان عینک لگاتے تھے اس سال ان کی تعداد اسی اور نوے لاکھ تک پہنچ گئی ہے گویا آبادی کا ہر پانچ آدمیوں میں

ایک عینک کا محتاج ہے۔ ضعیف البصروں کی روز بروز ترقی ہو رہی ہے (سچ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء)

بعد کی دوسری رپورٹ یہ ہے۔

"پانچ آدمیوں میں ہر دس افراد میں چار ضرور عینک لگاتے ہیں۔ اور دو کو اور بھی لگانے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور ۴۵ برس کے بعد تو تقریباً ہر شخص عینک کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اس پر ماہرین کا اتفاق ہو چکا ہے کہ برطانوی آبادی کی بصارت روز بروز گھٹ رہی ہے لیکن دنیائے تمدن میں برطانیہ ہی اس باب مقدم نہیں ہے امریکہ میں ضعیف البصروں کی تعداد برطانیہ سے زیادہ ہی ہے اور جرمنی کا نمبر سب سے ہی بڑھا ہوا ہے"۔ (سچ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء)

بہرحال تہذیب نفس کے سلسلہ میں متمدن یورپ اور صورت پسند عیسائیوں نے روحانی حقائق کو فنا کرنے کے لئے جو مادی کارنامے پیش کئے ہیں اور دنیا کو تہذیب کا نام لیکر ان کی طرف بلایا ان ہزاروں میں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے یہ چند امور ذکر کئے گئے ہیں جو خود انہی کے زبان و قلم کا ثمرہ ہیں۔ روحانی دائرہ میں تو ان کارگزاریوں کا اثر یہ ہے کہ یورپ کے نفوس کی روشنی بجائے حیا و غیرت، عفت و عصمت، تقویٰ و طہارت اور ضبط نفس کے بے حیائی، بے غیرتی، بدکاری، شہوت رانی اور نفسانی غلاظتوں سے حاصل ہونے لگی اور مادی اثر یہ ہوا کہ مرد نامرد ہو گئے۔ امراض کا مخزن بن گئے دماغوں میں فتور آگیا۔ آنکھوں سے اندھے ہو گئے جس کا انجام یہ نکلا کہ نہ روح کام کی رہی نہ جسم ہی کارآمد ہوئے۔ اور بالفاظ دیگر نہ عقبیٰ ہی ہاتھ لگی نہ دنیا ہی درست ہوئی۔ بقول میر (بتصرف یسیر) ع

"انہیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے"

ان تھک عیاشیوں سے تدبیر منزل کی بربادی پھر اِس قسم کی تہذیب کا قدرتی انجام یہی ہونا تھا کہ جس طرح تہذیب نفس بداخلاقیوں سے برباد ہوئی تھی اُس سے کہیں زیادہ تدبیر منزل اِن بداعمالیوں سے تباہ ہو جائے چنانچہ ہو گئی۔

کیا نامرد خانگی زندگی استوار رکھ سکتے ہیں؟ کیا عیاشوں کی بیویاں اُن کی پاورہ بیوں کے ہو سکتے ہیں؟ کیا اندھے کمزور ضعیف الدماغ اور فاقد مردمیت انسان معیشت منزلی میں صنفِ نسواں کی حقیقی مسرتوں کا سہارا ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِن متمدّن شہروں میں گھریلو زندگی کا پتہ نہ رہا۔ ہوٹلوں کی کوٹھریاں اُن کے گھر ہیں۔ ہرجائی عورتیں اُن کی ازواج ہیں۔ بازاروں کی میل ملاقات اُن کی معاشرت ہے۔ موتیں دیکھنے کی ہنسی اُن کی خوشی ہے۔ اور بناوٹ سے دانت کھول دینا اُنکا اخلاق ہے۔ اِس لئے نہ خاوند کو بیوی سے واسطہ ہے نہ بیوی کو خاوند سے رابطہ نہ اخلاص باہمی ہے نہ آپس داری اور یگانگت۔ بلکہ بیوی محض شہوانی اغراض پورا کرنے کا ایک آلہ ہے اِس لئے جب تک جذبات شہوت جوش پر ہیں رشتۂ زوجیت بھی قائم ہے اور جب مزاجی خامی ہو گئی یا یہ اغراض نفسانی کسی دوسرے ذریعہ پورے ہونے لگیں جب ہی زوجین میں منافرت پیدا ہو کر تفریق کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور طلاقوں کی بھرمار ہونے لگتی ہے۔

<u>طلاقوں کی بھرمار</u> اِسی لئے یورپ و امریکہ میں طلاقوں کی بھی حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں

اٹلانٹکا میں۔ ۵۳۵،۲ شادیاں ہوئیں اور ۱۸۴۵ طلاق واقع کی گئیں

لاس انجلیس میں۔ ۱۶۶۰۵ 〃 ۷۸۸۴ 〃

کناسس میں۔ ۳۸۴۰ 〃 ۲۳۰۰ 〃

اوہیو میں ۵۳،۳۰۰ شادیاں ہوئیں۔ اور ۵۸۸۵،۱۰ طلاق واقع کی گئیں۔

ڈینور میں ۳۰۰۰ ″ ۱۵۰۰ ″

کلولینڈ میں ۱۰،۱۳۲ ″ ۵،۲۵۹ ″

گویا طلاق کا اوسط بعض جگہوں میں ۵۰ فیصدی اور اس سے بھی زائد تک پہنچ گیا ہے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ عورتوں میں ہر سیکڑے میں نصف سے زائد طلاق خوردہ بیوائیں ہیں۔

(الامداد دہلی ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء)

یہ اُن دلفریب شادیوں کا انجام ہے جنہیں دانشمند اور متمدن ماں باپ نے اولاد کو بھاڑ میں نہیں جھونکا بلکہ ترقی اور تہذیب کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا نکاح کورٹ شپ کے قاعدہ کے مطابق خوب دیکھ بھال کر کیا تھا یہ اُن غیر مہذب اور بیوقوف مشرقی ماں باپ کے کئے ہوئے نکاح نہیں جو اس تمدنی چمک دمک سے بے بہرہ رہکر نکاح کے فرائض انجام دے لیتے ہیں اور شاید اسی لئے دیسی ممالک میں اپنے قدیم سادہ تمدن کے معیار پر محض بھائی بندی اور آپس داری سے طلاق کا اوسط فی ہزار ایک بھی نہیں پڑتا اندریں صورت شاید اس تہذیب و تمدن سے یہ بربریت ہی ہزار درجہ بہتر ہو اس لئے یہ مہذب نکاح اور اُن پر بے انتہا طلاقوں کے تلخ پھل مغربی متمدنوں ہی کو مبارک ہوں۔

آوریگن ڈیلی جرنال امریکی اخبار جو ویگت پورٹ لینڈ سے شائع ہوتا ہے لکھتا ہے۔

"۱۹۲۷ء میں امریکہ کی عدالتیں طلاق کے مقدمات میں اس طرح مشغول تھیں کہ انہیں کسی دوسرے مقدمہ کیلئے فرصت تک نہ تھی۔ اس قسم کے مقدمات کی تعداد اس سے ایک سال کے بعد

۸۴ - ۱۱ نامرد ہوگئی ‘‘ (ہمدرد دہلی - ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء)

بہرحال اس سے یورپ کی خانگی معیشت اور تدبیر منزل کی حیثیت پر پوری روشنی پڑ جاتی ہے کہ تمدن نے اُس کو کونسی ترقی کے زینے کو دلمئے ہیں؟

تدابیر منع حمل کا جوش وشغف

پھر اس عیاشی کے جوش میں مرد تو نامرد ہوئے ہی تھے لیکن عورتوں کیلئے برتھ کنٹرول (منع حمل) کے نسخے بھی تیزی کیساتھ اختیار کئے جانے لگے۔ اس لئے متمدن ممالک کی منزلی زندگی کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ عیاشیوں کی بدولت مردانہ آبادی کا جو حصہ نامرد ہوچکا ہے اُس کی عورتیں تو مردوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور جو ابھی نامرد نہیں ہوا وہ ان تھک عیاشی میں لگ کر اپنی بیویوں سے بیزار ہے اور طلاقیں دیکر انہیں گھروں سے نکال رہا ہے اس لئے یہ مطلقہ عورتیں بھی مردوں سے فارغ ہیں۔ پھر جو طبقہ اپنی بیویوں سے نباہ بھی کر رہا ہے تو عورتوں کو منع حمل کے نسخے پلا پلا کر۔ اس لئے اُس کی عورتوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اور ظاہر ہے کہ جب زن و مرد کا واسطہ ہی قائم نہ ہوپایا ہو تو بیکاری اور نامرادی کیساتھ تو اُس کا قدرتی نتیجہ اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ انسانی پیداوار کی شرح گھٹنے لگے چنانچہ یہی ہوا۔ پانیر ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء لکھتا ہے۔

پیدائشوں کی کمی

’’فرانس کی سرکاری کونسل (چیمبر آف ڈپوٹیز) کے ایک ممبر نے ۲۹ نومبر کو اپنی مدلل اور مفصل تقریر میں بیان کیا کہ فرانس کی آبادی جس تیز رفتاری کے ساتھ گھٹ رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ کچھ ہی روز کے بعد ملک میں نہ فوج کیلئے سپاہی ملے گا۔ نہ جہازرانی کے لئے کوئی ملاح اور نہ جوتنے کیلئے کوئی کاشتکار (اس تقریر کا حوالہ دے کر ایک اطالوی مضمون نگار جو غالباً مسولینی ہے ایک اطالوی رسالہ میں لکھتا ہے کہ خود اطالیہ

کیا حال ہے؟ ۱۹۲۵ء میں جتنی ولادتیں ہوئیں وہ ۱۹۲۴ء کے مقابلہ میں بقدر ۲۹ ہزار کم ہیں اگر اسی شرح سے آبادی گھٹتی رہی تو جو حال اسوقت فرانس کا ہے وہی بلکہ اُس سے بدتر اٹلی کا ہو کر رہے گا...... اور کیلئے اٹلی پر موقوف نہیں فرانس اور جرمنی بلکہ یورپ کے سارے ہی مغربی علاقوں کا حال یہ ہے کہ دیہات اُجڑتے جاتے ہیں دیہات کی ساری آبادی کھنچ کھنچکر بڑے بڑے شہروں میں چلی آرہی ہے اور یہ شہری آبادی اپنی نسلی اور قومی خودکشی میں پیش پیش ہے۔" (اخبار سچ - ۱۴ فروری ۱۹۳۰ء)

خُلاصہ یہ ہے کہ تمدّن کے مالکوں نے وسائل تمدّن میں منہمک ہو کر جس طرح تہذیب نفس کو تباہ کیا اور طرح طرح کی بداخلاقیاں اور اُن کے نتائج بد اپنے سر لئے اسی طرح تدبیر منزل اور خانگی معیشت کو بھی برباد کر کے طرح طرح کی ناپاک بداعمالیوں اور بدحالیوں کا مخزن بن گئے۔ اس لئے تہذیب و شائستگی کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت خود انہی کے اعمال و اقوال سے واضح ہو گئی۔

سیاست مُدن کی پول! اب تیسرا جزو سیاست مُدن ہے جس کے تحت میں ملکی انتظامات حفظان جان ومال - اَمن عامہ - مُلکی سکون - قومی تعلیم و تربیت - صنعت و حرفت اور آسودگی و خوشحالی وغیرہ کے تمام ابواب آجاتے ہیں - مادی اقوام نے جہاں اپنی تہذیب و تدبیر اور حسن معاشرت کے آوازوں سے گنبد عالم کو گونجا دیا تھا وہیں سیاست دانی اور حسن سیاست کی بلند بانگ دعووں سے بھی شور و شور برپا کر رکھا ہے لیکن ہر چیز کی کامیابی و ناکامی اُس کے اچھے بُرے نتائج کے معیار سے تسلیم کیجاتی ہے کہ مجرمانہ وارداتیں نہ ہوں یا کم ہوں مہلک حوادث کم سے کم پیش آئیں اس لئے ہم بھی یورپ کی عام سیاسی چالوں کی خوبی و خرابی کو اُس کے نتائج کے ذریعہ باور کرنا چاہتے ہیں۔

تمدّن جدید کے وہ چمکتے ہوئے سنہری آثار جنھوں نے دُنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے یا موجودہ حکومتوں کی نہایت ہی شاندار روایات جن کو آج کی زبان میں قومی ہمدردی۔ ایثار۔ اخوت۔ مساوات۔ عدل۔ رفاہ عام وغیرہ کے خوشنما عنوانوں سے سراہا جا رہا ہے کیا ہیں؟ اور امن عامّہ اور حسنِ معاشرت کے کہاں تک کفیل ہیں؟

کثرت جرائم | صداقت کیساتھ جہانتک غور کیا گیا ہے اُس کی حقیقت یہ نکلتی ہے کہ موجودہ سیاست کے زیر اثر جسقدر تمدّن ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر جرائم مجرمانہ وارداتوں مہلک حوادث اور قتل عالم واقعات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور دُنیا تباہی کے کنارہ لگتی جاتی ہے۔ چنانچہ خود متمدن آبادیوں میں جہاں اِس تمدّن کا اثر زیادہ ہے اُسی قدر تباہی اور بربادی بھی زیادہ ہے۔ تمدّن کا سب سے بڑا گہوارہ اور سنٹر، امریکہ ہے جس کی مادی ایجادات دنیا کو ورطۂ حیرت میں غرق کئے ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق روزنامہ ڈیلی ٹیلی گراف ۸ اگست ۱۹۲۶ء بیان دیرہا ہے

ڈاکہ و قتل کی بہتات | "لندن میں لٹجانے والے اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں پڑجانے کے جتنے احتمالات ہیں نیویارک میں اُن سے ۳۶ گنا زائد ہیں۔ اور شکاگو میں یہ امکانات سو گنا بڑھ گئے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی شعبہ فن تحقیقات جرائم (کرنل ریسرچ) کے پروفیسر ڈاکٹر آگسٹ وولنر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سال گذشتہ امریکہ میں صرف ایکسالہ جرائم کی تعداد حسب ذیل رہی۔

قتل ۱۲۰۰۰ ہزار، ڈاکہ ۱۰۰۰۰۰ لاکھ، چوری اور نقب زنی ۵۰۰۰۰۰ لاکھ،

حتی کہ ۱۹۲۶ء میں امریکہ میں محکمہ جرائم ۲۰ ارب روپیہ صرف ہوا اور اسپر بھی پولیس کی مقدار

کم خیال کیا گیا جس سے حکومت کو آدمی اور روپیہ بڑھانے کی فکر لاحق ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے جولائی ۱۹۲۶ء میں امریکہ کی اس تہذیب جدید پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"سال بسال قتل کی جو خوفناک وارداتیں سرعت کیساتھ ترقی کر رہی ہیں وہ ہماری امریکن تہذیب پر ایک بدنما داغ ہیں جرائم کی نوعیت روز بروز پیچیدہ ہوتی گئی ہے جس سے سراغ رسانی مشکل ہوتی جاتی ہے ۱۹۲۶ء میں تو محض قتل ہی سے خوفناک ہوئے کہ جن کی نظیر جرائم کی تاریخ میں ملتی محال ہے"

چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۶ء تک قتل کے اعداد و شمار کا جو نقشہ دیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ جیسے گہوارۂ تہذیب و تمدن کے صرف ۳۰-۲۵ شہروں میں ۷ برس کے عرصہ میں ۴۳۳۰۴ قتل ہوئے۔

یہ اعداد و شمار کسی مخالف کے الزامات نہیں بلکہ خود حکومت امریکہ کے بٹھائے ہوئے کمیشن کے پیش کردہ ہیں جس کو تحقیقات کے لئے باضابطہ مقرر کیا گیا تھا اور جن کو ۴ اگست ۱۹۲۹ء میں روزنامہ ڈیلی ٹیلی گراف لندن نے شائع کیا۔

جہاں چوریوں کے اعداد و شمار لاکھوں تک ہوں قتل نفوس کی مقدار لاکھوں سے متجاوز ہو ڈاکہ زنی کی تعداد لاکھوں سے کم نہ ہو اس ملک کے امن عامہ اور تہذیب نفس کی کیا انتہا ہو سکتی ہے؟ اور ایثار و ہمدردی کا کیا ٹھکانا۔ اور پھر جہاں انسانی صورتوں کے لیے درندوں اور بھیڑیوں کو صحیح معنی میں مہذب انسان باور کرایا جائے وہاں کی ایثار و ہمدردی ہی کا نہیں بلکہ

عقلمندی اور دانش کا بھی کیا ٹھکانا ہے۔ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

اسلحہ جدید اور ہلاکت حاثات | یہ صرف ایک سال ہی متمدن اور مایہ ناز ممالک کے جرائم کی چند سالہ فہرست ہے بقیہ یورپ میں تہذیب و تمدن کے نام سے کیا ہو رہا ہے؟ خود ہی اندازہ کر لینا چاہیئے۔ ع

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

پھر سائنس کی روز افزوں ترقیات نے جنگ عمومی میں ان متمدن سلطنتوں نے اپنی تمدن کے سنہری آثار سے بنی نوع انسان کی کیا خدمت انجام دی؟ سو اسلحہ جدیدہ کے بل بوتہ پر تہذیب جدید کا سب سے بڑا مظاہرہ جنگ عمومی میں ہوا اس جنگ میں انسانی آبادیوں پر متمدن اور مہذب انسانوں کی دماغی روشنیوں کی بدولت جو آفتیں آئی ہیں انکا خلاصہ اخبار مدینہ بجنور ۱۷ نومبر ۱۹۳۶ء حسب ذیل نکلتا ہے کہ

اتحادی طاقتوں روس۔ فرانس۔ برطانیہ۔ اٹلی۔ امریکہ۔ جاپان۔ رومانیہ۔ سروبیہ۔ بلجیم۔ یونان۔ پرتگال۔ مانٹی نگرو کی کل فوج چار کروڑ اکیس لاکھ اٹھاسی ہزار آٹھ سو دس (۴۲۱۸۸۸۱۰) میں سے اکیاون لاکھ ستاون ہزار تین سو پندرہ (۵۱۵۷۳۱۵) انسان قتل ہوئے۔ ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ اکتیس ہزار چار (۱۲۸۳۱۰۰۴) زخمی ہوئے دو اکتالیس لاکھ اکتالیس ہزار نوے قیدی اور لاپتہ ہو گئے۔ ادہر اتحادیوں کے بالمقابل جنگ کی مرکزی طاقتوں جرمنی آسٹریا ہنگری ترکی بلغاریہ کی کل فوج ۲۲۸۵۰۰۰ میں سے ہلاک شدہ اور مجروحوں کی تعداد [illegible] ہوتی ہے اور اس طرح مجموعی حیثیت سے اتحادیوں اور ان کے بالمقابل مرکزی طاقتوں کے ۱۵ اشخاص جنگی تباہی کا شکار ہوئے

۳۰.۴۹۹۳۸۶ کروڑ ہو جاتے ہیں جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ سو میں ۵۷ء۶ ہلاکت شدہ ہوئے اور سائنس نے سائنس دانوں ہی کی بھری بھرائی آبادیوں کا نصف سے زیادہ حصہ ختم کر دیا اور ابھی تک بھی سائنسی ترقیات کی یہ بڑھتی ہوئی رَو اور مدعیان امن و صلح کی یہ مہذبانہ تگ و تاز محض اتنی ہی سی بربادی پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا اب بھی برابر مہلک آلات کی ایجاد اور فنا خیز سامانوں کی فراہمی تندہی کے ساتھ جاری ہے مسٹر اسنوڈن وزیر خزانہ برطانیہ نے اپنی سنہ ۱۹۳۰ء کی تقریر میں بتلایا ہے کہ مہذب دنیا آج بھی محکمہ جنگ پر نوّے کروڑ پونڈ (یعنی تقریباً ۱۲- ارب روپیہ ہر سال صرف کر رہی ہے اور صرف برطانیہ کے مصارف محکمہ جنگ روزانہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار پونڈ ہیں۔ گویا فی منٹ ایک ہزار پونڈ ہوتا ہے۔ (سچ لکھنؤ ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء)

پس جو تمدن ہر ہر منٹ پر جنگ اور قتل غارت کی تیاریوں میں تیرہ تیرہ ہزار روپیہ صرف کرتا ہو اس کی سیاست مدن کی خوبی کا کیا ٹھکانا ہے؟ آج تک بیچارے چنگیز اور ہلاکو نیز یزید اور حجاج نیرو اور ہنیبال ظلم و ستم خونریزی اور سفاکی میں اپنی مثال آپ ہی سمجھے جاتے تھے۔ مگر شاید اس لئے کہ یورپ کے مہذب دنیا کے منظر عام پر نہ آئے تھے۔ لیکن آج یورپین مظالم کے اعداد و شمار سامنے آجانے کے بعد ان گذشتہ ظالموں کے ظلم و ستم محض طفلانہ اور بچگانہ حرکتیں نظر آتی ہیں۔ اگر وہ لوگ یورپ سے سبق لیکر ظالمانہ کارروائیوں کا آغاز کرتے تو اس باب میں کچھ ترقی یافتہ کہلائے جا سکتے تھے۔

سائنٹفک آلات سے دنیا کی تباہی | بہر حال یورپ کی مادی ترقی نے خود یورپ ہی کا نصف سے زیادہ حصہ

ختم کر دیا ہے۔ بقیہ کم از نصف حصہ کے مصائب جو سائنس ہی کے مایہ ناز آثار۔ موٹروں، بسٹیلوں کارخانوں۔ ریلوں۔ ہوائی جہازوں برق اور گیس وغیرہ کے ذریعہ واقع ہوتے ہیں اعداد میں کسی طرح اُن مذکورہ آثار سے کم نہیں ہیں بلکہ بدرجہا زائد ہیں۔

ڈیلی ٹیلی گراف ۴ اگست ۱۹۲۸ء لکھتا ہے

امریکہ جیسے گہوارۂ تمدن و تہذیب میں ۱۹۲۷ء میں موٹروں سے کچلکر ہلاک ہونیوالوں کی تعداد ۲,۰۵,۰۰۰ لاکھ ہے اور اُن زخمیوں کی جنہیں ہسپتال پہنچایا گیا ۵,۰۰,۰۰۰ لاکھ ہے

رسالہ شینہ سنچری مئی ۱۹۲۷ء صفحہ ۹۳۳ لکھتا ہے

صرف برطانیہ کے وہ زخمی جو زمانہ جنگ عمومی میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک ہوئے ۱۶,۹۳,۲۶۲ لاکھ تھے مگر زمانہ امن میں اسی محدود مدت کے زخمی جو سائنس کے دوسرے حادثات سے مجروح ہوئے ۲۳,۸۵,۷۶۶ لاکھ ہوتے ہیں یعنی جنگ یورپ کے بعد سات سال کے اندر برطانیہ کے ۲۰۲۶۳ ہزار آدمی کارخانوں اور کانوں وغیرہ میں مرے اور ۲۰۵۸۳۱ لاکھ آدمی زخمی ہوئے اِن زخمیوں کیلئے امدادی فنڈ کھولا گیا ہے بہت سے سائنس داں رات دن کام کرتے ہیں لیکن حادثات کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے جاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ میں ہر روز ساڑھے آٹھ سو آدمی زخمی ہوتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ برطانیہ میں ہر دس منٹ پر پانچ آدمی ان مادی اختراعات کی بدولت زخمی ہو جاتے ہیں۔

موٹروں سے بربادی ۱۹۲۶ء میں خاص شہر لندن میں سڑکوں پر موٹروں وغیرہ سے ۳,۰۰۱ ہزار

مہلک حادثے پیش آئے جن سے معلوم کتنے افراد ہلاک ہوئے ہوں گے اور ۳۶۰۳۶
ہزار غیر مہلک رہے جن سے خدا جانے کسقدر تعداد زخمی ہوئی ہوگی۔ ملک انگلستان اور ویلز
کی سڑکوں پر اس سال ۴۳۰۰۷ ہزار مہلک حادثے پیش آئے اور ۱۱،۲۱،۷۰۲ لاکھ غیر مہلک۔

عام گاڑیوں کے حوادث | نیوز آف دی ورلڈ لنڈن مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۶ء لکھتا ہے:۔

"ایک سال میں برطانیہ میں سڑکوں پر گاڑیوں کے حادثوں سے تقریباً ۵۰۰۰ ہزار جانیں ضائع
ہوئیں اور زخمیوں کی تعداد ۱۲۰۰۰۰ لاکھ کے لگ بھگ پہنچی۔

اگر زخمیوں اور مجروحوں کی تعداد کو چھوڑ کر محض مرنے والوں کو پیش نظر رکھا جائے
تو سواریوں کے حوادث سے خاص شہر لندن میں روزانہ تین اور ملک انگلستان میں بارہ آدمیوں
کے روزانہ مر جانیکا اوسط پڑتا ہے۔ پھر تمدن و تہذیب اور مادی ایجادات کی ترقی کیساتھ
ساتھ ان حوادث کی بھی ترقی ہو رہی ہے چنانچہ ۷ سال کے عرصہ میں مہلک حوادث کی
تعداد میں ۵۵ فیصدی اور غیر مہلک میں ۱۲۵ فیصدی کا اضافہ ہو چکا ہے۔

یہ تعداد صرف اُن حادثات کی ہے جو سڑکوں پر چلنے والی سواریوں سے پیدا ہوئے
ریلوں کے لڑنے جہازوں کے ڈوبنے کانوں کے بیٹھنے گیس کی ٹنکیوں کے پھٹنے اور
دوسری تمدنی ترقیوں کے مردم کش آثار و نتائج کی شمار اُن کے علاوہ ہے جس کا یہاں
کوئی ذکر نہیں۔ (سچ ۲۳ جولائی ۱۹۳۶ء)۔

سائنٹفک ایجادات سے قلوب کی بے چینی اور خودکشی کی بھرمار | بہر حال تہذیب و تمدن کی چکدار روشنی حیات انسانی کی تاریکی کو دور نہ کر سکی۔ اور دولت و ثروت کی یہ فراوانی قلبی سکون و راحت کو پیدا کرنے میں

قاصر ہی۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جو اس مدنیت کے روشن آثار سے مستفید ہیں وہ تو ان مصائب و آلام سے ملول اور پراگندہ حال ہیں جو اس تمدن کا خاصہ ہیں اور جن کا کچھ نمونہ بطور مشتے از خروارے ہم نے پیش کیا ہے اور جو اپنی ناداری اور کم مائگی کے سبب ان سامانوں سے محروم ہیں وہ محرومی کو ماتم میں ملول اور پراگندہ خاطر ہیں۔ غرض قلبی سکھ اور چین نہ کامرانوں کو میسر ہے نہ ناکاموں کو بعض کی زندگی محرومی کے سبب تلخ ہو اور بعض کی حاصل شدہ کے مہلک نتائج و ثمرات سے ان دونوں قسم کی بےچینیوں اور بے اطمینانیوں سے (جو روز بڑھتی جا رہی ہیں) نجات پانیکا آسان ذریعہ خودکشی کو سمجھ لیا ہے چنانچہ عامتہً یورپ اور خصوصاً امریکہ میں جو سب سے زیادہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے خودکشی گویا ایک قومی خصلت ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر ہوف مین نے اپنے ایک مضمون میں ملک کی اس خطرناک خصلت پر تنقید کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ممالک متحدہ امریکہ میں ہر سال تخمیناً اٹھارہ ہزار جانیں "خودکشی" سے ضائع ہوتی ہیں۔ اُن اشخاص کی صحیح تعداد معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جنھوں نے خودکشی کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہے تاہم جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ایسوں کا شمار بھی تیئس ہزار بلکہ غالباً زائد ہی ہے یعنی ملک میں تقریباً پچاس ہزار آدمی (ہر سال) ایسے (نکلتے) ہیں جن کا دماغی توازن اپنی جگہ پر قائم نہیں"

آگے چلکر ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے۔

"امریکہ کے ایک سو شہروں میں ہر ایک لاکھ آبادی میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد ۱۵ تھی یہ سنہ ۱۹۱۰ء کا حساب تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ایسے لوگوں کی تعداد ۲۰ تک پہونچ گئی۔

بلند عمارتوں کی چھتوں سے کود کر جان دینے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نیز ایسے بے شمار واقعات جن میں خودکشی اور قتل باہم ملے ہوئے ہوں اس شمار کے علاوہ ہے"

پھر لکھتا ہے۔

"ان (خودکشیوں) میں سے ایک کثیر تعداد کی ذمہ داری بڑی حد تک خود سوسائٹی کے سر ہے کیونکہ ہماری تہذیب کی گندم نمائی جو فروشی ہی اس خرابی کی جڑ ہے اور اسی سے وہ ابتری پیدا ہوتی ہے جس سے بچنے کے لئے آج کل ہزاروں آدمی چاروناچار خودکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں" (لٹریری ڈائجسٹ) (معارف اعظم گڑھ نمبر ۲ جلد ۲۸ اگست ۱۹۳۱ء)

غرض موجودہ تمدن و تہذیب کے سنہرے آثار کچھ تو اپنی مہلک خاصیتوں سے غیر اختیاری طور پر اور کچھ اپنی فریب آمیز اور دھوکہ دہ صورتوں میں اُلجھا کر ارادہ و اختیار سے انسانوں کو زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر رہے ہیں اور اس طرح متمدن دُنیا سمٹتی جا رہی ہے۔

تمدن جدیدہ کا انجام اور مآل | بہرحال جرائم و واردات کے اعداد و شمار تو متمدن ممالک کے امن عامہ اور ایثار و ہمدردی کی حقیقت کھل جاتی ہے اور حادثات کی گنتی کرو تو سکون و عیش اور زندگیوں کے مامون و مطمئن ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور نمایاں ہوتا ہے کہ اگر عیسائی اقوام نے مادی میدانوں پر فتح پاکر روحانیت کو کچلا تھا تو خود انہی کی مادیات نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے یہی نا کہ قومی اور نسلی خودکشی کی بنیادیں اس طرح پر مضبوط کر دیں کہ قوم کو اپنی زندگی قائم کرنا یا اُسے برقرار رکھنا ہی دشوار ہو گیا چنانچہ متمدنوں کی عیاشی پسند ذہنیت پہلے تو نکاح ہی پر تیر و تبر لیکر کھڑی ہو گئی جس سے تولید انسانی کا سلسلہ چلتا تھا جیسا کہ یورپ کی دوشیزہ لڑکیوں کی انجمنوں کے عہد نامہ

صاف بتلا رہے ہیں پھر جو نکاح وجود پذیر بھی ہوئے تو وہ اس لئے تولید کا ذریعہ نہیں بن سکے
کہ اُنہیں طلاقوں کی کثرت نے پامال کر دیا۔ پھر طلاقوں کی زد سے نکل گئے تو اُن کے تولیدی
نتائج کو برتھ کنٹرول (منع حمل) کی تدابیر نے سوخت کر دیا اور جو اُس مہلک جال سے بچکر تولید
کا سلسلہ شروع بھی ہوا اور کچھ نفوس ان عیاشوں کے علی الرغم دنیا میں آ کودے تو اُن میں سے
لاکھوں کو ملکی بدامنی یعنی قانونی امن کے نتائج بد قتل و غارت اور مار دھاڑ کی وارداتوں نے
سنبھال لیا پھر جو اس سے بھی بچ نکلے تو لاکھوں کی تعداد میں سائنس کے چلتے ہوئے آثار۔
کارخانوں۔ مشینوں۔ ریل۔ موٹر اور برقی۔۔ لائنوں کی لپیٹ میں آ کر ختم ہو گئے پھر جو بدبخت
اس سے بھی بھاگ نکلا اُن میں سے کروڑوں کو تھوڑی ہی مدت کے وقفہ سے محکمہ جنگ کی قابل
قدر سائنسی اسلحہ ڈینامائٹ۔ مشین گنوں۔ زہریلی گیسوں۔ خاردار تاروں رائفلوں کی گولیوں
اور ہوائی جہازوں کی بے پناہ بمباریوں کی کھلاڑیاں نمٹاتی رہتی ہیں اور جو ان مہلک جھپٹوں
سے بچ بچا کر داد عیش دے بھی رہے ہیں تو وہ اپنی عیاشی کی ہوسناکیوں اور وسائل عیش کی افراط
کے سبب طرح طرح کے امراض جسمانی و نفسانی فتور دماغ۔ ضعف البصری۔ نامردی۔ آتشک فحش کاری
ہجوم افکار بے اطمینانی اور خلجان و تشویش کا شکار ہیں جس کا انجام پھر پاگل پن یا خودکشی اور اضافہ اموات
ہے اور اگر ان ساری ارضی و سماوی آفات سے نکل کر کچھ لوگ صحیح الدماغ اور قوی البدن بچ بھی جاتے
ہیں تو وہ رات دن اپنی مایۂ ناز ایجادات اور سائنسی موشگافیوں کے پیچ و خم میں گرفتار رہتے ہیں۔
جن کی بدولت انہی کا کنبہ مختلف عنوانوں سے ختم ہوتا رہتا ہے انسانی پیداوار اولاً مسدود ہوتی
ہے پھر گھٹتی ہے اور مٹتی ہے اس لئے ان ساری تمدنی گہرائیوں اور سائنس کے کارناموں کا حاصل دو لفظوں

ہیں یہ نکلتا ہے کہ قوم کا ایک حصہ مرتا رہتا ہے اور ایک حصہ اسے مارتا رہتا ہے۔ ایک حصہ چھریاں تیز کرتا ہے اور دوسرا اپنی گردنیں جھکاتا ہے اور اس طرح نہایت سہولت اور سکون کے ساتھ کشتن و مردن کی گرواہنیں جاری رہتی ہیں اور خودکشی اور غیر کشی کی روشن مثالیں مہیا ہوتی رہتی ہیں۔ بس اس مارنے اور مرنے یا فساد پھیلا پھیلا کر خود ہی اس کا شکار بننے کا نام تمدن۔ تہذیب شائستگی۔ ایثار۔ ہمدردی۔ اخوۃ۔ مساواۃ۔ عدل۔ رفاہ عام وغیرہ رکھ لیا گیا ہے "برعکس نام نہند زنگی کا فور" پس کیا کاروان فرنگ کی مادی مساعی کے یہی وہ نمونے ہیں جن کی طرف آج عیسائی قوم نہیں بلکہ ہمارے ہی روشن خیال ہم کو بلا رہے ہیں؟ کیا یہی وہ روشن خیالی ہے جس سے ہٹانے پر علماء مجرم۔ قابل گردن زدنی اور عمار سوء کہلانے کے مستحق ہوئے ہیں؟ انہی مظالم قائم کیا جاتا ہے۔ مذہب اور اہل مذہب پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ روحانیت کے شعائر کو سرنگوں کیا جاتا ہے۔ تقویٰ و طہارت اور دنیا میں محتاط زندگی گذارنے کو تنگدلی کہا جاتا ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اخلاق و اعمال یعنی مذہب کو لغو۔ مانع ترقی اور مخل تمدن بتلایا جاتا ہے۔ کیوں اور کس بنا پر؟ اسی سائنسی چمک دمک پر ریجھ کر جس کی حقیقت خود سائنسدانوں کے ہی اعتراف سے کھل چکی ہے۔

سائنس اور سائنٹفک ایجادات کے حامی کیا کہتے ہیں؟

پھر بعض اگر اس سائنسی کرشمہ آرائی سے مرعوب ہو کر کھلے بندوں مذہب اور اہل مذہب پر آوازہ کسنے کی جرأت نہیں کرتے تو کم از کم سائنس اور سائنٹفک ایجادات کی ضرورت اس درجہ میں ظاہر کرتے ہیں کہ شاید انسانی ترقی کے لئے مذہب بھی اتنا ضروری نہ ہو یا اگر ہو تو مساوی درجہ میں اور اگر ضرورت بھی ہو تو یہ سائنسی ترقیات بھی اپنے درجہ میں ناگزیر بلکہ

بڑھے مذہب ضروریات زندگی کا مدار ہوں۔ علمائے اسلام کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ انھیں سائنس کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیکر اسکو پھیلانا چاہیے۔ نصاب مدارس میں اسوقت تک تاریکی اور تنگی باقی رہیگی جب تک سائنٹفک روشنی سے آسے منور کیا جائے علما کی انتہائی غفلت اور مجرمانہ کوتاہی ہے کہ انھوں نے سائنس سے بے توجہی برتکر امت کو دوسری اقوام سے صدیوں پیچھے ڈالدیا۔ حالانکہ آج ضروریات زندگی پر سائنس کا قبضہ ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کا تمامتر تنزل سائنٹفک ایجادات سے بےخبری کی بناء پر ہے ورنہ وہ بھی یورپ کی طرح آج برسر اقتدار ہوتے تجارت ان کے قبضہ میں ہوتی۔ سامان زندگی ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ نہیں بلکہ سائنسی ترقی عین منشاء خداوندی ہے جس سے آج تک علماء غافل رہتے چلے آتے ہیں۔ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات عناصر اربعہ موالید ثلاثہ زمین اور آسمان چاند اور سورج غرض ساری کائنات کو انسان کے ہاتھوں میں مسخر بتلا رہی ہیں پس اس تسخیر کو بروئے کار نہ لانا اور مادیات کی قوتوں اور منافع سے دستکش ہو کر بیٹھ رہنا گویا کلام الٰہی کی تصدیق ہی سے دستکش ہو جانا ہے اور اس کی صد درجہ بے قدری کرنا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ امت مسلمہ میں سائنسی ایجادات کی ترقی معراج پکڑے مسلمان اس پر قابو پائیں اور اسی طرح یورپ کو اس کی بڑھتی ہوئی تجارت کو اسکی سرمایہ داری کو اور اس کی ہندوستان کشی کو شکست دیکر جہان تمدن میں اپنا وقار قائم کریں تاکہ موجودہ غلامی سے نجات حاصل ہو۔"

یہ ان مشوروں اور رایوں کا خلاصہ ہے جو دلدادگان سائنس کیطرف سے علماء کو دی جا رہی ہیں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یہ رائیں دلسوزی اور بہی خواہی سے دی جا رہی ہیں لیکن کسی مشورہ کا

محض نیک نیتی پر مبنی ہونا اُسے واجب القبول نہیں بنا سکتا جب تک کہ نفس مشورہ کو آئینِ عقل اور واقعات کی روشنی میں جانچ نہ لیا جائے۔

غور اس پر کرنا ہے کہ اگر ان سائنٹفک ایجادات کی طبعی خاصیت وہی ہے جو بذیل واقعات ہم خود یورپین مدبروں کے اقوال و اعتراف سے پیش کر چکے ہیں تو کیا پھر بھی علماء اسی پر مجبور کئے جائیں گے کہ وہ یورپ کے کھلے کھلے اعترافات سے سبق نہ لیتے ہوئے براہ راست خود ان جدید وسائل کا تجربہ کریں اور ساتھ ہی اپنے مدارس کے تلامیذ کو بھی ان لکھے پڑھے نتائج کی آگ میں دیکھتی آنکھوں دھکیل دیں؟ حالانکہ آج تجربات کے بعد تو ساری ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ ایسے غیر طبعی وسائل کا انجام کیا ہوتا ہے لیکن علماء کو تو اپنی فراست صادقہ سے یہ نتائج پہلے ہی نظر آرہے تھے جن کی روک تھام میں کبھی اُنہوں نے پہلو تہی نہیں کی اور اسی بنا پر روشن خیال قوم کی طرف سے "تاریک خیال" اور "تنگ نظر" کے خطابات سے مشرف ہوئے۔ بہر حال اُنہوں نے اگر اپنی فراست یا اپنے مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں اس غیر طبعی تمدن کو کبھی وقعت و اہمیت دی تو یہ بجائے خود بیجا نہ تھا۔ لیکن حیرت اس پر ہے کہ جو لوگ کسی چیز کو معقول تسلیم کرنے کیلئے علماء حق کی ہدایت کو بجائے صرف یورپ کی وحی کے منتظر رہا کرتے تھے آج سائنٹفک تجربات کے متعلق اس قدر یورپین فلاسفروں اور خود موجدوں کی مذکورہ الہامات آجانے کے بعد بھی اُنہیں ان مضرتوں سے انکار کیوں ہے اور علماء کی تنگ نظری کا شکوہ اب بھی کیوں باقی ہے؟ آخر تمدنی ایجادات کے ثمرات بد کے متعلق ہم نے جس قدر حوالے پیش کئے ہیں وہ تو یورپین مدبروں اور قوم پرستوں ہی کے دل و دماغ کا ثمرہ ہیں نہ کہ تنگدل علماء کے خیالات کا۔ پھر ان سے گریز کرنے کے آخر کیا معنی ہیں؟ اور تجربہ و مشاہدہ کے بعد آخر کونسی دلیل

رہجاتی ہے جس کا انتظار کیا جارہا ہے؟

عجیب بات ہے کہ خود متمدن تو اپنے تمدن کے نتائج بد کا اظہار کر کے رو ئیں اور اُن کے مشرقی پرستار "مدعی سست گواہ چست" کی مثل کے مطابق اُن کے ظلماتی ویرانوں میں بسیرا لینے کی خاطر اپنے نورانی گھروں کو اُجاڑتے جائیں۔ بقول اخبار "صدق"

"یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ جب یورپ تجربوں کے بعد اپنے نئے نظریات سے عاجز ہو جاتا ہے اور انہیں اُتار پھینکنے کیلئے بیقرار ہوتا ہے ٹھیک اُسی وقت ہمارے مُلک کی روشن خیالی اور تجدد پسندی کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں اُگلے ہوئے نوالوں کو مزہ لیکر چبایا جائے اور انہیں اُترے ہوئے چیتھڑوں سے اپنے جسم و تن کی نمائش کی جائے۔ ذہنی غلامی اور دماغی مرعوبیت کی یہی آخری انتہا ہونی چاہیئے"

ذہنی غلامی کا سب سے پہلا حملہ فہم پر ہوتا ہے۔ ایک غلامی زدہ اور مرعوب انسان بجز اس کے کہ پس آئینہ طوطی صفت بنکر فاتح کی بے بصیرت زبان بنجائے خود اپنا دماغی جوہر کچھ باقی نہیں چھوڑتا اُس کی ذہنیت صرف اسقدر رہجاتی ہے کہ

"آنچہ اُستاد ازل گفت ہماں می گویم"

جبکہ شاطران برطانیہ میں سے مسٹر گلیڈسٹون نے ایک بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اُٹھاتے ہوئے بلند آواز سے کہا

"جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی" (مدینہ بجنور ۲۰ جنوری ۱۹۳۷ء)

اور جبکہ علوم اسلامیہ اور مدارس دینیہ کو مٹانے اور علوم جدیدہ کو شائع کرنے کی اسکیم کے ماتحت لارڈ میکالے نے کہا

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو اگر رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندستانی ہوں تو دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی۔" (مدینہ بجنور ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء)

تو اُسوقت انہی مرعوب ذہنیتوں کے نزدیک مسلمانوں کی تمام تر ترقی اور فلاح و بہبود کا راز صرف تعلیم جدید اور کالجوں کی چار دیواری میں مضمر تھا۔ اور علماء اس لئے تنگ خیال اور گردن زدنی کہ وہ اِس تعلیم کے مسموم آثار پر تنبہ کرنے اور قرآنی تعلیم کے حیات آفریں اثرات کو باقی رکھنے کے جرم میں گرفتار تھے لیکن وہ تو زہریلی چراگاہوں کی ڈول سے ہاتھ پکڑ پکڑ کر قوم کو کھینچ رہے اور قوم کے نزدیک اسوقت یہ تعلیم جدید عین منشاء خداوندی بن چکی تھی جس پر مضامین اور رسالے چھپ رہے تھے۔

پھر جبکہ یورپ میں لباسی اور بدنی فیشنوں کی افراط شروع ہوئی اور صورت پرستیوں نے حقیقت کو اوجھل کر دیا۔ ڈاڑھی مونچھ کے نئے نئے ڈیزائن آنے لگے لباس کی کتر بیونت نے ذمہ دارانہ شان اختیار کر لی تو اسوقت ہندستان میں مسلمانوں کی تمام تر تہذیب و ترقی کا راز اس فیشن ہی میں مضمر تھا۔ اور علماء اس لئے تاریک دماغ اور لائق استہزاء و تمسخر تھے کہ وہ ان شاطرانہ اوضاع سے بچا کر مسلمانوں کو صلحاء و اتقیاء کی وضع پر ڈھالنا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر کار فیشنوں کی یہ تت نئی صورتیں بھی عین منشاء خداوندی قرار پا گئیں جس کیلئے قرآن و حدیث کے حوالے آنے لگے من تشبہ بقوم کی حدیث کو روایۃً و درایۃً مردود ٹھہرانے کیلئے لمبے لمبے مضامین لکھے گئے اور چند ہی دن بعد اخبارات میں عورتوں کی چوٹیاں اور سر کے بال کٹوا دینے کو ازواج مطہرات کی سُنّت قرار دیا گیا۔ پھر جبکہ یورپ کی سُودی تجارتیں فروغ پا گئیں اور سرمایہ داری سے یورپین شاطر نکھرنے اور ابھرنے لگے تو اسوقت مسلمانوں کی تمام تر ترقی و فلاح ... ایک سود ہی میں منحصر ہو گئی۔ اور اس پر زور دیا جانے لگا کہ جبتک

سُودی لین دین اور ربٰوی بیوپار نہ ہوگا مسلمان کبھی نہ پنپ سکیں گے یہاں تک کہ ربوی معاملات بھی انجام کار منشار خداوندی قرار پاگئے اور علمار اس لیئے تاریک خیال بنے کہ وہ ان سُودی مقاصد کے جواز بلکہ استحباب میں کیوں آڑے آرہے ہیں؟

اس کے بعد جبکہ یورپ میں قومی عیاشی اور زناکاری کی اسکیم کے ماتحت عورتوں کی بے حجابی ہی نہیں بلکہ بے غیرتی بے حیائی اور برہنگی ضروری سمجھی گئی تاکہ بلا روک ٹوک ہر فروان چشمہائے شیریں سے سیراب ہو سکے تو اُس وقت بوقلموں ہندوستان میں عورتوں کی بے پردگی ہی تمام قومی ترقیات کا مرکز قرار پاگئی اور شدہ شدہ یہ خصلت بھی عین منشار خداوندی اور مطلوب شرعی ٹھہر گئی ساری بے پردگیاں قرن اول سے ثابت شدہ بلکہ اس میں واقع شدہ مانی جانے لگیں۔ اور اب جب تک عورت گھر کی چار دیواری سے بے حجابانہ باہر نہ آجائے دُنیا کو قومی ترقی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ بے چارے علمار کے لئے پھر تنگ خیالی اور تاریک دماغی کا ہتھیا صیقل کر کے لایا گیا کہ وہی اسمیں بھی آڑے آئے اور انہوں نے ہی اس شرالقرون سے خیرالقرون کی تنزیہ کرتے ہوئے اس بے حجابی کو مبادی زناکاری بتلا کر مسلمانوں کو اس سے بھی روکنا شروع کیا بعینہٖ اسی طرح آج بھی جبکہ سائنس اور سائنٹفک ایجادات نے یورپ کے ہاتھوں فروغ پایا اور عام بلاد اور دیار پر اُس کی چمک دمک کا سایہ پڑنے لگا تو مسلم مضامین اور اسلامی تصانیف اسی کی اشاعت میں سرگرم ہیں کہ اب اسلام اور مسلمان کی ترقی کا راز صرف سائنس اور سائنٹفک اختراعات میں منحصر ہے۔ جب تک نصاب مدارس میں سائنس نہ داخل ہو جائے جبتک اُس کے تجربات مدارس کی چار دیواریوں میں نہ ہونے لگیں نہ قومی دماغ روشن ہو سکتے ہیں نہ قوم معراج ترقی

پرہی پہونچ سکتی ہے۔ یہانتک کہ اُسی سابق وتیرہ کے موافق یہ تمام تمدنی ایجادات بھی منشاء خداوندی قرار پاگئیں اور آج علماء اس لئے تاریک خیال تنگ دل اور ناکارہ ہیں کہ وہ بھی اس مادی انہماک وتعیش کو کیوں نہیں پسند کرتے؟ اور عوام کو اُس کی ترغیب وتحریص دیکر اس مدار علیہ ترقی کی شاہراہ پر اُنہیں آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟

بہر حال قوم کا یہ طرز عمل بھی پُرانا ہے اور علماء کا یہ جمود بھی قدیم ہے نہ قوم کا دام فرنگ کے نئے سے نئے حلقوں میں الجھ جانا نیا ہے اور نہ علماء پر الزام تنگ خیالی اور اُن کے ساتھ طرز تمسخر ہی نیا ہے۔ اس لئے طعنہ ہائے دلخراش پر حسب عادت صبر کرتے ہوئے یہ کہے بغیر نہ رہا جائیگا کہ قوم کے یہ تمام مزعومہ اسباب ترقی خواہ تعلیم جدید ہو یا فیشنوں کی رنگا رنگی۔ سودی لین دین ہو یا نسوانی آزادی یا فنی تجربات ہوں یا تمدنی ایجادات کتنے ہی خوشنما الفاظ کی قبا پہنکر آئیں یہ علماء تنگ خیال کہلائے جائیں یا تنگ نظر اُنھوں نے ہمیشہ قوم کی اِس طعنہ زنی اور یوروپین ترغیبات کی ہمنوائی کو کبھی قوم کے علم وبصیرۃ یا ذکاء حس کا نتیجہ نہیں سمجھا بلکہ دماغی مرعوبیت ذہنی غلامی اور کورانہ تقلید کا اثر خیال کیا ہے پس اگر آج بھی وہ اُسی طرز سابق کے مطابق سائنٹفک ایجادات کو عین منشاء خداوندی اور قرآنی مطلوب ٹھہرا دیں تو ہم ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اُنھوں نے سمجھ کر ایسا کہا ہے یا قرآن سے اخذ کرکے کچھ پیش کیا ہے۔ بلکہ وہی یورپ کی ہوا جبکہ بے بصر دماغوں میں گھسکر باہر نکلی تو اُسکی گونج سے یہ کچھ نغمے پیدا ہو گئے جو ہندوستان کی فضاء میں بطور صدائے بازگشت چکر کھانے لگے ورنہ یہ لوگ ذرا اپنے ضمیر کیطرف جھک کر سوچیں کہ آیا فی الحقیقت اُنہوں نے خالی الذہن رہتے ہوئے محض قرآن پڑھکر ہی موجودہ سائنس کا نظریہ یوں ہی جمایا ہے یا ایک جمے ہوئے خیال کو لیکر بغرض

اُنہیں قرآن کو بھی ہمنوا بنانے کی کوشش کی گئی ہے؟ آیا اُنہوں نے قرآن میں سے کوئی چیز نکالی ہے یا اُنہیں اپنی کوئی چیز ڈالی ہے؟ خیر سے ضمیر اور دیانت کے فیصلہ پر چھوڑ کر استدلالی رنگ میں اسی پر غور کر لیجئے کہ آیا تمدن جدید کی یہ نئی نئی اختراعات، گیس و برق کی کرشمہ سازیاں اور اسٹیم و پیٹرول کے موالید آیا فی الحقیقت یہ وہی تسخیر کائنات ہے جو منشار قرآنی اور اُس کا ایک مستقل موضوع بحث یعنی عین منشار خداوندی ہے؟ اسپر غور کرنے کیلئے یہ سوال پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ مشینری تمدن اور ایجادات کا ارتقار آیا تشریعی طور پر منشار خداوندی ہے یا تکوینی طور پر؟ ظاہر ہے کہ اگر یہ تمدنی ایجادات شرعی طور پر منشار الٰہی کے مطابق ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ان چیزوں کا کرنا اور پھیلانا شرعاً مطلوب ہے تو سب جانتے ہیں کہ اوامر کے امتثال و تعمیل کا بہترین اور بے مثال دور عہد نبوی اور قرن صحابہ ہے کہ اِس امتثال طاعت ہی کی بدولت لسان شریعت پر اُس کا لقب خیر القرون قرار پایا۔ پس اگر یہ مشینری ایجادات مامور بہ ہوتیں تو خیر القرون میں اسٹیمی اور برقی مشنری کی وُسعت بلا شبہ اس درجہ پر ہوتی کہ عالم میں نہ اُس سے پہلے اُس کی نظیر ملتی نہ بعد میں۔ اور بھی کچھ نہیں تو جہاں اللہ کے رسول نے تمام مشروع اخلاق و اعمال کے عملی نمونے قائم فرمائے تھے وہیں اگر حضرت صاحب اُسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم ایک انجن یا ایک خانی جہاز یا ایک سینما کی مشینری جس سے مصوّر تبلیغ ہو سکتی یا ٹیلیفون جس سے دینی احکام جلد سے جلد دُور دُور تک پھیلائے جا سکتے ہیں سب کچھ چھوڑ کر صرف لاؤڈ اسپیکر اور ریڈیو جس کے ذریعہ اس رسول عالمین کے خطبات ہی کم از کم سارا عالم بیک وقت سُن سکتا اپنے دست مبارک سے ایجاد فرما کر اُمت کے لئے ایک نمونۂ عمل قائم فرما دیتے تو کم از کم تنگدل علماء پر حجت تو قائم ہو سکتی اور انہیں بلا تکلف ہر سخت سے سخت خطاب اور سزا کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن وہاں تو صحابہ اور اُلٹے اِس فکر میں لگ گئے کہ

اُس دور کی دو عظیم الشان متمدن سلطنتوں فارس و روم کے تمدنی تکلفات مٹا کر انہیں بھی اپنے ہی جیسا بدوی بنا لیں بلکہ عملاً ایسا ہی کر دکھایا۔ صحابہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو تمدن کی بذاذت۔ معاشرت کی سادگی۔ رہائش کی بے تکلفی اور تقلیل اسباب وغیرہ اس حد تک نظر آئے گی کہ اگر ان سادہ حضرات کا گروہ اس متمدن وچکیلی دنیا میں کہیں آ نکلے تو بقول امام اوزاعی "وہ ہمیں کافر بتلائے اور ہم اسے مجنون کہیں" بہر حال جبکہ اسلام کے اس مبارک دور میں ان رنگین تمدن یا مادی عیاشی کا کوئی عملی خاکہ دستیاب نہیں ہوتا تو ہم بھی اس سے کلیۃً معذور ہیں کہ اس تمدنی تعمق کو منشاء خداوندی یا قرآنی مقصود باور کریں۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان سائنٹفک ایجادات کا فقدان مسلمانوں کیلئے کسی طرح تنزل کا باعث ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر سائنس کا فقدان باعث تنزل ہے تو یقیناً سائنس کا وجدان باعث ترقی ہوگا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا دور ترقی ہی وہ ہو جس میں سائنٹفک ایجادات کی کثرت ہو۔ اس سے نہ صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے آج تک کسی دور میں بھی کوئی نمایاں ترقی نہیں کی (کیونکہ اس رنگ کیساتھ اور اتنی افراط کیساتھ ایسی ایجادات ان کے ہاتھوں کسی دور میں بھی وجود پذیر نہیں ہوئیں) بلکہ یہ بھی لازم آتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ قرن اول مسلمانوں کے لئے حد درجہ پستی اور تنزل کا زمانہ تھا کیونکہ انہیں یہ تمدنی جدت آرائیاں تو کیا ہوتیں دوسروں کے تمدنی تکلفات کو بھی اور الٹا مٹا دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ جس معیار کی رو سے اسلام کا خیر القرون جو مذہب و سیاست دونوں ہی کی رو سے خیر القرون تھا شر القرون ٹھہر جائے وہ یقیناً اسلامی معیار ہرگز نہیں کہلایا جا سکتا۔ پس سائنس کوئی ایسا معیار ہی نہیں قرار پا سکتی کہ جس کے ذریعہ اسلامی قرون یا اسلامی اُمتوں کے ترقی و تنزل کو جانچا جائے۔ چہ جائیکہ

وہ اسلامی حیثیت سے کسی درجہ میں اہم بھی ہو۔ پس سائنس اور اسکی ترقی نہ اسلامی موضوع کی ترقی
ہے اور نہ اس کے فقدان سے مسلمانوں میں کوئی ادنیٰ تنزل راہ پا سکتا ہے۔ وہ دوسرے اسباب
ہیں کہ جنکی بنا پر مسلمان قعر ذلت میں گرتے جا رہے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال جب یہ طبیعاتی کارنامے تشریعی طور پر مطلوب نہ ٹھہرے تو پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تکوینی
طور پر منشاء الٰہی اور مرضی خداوندی ہیں۔ مگر اس سے ہمارے دعوے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ
تکوینا کسی شے کے مطلوب ہونے سے شرعاً بھی اُسکا مطلوب ٹھہر جانا ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
کوئی چیز شرعاً ناپسند ہو اور تکوینا پسندیدہ ہو۔ کفر کا وجود شرعاً نامرضی ہے اور تکوینا مرضی ہے
شیطان اور اُس کی حرکات کا وجود شرعاً نامرضی اور تکوینا مرضی ہے پس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
یہ سارا ایجادی کارخانہ اور سائنسی نظام شرعی طور پر تو مٹانے کے قابل ہو لیکن تکوینی طور پر اور اللہ
کے افعال و تخلیق کے اعتبار سے عین منشاء خداوندی ہو جس کے ہم مکلف نہیں۔ کیونکہ ہم خدا کے
اقوال کے مکلف ہیں اُس کے افعال کے مکلف نہیں اُسکی جانب سے ہمیں شرعاً جو ارشاد ہوگا اُسکی
تعمیل ہم پر فرض ہوگی لیکن جو کام تکوینا اُس کی قدرت سے ظاہر ہوں گے اُن کی تعمیل کا خطاب
ہماری طرف متوجہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ بہر حال سائنس کی ان ترقیات سے ہی دین
کے کسقدر دقیق مقاصد حل ہو گئے اور اُس کی حسی مثالوں سے اسلام کے معنوی حقائق کسقدر نمایاں
ہوئیں اس لیے سائنٹفک ایجادات بہر حال تائید دین کا ذریعہ بنکر بھی کیوں مطلوب نہیں ٹھہرتیں؟ تو
میں عرض کروں گا کہ اگر کسی فاجر کے فجور سے اتفاقاً دین کی تائید ہو جائے تو ہرگز اُس کے فجور کا تحسن
یا مطلوب ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر کفار کے کفر و عناد اور مقابلوں سے دین اسلام کی برہانی ثبوت

کھل جائے تو اُن کے کفر کا مستحسن یا مقصود ہونا کسی حال باور نہیں کیا جا سکتا۔ پس اگر نصرانی تمدن کی ان سائنسی ایجادات سے بھی اتفاقاً دینِ اسلام کی معنوی حقائق کی تائید ہو گئی تو اس سے اس تصویری نظام کا مطلوبِ شرعی ہونا آخر کس طرح باور کر لیا جائیگا؟ یا یہ کہ آج ضروریاتِ زندگی پر سائنس کا قبضہ ہو چکا ہے اس لئے سائنٹفک وسائل سے بے اعتنائی برتنا موت کے مرادف ہے۔ سو میرے نزدیک ضرورتِ سائنس کی بھی کوئی معقول اور مستحکم وجہ نہیں جبکہ سابقہ حوالجات سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ سائنس کی ان ہی موشگافیوں اور ان وسائل تمدن ہی نے دُنیا کی زندگی کو غیر مطمئن بنا کر طرح طرح کے خطروں میں مبتلا کیا ہے جس کا رونا خود موجدین یورپ ہیں تو پھر آج کونسا دانشمند ہوگا جو ان مہلکاتِ زندگی کو ضروریاتِ زندگی سے تعبیر کرنیکی جرأت کریگا؟ ان تمام سائنسی آلات اور موجودہ وسائلِ تمدن کا حاصل بجز بدنی عیاشی کے اور کیا نکلتا ہے؟ اور بدنی عیاشی کا حاصل فوری لطف کے بعد بجز دائمی حسرت و کلفت کے اور کیا نکلتا ہے جیسا کہ تفصیل سے واضح ہو چکا ہے۔ پھر بھی ان مہلکاتِ زندگی کو ضروریاتِ زندگی کہکر اُن کی ترویج پر زور دینا ہمارے نزدیک بجز اس کے کہ عقل اور تجربہ کے ماتم سے تعبیر کیا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

یہ ایجاداتی تمدن ہرگز مدارِ زندگی نہیں

غور کرو کہ ضرورت کے معنیٰ "مالابدمنہ" یعنی ناگزیر کے ہیں جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو یا بقاءِ زندگی اُس پر موقوف ہو یا دفعِ مضرت اُس کے بغیر ناممکن ہو یا فی الجملہ راحت اُس کے سوا کسی چیز سے میسر نہ آسکتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں اختیار کرنے پر ہر ایک انسان مجبور ہوگا خواہ وہ یورپ کا باشندہ ہو یا ایشیا کا مشرقی ہو یا مغربی۔ ظاہر ہے کہ آج کے سائنٹفک وسائل ہرگز اس درجہ کے نہیں کہ دُنیا کے سارے انسان اُن کے اختیار کرنے پر مجبور سمجھے جائیں۔ آج یہ وسائلِ تعیش

جس قدر یورپ کو حاصل ہیں ہندستان کو ہرگز حاصل نہیں۔ پھر ایشیا میں شہروں کو جتنے حاصل ہیں وہ قصبات ودیہات کو میسر نہیں سوال یہ ہے کہ ان وسائل کے فقدان سے قصباتی یا دیہاتی زندگی آخر کونسے خطرات کا شکار ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو شاید خالص امن و سکون کی زندگی بدویت و دیہات ہی کی زندگی ثابت ہوگی جہاں نہ برق ہے نہ اسٹیم۔ اگر یہ سامان ضروریات زندگی میں سے ہوتے تو دیہات وقصبات تو فنا کے کنارے آ لگتے۔ لیکن جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ کچھ مطمئن زندگی ہے تو وہیں کی ہے جہاں فطری سادگی ابھی تک اِن سامانوں سے کچلی نہیں گئی تو پھر کیا وجہ ہے کہ اِن نام نہاد "ضروریات زندگی" کو "فضولیات زندگی" کا لقب نہ دیا جائے؟ اور کیا انہی فضولیات کے نہ ہونے سے دینی مدارس کے نصاب ناقص اور تعلیم نکمی ہے اور یہی چیزیں ہیں جنکو مقصود نہ ٹھہرانے میں علماء قابلِ تعزیر اور لائق دار و گیر ہیں۔

سائنٹفک ایجادات اور حکومت بھی نہیں

رہا یہ سوال کہ آج سائنسی وسائل ہی کے فقدان سے مسلمان غلامی کی قید میں جکڑے ہوئے ہیں اور انہی وسائل کے ہاتھ میں ہونے سے یورپ فاتح کی صورت میں اُن پر مسلط ہے اُس کے ہاتھ میں توپیں ہیں ڈریڈ ناٹ ہیں ہوائی جہاز ہیں اور تمام تمدنی وسائل کی مشینیں اُس کے قبضہ میں ہیں ادھر مسلمان اِن سب سامانوں سے محروم ہیں اگر ایک جنگی جہازوں کا بیڑہ ساحل پر آکھڑا ہو تو اس کے پاس کوئی اپنا بیڑہ نہیں جو مدافعت کر سکے اگر اُن کے شہروں پر کوئی ہوائی بیڑہ بمباری کرنے لگے تو وہ بجز ہلاک ہو جانے کے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔ اِس لئے لامحالہ وہ غلام ہیں اور سائنس کا ریوریپ فاتح اور حاکم ہے پھر کیا اب بھی ضروری نہیں ہے کہ مسلمان اِس فن پر قابو پانیکی سعی کریں؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں یا ہندوستان

کی غلامی ان جدید وسائل سے محرومی کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے فضائل سے محرومی کی بنا پر ہے۔

مسلمانوں کے اقتصادی تنزل کے اسباب

ہماری اقتصادی تباہی اور بے اعتدالیاں اسکا اصلی سبب ہیں نہ کہ یورپ کے یہ جدید وسائل۔ ورنہ یورپ نے آخر ان جدید وسائل پر کس طرح فتح پائی؟ ہمارا اسراف بیجا۔ ہماری نااتفاقی۔ ہماری بدمعاملگی۔ ہماری بے انصافی۔ ہمارا ظلم وجور۔ ہماری بے حمیتی۔ ہماری بیفکری و بے غیرتی اور ہماری جہالت فی الحقیقت ہماری غلامی کا سبب بنی ہوئی ہے جس نے قوت و شوکت کو ہم سے جدا کیا اور اسی قوت کو یورپ نے اچک کر ان وسائل پر فتح پالی۔ پس ہماری محرومی یورپ کے ان جدید وسائل سے نہیں آئی بلکہ یہ وسائل ہماری محرومی کے سبب دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ نہ ہم میں اخلاقی اور مالی اسراف آتا نہ غیروں کے ہاتھ مضبوط ہوتے۔ اگر ہمارا لباس موٹا جھوٹا اور مقامی ساخت کا ہو۔ کھانا سادہ ہو۔ رہائش نازک اندامیوں کی سی نہ ہو۔ تکلفات قیصر و کسریٰ کے سے نہ ہوں۔ آرائش و زیبائش عورتوں کی سی نہ ہو۔ کفایت شعاری ہو سادگی اور بے تکلفی ہو خشونت عیش ہو اور علم و عمل اسلاف کے نمونہ کا ہو تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دولت کا بیرونی نکاس بند ہو جائے۔ اور اس کا ثمرہ یورپین کارخانہ داروں کے حق میں (جو ضروریات نہیں بلکہ فضولیات کے ذریعہ ہندوستان کی دولت سمیٹ رہے ہیں) بصورت ناداری نکلے گا جس سے کارخانوں کا سست پڑ جانا اور ان کے دم خم کا ڈھیلا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔

پس بجائے اس کے کہ ہم یورپ کی طرح سائنٹفک ایجادات کے کارخانے کھولکر ان سے سائنسی ملکہ لیں اور فضولیات زندگی کو ترک کر کے صحیح باقاعدہ طریق اختیار کر کے ایسے نتائج کا سامان پیدا کریں کیوں نہ اپنے کو ان فضول سامانوں سے بچا کر خود انہی کے ہتھیاروں کو کند اور بیکار کرنے کی سعی کریں جس سے

یورپ بھی اس غیر طبعی مصیبت سے نجات پا جائے جسے وہ خود بھی رو رہا ہے۔ اور ہم بھی اس کی جوع الارض سے بچ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ نے ریلیں اور دخانی جہاز بنا کر تجارت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے لیکن کیا یورپ نے اس پر بھی ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسی کے آدھے ساما نوں پر ڈال دیں اور یہ فرض کرلیں کہ اب زندگی ان سامانوں کے بغیر محال اور موت ہے؟ ایسی غیر طبعی چیزوں کو ضروریات فرض کر لینا خود ایک غیر طبعی اقدام ہے۔

بہرحال ضرورت سائنس کی پیش کردہ وجوہ کسی طرح بھی اثبات مدعا کیلئے کافی نہیں ہیں کہ مدعا نگاروں کی بعض نیک نیتی کو سامنے رکھکر انہیں قبول کیا جا سکے واقعات و تجربات انہیں کلیۃً رد کر رہے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اس سائنسی ترقی کو مقاصد زندگی میں سے شمار کیا جائے جس پر زندگی یا اس کا ارتقاء موقوف ہو۔ بلکہ ہم تو واضح طریق پر دکھلا چکے ہیں کہ یہ مادی وسائل اپنے نتائج بد کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے عار اور موجب شرم ہیں۔ انکا مٹایا جانا زندگی کے مقاصد میں سے ہونا چاہئے۔ حیرت ہے کہ اس تصویری ترقی اور صورت آرائی کو سامنے رکھکر کس طرح امتِ مسلمہ کی حقیقی ترقی پر نکتہ چینی کیجاتی ہے مذہب و اہل مذہب ان مسائل کے فقدان یا ان کی تعلیم و ترجیح سے یکسو رہنے کے سبب کیونکر تنگ خیال قرار دیدئے جاتے ہیں اور کیونکر انکو ایسی رائے دیجاتی ہے کہ جس پر عمل کرنے کی بدولت آج مغرب کی عظیم الشان آبادی اپنے اقرار و اعتراف سے تباہی کے کنارے لگتی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کیلئے مقام غیرت وعبرت | کیا آج دنیائے اسلام کیلئے ان کے اسلاف کا نقش قدم اور نمونۂ عمل کافی نہیں ہے جو ان کی زندگی کے شعبے غیروں کے قدموں میں لڑھکتے پھر رہے ہیں؟ صدیق

وفاروق عثمان وحیدر ابو عبیدہ اور ابن عوف ابن عمر اور ابن عباس کے اسوے کیا وقتی اور مقامی تھے کہ آج ان کو یورپ کی تمدنی وصول میں دفن کر دیا جائے؟ اور وہ بھی اس قوم کا اسوۂ عمل اختیار کرنے کیلئے جو خود بھی اپنے نمونۂ عمل سے تنگ آ کر خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھتی ہو؟ اور کیا آج فلاح و بہبود ان نمونہ ہائے اسلاف میں باقی نہیں ہے کہ ہم نمونہ ہائے اغیار پر مجبور ہوں؟ کس قدر حیرت اور موجب حسرت ہے کہ آج غیر اقوام اور ان میں بھی وہ مشرک قومیں جو علم شرائع اور کتب سماویہ سے کلیۃً خالی اور بے بہرہ ہیں ان اسلاف کرام کے اسووں کی پیروی اپنے لئے فلاح تصور کریں اور خود مسلمان جنکو قدرت نے ان اسووں کی میراث کا حقیقی وارث بنایا تھا ان سے بیگانہ بنیں اور منکر اقوام کے نمونوں میں اپنی فلاح تکیں یہ کچھ کم عبرتناک بات ہے کہ مسٹر گاندھی کانگریسی وزراء کو سادگی و تواضع اور لاابالی کی نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کیا تم کو تاریخ عالم کی اُن درخشاں شخصیتوں کی زندگیاں یاد نہیں جنکو دنیا ابو بکر صدیق اور عمر فاروق کے نام سے جانتی ہے۔ دُنیا بھر کی دولت اُن کے قدموں میں پڑی تھی مگر اُن کے استغنا اور بے نیازی میں کوئی فرق نہ آیا۔ کل دُنیا کی تاریخ ٹٹول جاؤ مگر تمہیں صدیق وفاروق جیسی تابناک ہستیاں مشکل سے نظر آئیں گی۔ عمر کے پاس دولت کے خزانے تھے مگر انھوں نے آخر وقت تک اپنے رفقا کار کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ روم و شام کی سرسبز وادیوں میں پہنچکر اپنا موٹا جھوٹا لباس اُتار ڈالیں اور اُس کے بجائے قاقم و سنجاب زیب تن کریں۔ کانگریسی وزراء کو بھی اسی نمونہ پر عامل ہونا چاہیے۔" (اخبار مدینہ بجنور ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء)

کیا تعاکس فہم ہے کہ گاندھی تو اپنی زیر اثر قوم کو ساری دُنیا کے نمونوں سے ہٹا کر اسوۂ صحابہ

کی طرف لانا چاہتے اور مسلمان اپنی تحریروں اور تصنیفوں میں پیروانِ صحابہ کو اُن کے سادہ نمونوں سے ہٹا کر دُنیا کے اُن تنعّم خیز اور مہلک نمونوں میں پھنسانے بلکہ دھنس جانے کا مشورہ دیں جن کا عبرتناک حشر روز بروز آنکھوں کے سامنے آرہا ہو۔

"ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا"

سچ فرمایا تھا مسند آرائے حجاز حضرت اعلم الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اُمّت میں پہلے عمل اُٹھے گا پھر فہم۔ ارشادِ نبوی ہے۔

کیف بکم اذا فسق فتیانکم	تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان بدچلنی کریں گے اور تمہاری
وطغی نساءکم؟ قالوا وان	عورتیں آزاد ہو جائیں گی (یعنی عمل اُلٹا ہو جائیگا۔ تقویٰ کی بجائے
ذالک لکائنا یا رسول اللہ	فسق و فجور ہونے لگیگا) سب نے حیرت سے عرض کیا کہ اے اللہ کے
قال نعم واشد۔ کیف بکم	رسول کیا ایسا وقت بھی آنا ہے؟ فرمایا ہاں بلکہ اس سے بھی سخت۔
اذا لم تأمروا بالمعروف	تمہارا اسوقت کیا حال ہوگا جب تم اچھی باتیں بتلانا چھوڑ دوگے
ولم تنھوا عن المنکر قالوا	اور بُری باتوں سے روکنا ترک کردوگے؟ یہ سنکر سب نے عرض
وان ذالک لکائنا یا رسول اللہ	کیا کہ کیا یہ بھی ہونا ہے؟ فرمایا ہاں بلکہ اُس سے بھی سخت۔
قال نعم واشد۔ کیف بکم اذا	اُسوقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم بُری باتیں تو بتلانے لگوگے
امرتم بالمنکر ونھیتم عن المعروف الخ	اور بھلائی سے روکوگے الخ (یہ فہم کا اُلٹ جانا ہے کہ بھلائی بُرائی
	نظر آنے لگے اور بُرائی بھلائی معلوم ہو۔ اعاذنا اللہ منہ)

بہرحال ان سائنسی ایجادات کے متعلق ہم نے جو کچھ حوالجات یورپین مدبروں کے اقرار و اعتراف

سے پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی اسلامی حقائق سے جو کچھ موجودہ تمدنی ترقیات پر روشنی ڈالی ہے اس کو پیش نظر رکھکر ضرورت سائنس کے مذکورہ دلائل بیحد کمزور اور بے معنی ثابت ہوتے ہیں اور جس طرح اپنوں کیلئے قابل تسلیم نہیں اسی طرح غیروں کے نزدیک بھی وہ معقولیت نہیں رکھتے۔ اس لئے ہمارا نظریہ اب بھی وہی ہے کہ مسلمان تو بجائے خود ہے اگر عیسائیوں نے بھی قرآنی عہد میں خود قرآن ہی کے فطری اور ہمہ گیر اصول سے روشنی حاصل کی اور پھر اس دشمن ذہنیت کے ماتحت روحانیت سے کنارہ کش ہو کر مادی ترقی اور سائنسی موشگافیاں بھی کیں تو بلاشبہ انہوں نے یہی کیا کہ روح کو جدا کر کے جسمانی لاشوں پر آگرے جس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ روح اگر پہلے سے نہ رہی تھی تو جسم بلا روح بعد چندے ختم ہو گیا اور اس بے روح جسد کو سڑنے اور بسنے ہی سے سڑاند اور بدبو ان کے دماغوں میں پہنچی اور پھیلکر بس گئی آخر انسانوں جیسی لطیف المزاج مخلوق کو ایک ایسا کثیف درندہ صفت جانور بنا دیا جس کی کوئی ظاہری اور باطنی کل سیدھی ہی نہ ہو۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ	ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے
ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ	پھر ہم اس کو پستی کی حالت میں الوسع بھی پست تر کر دیتے ہیں۔
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظام کی برکات

کاش مسلمانوں نے ہی قرآنی روشنی کو مادیات سے مستغنی ہو کر روحانی خزائن ڈھونڈنے کے لئے استعمال کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ روحانی برکات اور مادی ثمرات دونوں سے مستفید ہوئے انہوں نے قرآن کے زیر سایہ اپنے تمدن کی بنیاد اخلاق حسنہ اعمال صالحہ تربیت خلائق الشراء اور بنگہداشت امین و دیانت پر قائم کی شعائر دین کو برپا کیا صلوٰۃ و زکوٰۃ امر بالمعروف

نہی عن المنکر کی اقامت کو ہی تمکین و سلطنت کی اصلی غایت قرار دیا۔ ساری دنیا کو زیر نگیں کیا
مگر شہوت رانی کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ ساری دنیا پر قابو اور دسترس پا کر اُسکی شہوات اور حظ نفسانی کے
سے دنیا کو بچنا سکھا دیں پس انہوں نے دنیا اور اس کی لذائذ کو حاصل کیا مگر اس لئے کہ حمام تقوے
کا ایندھن بنائیں اور اُسے جلا کر تقویٰ کا حمام گرمائیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است

کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

پس جبکہ انہوں نے دین الٰہی کو سر پر رکھا تو دنیا پیروں میں آ گری دین کا گرانمایہ خزانہ سر پر
رکھکر دنیا کے مرکب پر سوار ہوئے اور آخرت کی منزلیں قطع کرنی شروع کیں۔ اور اس طرح
اس شوخ گھوڑے کے مونہہ میں لگام دی کہ وہ اپنی سب شوخیاں بھولکر تابع فرمان ہو گیا۔ اور دنیا
کی تمام اقوام یا موجودہ متمدن اقوام کی طرح اسلامی قوم کو پچھاڑ دینے کی ہمت پڑی اسوقت تک
کوئی بھی طاقت نہ ہوئی جب تک کہ مسلم قوم نے قرآن کا خزانہ اپنے سروں پر لئے رکھا چنانچہ
تاریخ کے اوراق میں اُن کی حقیقت افروز داستانیں سنہرے حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

اس تمام بحث کی غرض و غایت جو سائنس یا سائنٹفک آلات کے سلسلہ میں کی گئی ہے
یہ نہیں ہے کہ ان آلات کی ساخت یا انکا استعمال ناجائز ہے یا کلیۃً اُن کا سدباب کیا جانا منظور
نظر ہے یہ نہیں بلکہ ضرورت داعی ہو تو بے پر اگر ان وسائل تمدن سے خدمت لیجائے اور کسی نیک
مقصد کے ماتحت انہیں استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مقصد کی ترجیح کے مطابق
ہی اُن کی ضرورت کا مرتبہ قائم ہو گا اس حد سے گذر کے بعض اوقات انکا استعمال لازمی اور ضروری ہو جائیگا۔

اِسلام کا دائرہ کسی تمدنی ایجاد کو قبول کرنے سے ہرگز تنگ نہیں۔ لیکن اُسے مقصود سمجھے اور اُسی کیساتھ مقاصد کا سا برتاؤ کرنے سے یقیناً تنگ ہے۔ پس اسلامی مقاصد کے ماتحت وہ تمام ایجادات جنہیں اُسکے قواعد ممنوع نہیں ٹھہراتے بلاشبہ ضرورت کی حد تک استعمال میں لائی جاسکتی ہیں اور ظاہر ہے ضرورت وہی ہے جو خود بخود پیدا ہو اور جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو نہ وہ کہ جسکو سوچ سوچکر ہم خود پیدا کریں۔ اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے تمدنی وسائل کا مرتبہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا کہ جس حد تک اُنکے استعمال سے چارہ نہ رہے انہیں استعمال کیا جائے۔

اِس لئے ہماری نکتہ چینی فی الحقیقت اِن آلات و ایجادات پر نہیں بلکہ اُنکو مقصود زندگی سمجھ لینے پر یا اُس ذہنیت پر ہے جس کے ماتحت یہ وسائل و آلات مقاصد کی لائن پر لائے جاتے ہیں، انہیں تمدن کے سلسلہ میں بنیادی رنگ دیا جارہا ہے حتیٰ کہ آج اِن کے نہونے سے زندگی ناقص اِن کے نہ سیکھنے سے طلبہ نالائق اور اِن کے نہ سکھلانے سے معلموں کا طبقہ نکما ٹھہرا دیا گیا ہے حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مطمئن زندگی کو تمدن کے اس غلو اور ان انتہائی وسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں چہ جائیکہ وہ اُس پر موقوف ہو۔

ظاہر ہے کہ جو قوم ان آلات و ایجادات کو وسائل محض اور وہ بھی وقتی وسائل سمجھکر مقاصد کے ماتحت استعمال کرے گی وہ نہ اُن میں غلو کر سکتی ہے نہ ہمہ وقت انہی کی ہو سکتی ہے اُسکی نظر سب سے پہلے اپنے مقاصد پر ہو گی۔ اور ثانیاً ان وسائل پر۔ اس لئے ایسی قوم کو اُس قوم پر قیاس کرنا جس کی زندگی کا منتہائے نظر یہی وسائل تمدن قرار پا چکے ہوں اور وہ اُنہیں قبلۂ قلب بنا چکی ہو قیاس مع الفارق کی بہت نازیبا مثال ہے یہ دونوں قومیں مقاصد زندگی کے لحاظ سے

دو متضاد جانبوں میں ہیں گو اصولِ نظام کے مشترک ہونے سے اُن کے کاموں کی انتظامی شکل یکساں محسوس ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم کی روشنی میں ان دونوں قوموں نے دو راستے دیکھے ایک نے اپنی قومی تربیت کے ماتحت مادیت کا راستہ دیکھا اور ایک نے اپنی قومی تربیت کے مطابق رُوحانی راستہ۔ بالفاظ دیگر ایک نے مادی ہدایت پائی اور ایک نے رُوحانی اور پھر ان جامع اُصول کی روشنی میں ہر ایک فی اپنی اپنی لائن کی ایسی بے نظیر ترقی کی کہ دُنیا کی پوری زندگی میں اُس کی مثال نہیں مل سکتی۔

کمال ہدایت اور کمال ضلالت دونوں دورۂ اسلامی ہی میں ممکن ہیں

یہاں سے ایک لطیفہ اور سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ ایسی جامع اور ہمہ گیر تعلیمات کو دور دورہ میں جیسے قرآن نے لاکر پیش کیا اگر ہدایت ہمہ گیر ہو سکتی ہے خواہ وہ مادی ہو یا رُوحانی ہمہ گیر ہو سکتی ہے تو گمراہی بھی ہمہ گیری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہر وجودی اصل کے ساتھ اس کی عدمی ضد بھی لگی ہوئی ہے۔ مادیات ہوں یا روحانیات اضداد کے تقابل سے خالی نہیں۔ نور کیساتھ ظلمت۔ دن کیساتھ رات۔ سفیدی کیساتھ سیاہی۔ صحت کیساتھ مرض۔ صدق کیساتھ کذب۔ اخلاص کیساتھ نفاق۔ اسلام کیساتھ کفر۔ طاعت کیساتھ معصیت۔ آبادی کیساتھ ویرانی۔ حیات کیساتھ موت۔ رفعت کیساتھ پستی۔ عزت کیساتھ ذلت۔ بھلائی کیساتھ برائی۔ خوبی کیساتھ خرابی۔ خیر کیساتھ شر۔ اور خلاصہ یہ کہ ہر نعمت کے ساتھ آفت لگی ہوئی ہے۔ پس جس طرح ہر وجودی اصل کے ساتھ اس کی عدمی ضد لازم ہے اسی طرح ہر اصل کیطرف التفات کے وقت اُس کی ضد کی طرف توجہ ہونا بھی لازم ہے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو تعلیم جس درجہ میں بھی کسی اصل اور حقیقت سے آشنا بنائیگی وہ اُسی درجہ میں اُس کی ضد کیطرف بھی خیالات کو ملتفت کریگی۔ فرق اگر ہوگا تو یہ کہ اصل حقیقت کی طرف تو تحصیلی التفات ہوگا اور اُس کی ضد کیطرف دفاعی مثلاً اگر ایک تعلیم اخلاص کیطرف توجہ دلائے تو ناگزیر ہے کہ اُسکی ضد نفاق کیطرف بھی ذہن خود بخود ملتفت ہو۔ مگر اخلاص کیطرف حصول کا التفات ہوگا اور نفاق کیطرف دفعیہ کا ورنہ کوئی اخلاص بغیر نفاق کے دفعیہ کے کامل ہی نہیں ہوسکتا۔ یا مثلاً اگر کسی تعلیم کے ذریعہ ہم صدق کیطرف توجہ کریں تو کذب کے تصور سے بھی چارہ نہیں کیونکہ کوئی صدق بغیر دفع کذب کے واقعی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جس درجہ کذب کے شائبوں کو ختم کیا جاتا رہیگا اُسی درجہ میں صدق میں مضبوطی آتی رہیگی پس ہر تعلیم کا قدرتی ثمرہ ہی یہ ہے کہ اُس سے جس قدر گوشے ہدایت کے کھلیں اُسی قدر زاویئے اُس کی ضد ضلالت کے بھی واشگاف ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ اگر قلوب میں رُشتی اور استقامت کیساتھ ہدایت سے مناسبت ہوگی تو وہ اس تعلیم سے اصولی حقائق کی طرف جھک کر اُن کی اضداد سے بچاؤ اختیار کریں گے اور ..... جنہیں کجی اور زیغ کیساتھ گمراہی سے ہی لگاؤ ہوگا وہ اُسی تعلیم سے اضداد کیطرف مائل ہوکر اصل حقیقت سے دور جا پڑیں گے گویا قلوب کے اس خلقی تفاوت کے سبب ہر تعلیم سے ہدایت وضلالت یکساں پیدا ہوسکتی ہے۔ پس اگر اسلام کی تعلیم جامع تعلیمات عالم ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقلاً ونقلاً ثابت کیا جاچکا ہے تو اس نظریہ کی رو سے ناگزیر ہے کہ اس اُمت میں قلوب کے تفاوت سے جس درجہ کے ہدایت یافتہ پیدا ہوں اُسی درجہ کے گمراہ بھی ظاہر ہوں جتنے پہلو ہدایت کے کھلیں اتنے ہی گمراہی کے

بھی واضح ہوں۔ یہی قرآن جامع ہدایت کا سبب بھی بنے، اور یہی جامع گمراہیوں کا بھی۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ
بہت سوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ گمراہ وہی ہوتے ہیں جو حکم سے باہر ہیں۔

اور حدیث مسلم میں ہے

اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ ۔
قرآن یا تمہارے حق میں حجت ہے یا تمہارے خلاف دلیل

پس اس امت میں اگر ہمہ گیر اور جامع تعلیمات کے سبب وہ ساری ہدایات جمع ہوں جو دنیا کی مختلف اقوام کو وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہیں تو اسی امت میں وہ ساری گمراہیاں بھی ضرور جمع ہونی چاہئیں جو کسی کسی وقت دنیا کی مختلف امتوں کو بھٹکاتی رہی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے۔

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّ بَاعًا بِبَاعٍ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلَ اَحَدٌ مِّنْهُمْ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ ۔
تم پچھلے گمراہوں کی ضرور پیروی کروگے بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر یعنی چھوٹے چھوٹے سے چھوٹے خرافات میں یہاں تک کہ اگر انہیں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں گھسا ہوگا تو تم بھی گھسوگے۔

غرض اگر اس امت کا مطمع حصہ خاتم الہدایات ہو تو ضرور ہے کہ اسی امت کا منکر حصہ خاتم الضلالات بھی ہو۔ لیکن اگر ہدایت کی حقیقت کمال روحانیت ہے اور گمراہی کی حقیقت خمولِ روحانیت اور اگر کمال روحانیت مادیات سے اعراض کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ...... یا فسادِ روحانیت مادیات میں غرق ہوئے بغیر نہیں آسکتا۔ تو یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ قرآن کی جامع تعلیمات سے گمراہیوں کی اشاعت کا سبب یہ مادیات ہی بن سکتی ہیں جنسے روحانیات کے دائرہ میں

فساد پھیلتا ہے۔ نہ کہ خود روحانیات۔ اور بالفاظِ دِگر گمراہی عامہ کا واقعی ذریعہ یہی قوم بن سکتی ہے جو
قرآنی تعلیمات کے ذریعہ مادیات میں منہمک ہو کر روحانی تکمیل سے بیزار ہو جائے اور مادی اختراعات
ہی اس کی ترقیوں کا انتہائی مبلغ پرواز قرار پا جائیں۔ پس انجام کار امت میں ہمہ گیر گمراہی کی ذمہ داری
صرف مادیات کی غیر محدود ترقی اور اس تصویری نظام کے سر عائد نکلتی ہے جس کی کیفیت ہم اہم
عنوان سے تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں کہ صورت بوجہ شدت مناسبت کے چونکہ ہم رنگ حقیقت
ہوتی ہے اس لئے اگر صورت کو حقیقت شناسی کا ذریعہ بنائے بغیر مستقلاً مقصود ٹھہرا لیا جائے تو
وہ خود ہی حقیقت کی جگہ لیکر برنگ حقیقت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اور اسطرح ایک حقیقت
ناشناس صورتوں ہی کو حقیقت سمجھکر حقیقت سے دور جا پڑتا ہے۔ پس یہ صورت جو اپنی حقیقت
کے تعارف کا ذریعہ بنتی اس حقیقت کیلئے خود ہی حجاب بنجاتی ہے اور اس طرح یہ صورت پسند اس
صورت کے چند ناپائدار منافع میں اپنی ہمتوں کو صرف کر کے حقائق کے دائمی منافع سے ہمیشہ کے
لئے محروم ہو جاتا ہے۔ جس سے اسکا واقعی چین اور حقیقی سکھ کلیۃً ختم ہو جاتا ہے اور اسطرح اس تصویری
نظام کے چند جسمانی فوائد کی قربانگاہ پر سارے روحانی سکون و عیش کی قربانی ہو جاتی ہے اس لئے یہ
صوتیں اور تصویری ایجادیں دجل و فساد اور تلبیس کا ذریعہ بنکر ہمہ گیر گمراہی اور قلوب کی بے چینی
اور بدامنی کا ذریعہ بنجاتی ہیں۔

موجودہ تمدنی ایجادات کے دو متضاد تصویری اور تمثیلی پہلو

ہاں مگر یہ بھی پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی نمونے اور ایجادات کے
نئے نئے ڈیزائن باطنی حقائق اور اعتقادیات مذہب کی محسوس مثالیں
بھی ہیں جن کے ذریعہ بشرطِ غور و فکر غیر محسوس حقیقتوں اور غیبیات کا یقین بھی میسر آسکتا ہے کہ یہی

صورتیں ان حقائق سے کامل مشابہت و مناسبت رکھنے کے سبب ان کے لئے آئینۂ حقیقت نما بھی ہیں جنہیں سے اُن لطیف حقائق کے باریک خدوخال صاف دکھلائی دینے لگتے ہیں۔ اور اسطرح ایک جویائے حق کے لئے رُوحانیات کا یاور کر لینا بالکل سہل ہو جاتا ہے۔

سائنٹفک ایجادات سے قوم میں دو متضاد استعدادیں

یہاں سے ہم اس بنیادی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان تمدنی ایجادات اور مادی اختراعات میں اُصولاً دو پہلو صاف نمایاں ہیں۔ ایک پہلو اُن کے محض "تصویری" ہونے کا ہے جس سے تلبیس حقیقت، وحق پوشی کا تعلق ہے۔ اور دوسرا پہلو اُن کے "تمثیلی" ہونے کا ہے جس سے کشف حقیقت اور حق نمائی کا تعلق ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے طبعاً ضروری ہے کہ یہ مادی ایجادیں قوم میں دو ہی قسم کی استعدادیں پیدا کریں ایک یہ کہ قوم مادی لذات اور انتہائی تعیش میں منہمک ہو کر حقیقت و اصلیت سے بعید ہوتے ہوئے اس حد پر آجائے کہ اگر کوئی گمراہ کن مادی پیشوا ازراہ دجل و فساد صورتوں کی رنگینی دکھلا کر انہیں کسی ناپاک سے ناپاک گمراہی کی طرف بھی لانا چاہے تو بآسانی لا سکے۔ اور دوسری استعداد یہ کہ قوم اُنہی مادی مثالوں کے ذریعہ معنوی اسرار اور غیبی اُمور سے مرتب ہوتے ہوتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اگر کوئی رُوحانی ہادی اِن صورتوں کو پامال فنا دکھلا کر اُس کی تہ حقیقت کی طرف پلٹنا چاہے تو بسہولت پلٹ سکے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں تو دنیا ایسی ہمہ گیر گمراہی کی استعداد پر آجاتی ہے کہ اُس کا کوئی گوشہ بھی بدراہی و بدکاری سے خالی نہ بچے اور وہ ظلم و جور سے لبریز ہو جائے۔ اور دوسری صورت میں ایک ایسی صلاحیت و قابلیت پر پہونچ جاتی ہے کہ انجام کار اُس کا کوئی بیت و بر و مدر ایسا باقی نہ بچے کہ اُس میں اصلی ہدایت و صداقت کی روشنی نہ پہنچ جائے۔

دو متضاد پیشروؤں کی آمد | اور جبکہ یہ ایجادات عالم النفس میں "ہدایت" و "ضلالت" کی یہ دو انتہائی
استعدادیں پیدا کر رہی ہیں تو ضرور ہے کہ یہی ایجادات عالم آفاق میں ایسے دو پیشروؤں کی آمد کا راستہ
بھی صاف کر رہی ہیں۔ جنمیں سے ایک اپنی انتہائی گمراہی اور کجروی کے سبب گمراہیوں کا مخزن شر و
فساد کا محور اور دجل و تلبیس کا منبع ہو جو ضلالت کو ہمرنگ ہدایت اور باطل کو بشکل حق دکھلا سکے
نیز اپنی غیر معمولی نظر فریبیوں سے اس ہمرنگ ہدایت گمراہی کو وہ فروغ دے کہ ایک دفعہ ساری دنیا
کفر کو ایمان سمجھکر اُس کے دامن ہی جا لگے۔ اور دوسرا اپنی انتہائی روحانیت و راستبازی اور اپنے
غیر معمولی تقرب کی نسبتوں کے سبب حق و صدق کا منبع ہو اور جو باطل کے حق نما پردوں کو چاک
کر کے حق کو اُسکی اصلی صورت میں پیش کرے نیز اپنے خارق عادت کمالات کے ذریعہ حق اور سچی
حقیقتوں کو ایسی ہیبت و شوکت کے ساتھ دنیا میں پھیلائے کہ ساری دنیا صورتوں سے [illegible]
نکلکر حقائق کیطرف ڈھل جائے۔ گویا یہ دونوں متضاد پیشرو ہمہ گیری لیکر آئیں کہ یا وہ خود ساری دنیا
میں گھوم جائیں اور یا اُن کے اثرات زمین کے چپہ چپہ کا مسح کر جائیں۔ غرض دونوں کا مسح
ارض عام ہو اس لئے خواہ نام بھی اُنکا مسیح ہی پڑ جائے مگر ایک کا مسیح ہدایت اور ایک کا مسیح ضلالت
پھر چونکہ دونوں مسیحوں کے پیام قبول کرنے کی استعداد عالم میں ان مادی اور تمدنی ایجادات ہی نے
پیدا کی تھی اسلئے ناگزیر ہے کہ ان دونوں مسیحوں کو دنیا کی ان تصویری ایجادات اور نو بنو شکلوں سے
کافی تناسب اور لگاؤ بھی ہو یہاں مسیح ضلالت کو تو اُن صورتوں کے تلبیسی پہلو سے تعلق ہو تاکہ وہ
قوم کی اس فاسد استعداد سے کام لیکر جو اُن مادیات کے تصویری پہلو سے پیدا شدہ تھی اُسے حقیقت
کا دشمن اور باطل کا پرستار بنا سکے اور مسیح ہدایت کو ان صورتوں کے تمثیلی پہلو سے تعلق ہو تاکہ وہ قوم

کی اُس صلاحیت سے کام لیکر جو ان مادیات کے تمثیلی پہلو سے پیدا شدہ تھی اُسے باطل سے نفور اور حق کا سچا شیدائی بنا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے دُنیا کے آخری دور میں جبکہ صورت پسند اُمت مسیحیہ کے غلبہ و شیوع اور گویا اُن کے تصویری تمدن کے پھیل جانے کی خبر دی ہے تو اُس کی انتہا پر ایک مسیح ضلالت کے خروج کی بھی اطلاع دی ہے جو در حقیقت ان تصویری تلبیسات کا نتیجہ اور نچوڑ ہوگا۔ جسکو دجّال اعظم کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور اُس کے تلبیسی فتنوں سے اُمت کو ڈرایا ہے ہاں دجّالی فتنہ کی انتہا ہو جانے پر پھر ایک مسیح ہدایت کے نزول کی بھی خبر دی ہے جنکو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مبارک نام سے یاد کیا ہے جنہیں سے ہر ایک مسیح اپنی فطری ساخت کو مناسب قسم کی استعدادوں سے کام لیگا جو اُس میں ان مادّی و تصویری انہماک سے پیدا ہو کر اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہوگی۔

خاتم الکمالات اور خاتم الفسادات

پس جس طرح غیبی جہانوں میں ملائکہ کا مقابلہ شیاطین سے ہے ملائکہ مخزن صلاح ہیں اور شیاطین مخزن فساد اسی طرح اس محسوس جہاں میں انبیاء کا مقابلہ دجّالوں سے ہے انبیاء مخزن خیر و کمالات ہیں اور دجّال مخزن شر و فسادات۔ پھر جس طرح ملائکہ و شیاطین میں ایک ایک فرد خاتم ہے جس پر اُس نوع کے تمام مراتب ختم ہو جاتے ہیں اور وہی اپنی نوع کے لئے مصدر فیض ہے۔ ملائکہ کے لئے جبریل علیہ السلام جس سے کمالات ملکیت ملائکہ کو تقسیم ہوتے ہیں اور شیاطین کیلئے ابلیس لعین جس سے تمام شیاطین کو قساوت شیطنت تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء و دجاجلہ میں بھی ایک ایک فرد خاتم ہے جو اپنے دائرہ میں مصدر

فیض ہے۔ انبیاء علیہم السّلام میں وہ فردِ کامل اور خاتم مطلق جو تمام کمالاتِ نبوت کا منبع فیض ہے اور جس کے ذریعہ سارے ہی طبقۂ انبیاء کو علوم و کمالات تقسیم ہوئے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ادھر دجّالوں میں وہ فردِ واحد جو تمام تلبیسات و مکائد اور شرور و مفاسد کا مخزن ہے اور سارے ہی طبقۂ دجاجلہ کو جس کے باطن سے فیض دجل پہنچ رہا ہے "دجّالِ اعظم" ہے۔ پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالاتِ بشریہ کے خاتم ہیں اور دجّال تمام شرورِ بشریہ کا خاتم ہے۔ وہ دنیائے روحانیت کے شہسوار ہیں اور یہ میدانِ مادیت کا ایک چالاک۔

دونوں خاتموں کا مقابلہ اور ان کی متضاد علامتیں

ہاں پھر چونکہ نبوت کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس سے گذر کر محض خدا کی عظمت و جلال کا سکہ اپنے قلب میں جمائے جس کا خلاصہ عبدیت نکلتا ہے کہ یہی دائرۂ بشریت کا انتہائی کمال ہے۔ اور دجّالیت کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی کو چھوڑ کر اس درجہ خودی اور خود پسندی پر آجائے کہ خدا کی عظمت و ہیبت کا کوئی نشان گوشۂ قلب میں باقی نہ رہے اس لئے ضروری ہے کہ خاتم النبیین پر تو تمام مراتبِ عبدیت ختم ہو جائیں اور اس کی خاتمیت کے معنی ہی یہ ہوں کہ جس طرح خدائے وحدہٗ معبودِ مطلق ہے یہ خاتم عبدِ مطلق ہو یعنی جس طرح وہ معبودیت میں بے ہمتا اور بے نظیر ہے یہ عبدیت میں بے ہمتا اور بے مثل ہو کہ اس سے بڑھ کر عبدیت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو جو کسی دوسرے میں پایا جائے اور اس لئے معبود کی جانب سے اس پر کمالات بھی وہ فائز ہوں جو طبقۂ انبیاء کے اور کسی فرد پر نہ ہوں پس اگر اس سے پہلے کے انبیاء نبوت کا دعویٰ کریں تو یہ ختمِ نبوت کا مدعی ہو۔ ادھر اس کے بالمقابل خاتم الدجّالین پر تمام مراتبِ خودی و خود پسندی ختم ہو جانے چاہئیں بلکہ

اُس کی ختمِ دجّالیت کے معنی یہی ہوں کہ دجّالیت کے طبقہ میں خودی و رعونت میں اُس سے بڑھکر
کوئی نہو۔ پس اگر اور دجّال اپنی تلبیس کاری سے نبوت کے مدعی ہو کر دجل و فساد پھیلائیں تو خاتم
الدّجالین خدائی کا دعویٰ کر کے اپنی تلبیس آرائی کرے حتّٰی کہ اس دعویٰ کے منوانے میں خوارق
اور کرشمے تک بھی دکھلائے۔ اسی لئے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اُمت میں ایسے
۳۰ دجالوں کی خبریں دی ہیں جو دعوائے نبوت کر کے دین میں تلبیس پھیلائیں گے وہیں اس دجال
اعظم کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ دعوائے خدائی کر کے مکر و زور پھیلائے گا۔

پھر جیسے عام انبیاء کی ہدایت مقامی تھی اور خاتم الانبیاء کی عالمگیر اسی طرح عام دجالوں کا
کید و مکر اگر مقامی ہوگا تو اس خاتم الدجالین کا کید عالمگیر ہوگا۔

پھر جیسا کہ عام انبیاء کی نبوت کا اظہار محض اُن کے قولی دعویٰ سے ہوتا تھا لیکن خاتم الانبیاءؐ
کی نبوت کا اظہار محض قولی دعویٰ ہی سے نہیں ہوا بلکہ بدنی خلقت پر بھی آثارِ نبوت نمایاں ہو گئے
جو نبوت کا اعلان تھے یعنی حضورؐ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہرِ نبوت نمودار تھی جس پر
حسب بعض روایات کچھ حروف بھی مرقوم نظر آتے تھے جو رسالت کو ظاہر کریں۔ ٹھیک اسی طرح
اور دجالوں کا شر و فساد ... اگر محض اُن کے قول یا کسی فعل سے نمایاں ہوا تو خاتم الدجالین کے
قلب فاسد کا شدید دجل و کفر اُس کی خلقت تک سے نمایاں ہوگا چنانچہ بحوالۂ حدیث نبوی
اُس کی پیشانی پر ک ف ر لکھا ہوگا جو گویا مہرِ دجل و فساد ہوگی۔

بہرحال اس عمومی تقابل اور نسبت تضاد کو سامنے رکھ کر نمایاں ہو جاتا ہے کہ دجال اعظم کا اصل
مقابلہ ذات بابرکات نبوی سے ہی ہے کہ آپ تمام قرون دنیا کے خاتم کمالات ہیں اور وہ خاتم فسادات

آپ عبدیت مجسم ہیں اور وہ رعونت مجسم۔ آپ بفحوائے حدیث و محمد فرق بین الناس فارق حق و باطل ہیں وہ تلبیس افزائے حق و باطل ہے۔ آپ مہر نبوت سے سرفراز ہیں وہ مہر دجل و کفر سے ممتاز ہے۔ آپ بندگی محض کے مدعی ہیں وہ خدائی محض کا مدعی ہے۔ اسلئے اگر خاتم النبیین کے دور ۔۔۔۔ میں ہمہ گیر کمالات کا ظہور ایک امر طبعی تھا تو اسی کے دور ۔۔۔۔ میں ان کمالات کی اضداد اور ہمہ انواع فسادات کا شیوع بھی ایک امر طبعی تھا اور اسی لئے خاتم الدجالین کو بھی جو خاتم فسادات ہے خاتم النبیین ہی کے دور ۔۔۔۔ میں خروج کرنا چاہیئے تھا۔ کہ اس کے عمیق دجل و فساد کا مقابلہ محض نبوت کی طاقت نہ کرسکتی جب تک کہ اس کے ساتھ خاتمیت کی بے پناہ قوت نہ ہو۔ نیز خاتم کمالات کی پوری پوری عظمت و شان اور روحانی قوت بھی اسوقت تک نہ کھل سکتی تھی جب تک کہ اس کے کمالات کی اضداد یعنی سارے ہی شرور و فسادات اپنے پورے کر و فر کیساتھ ہی آخری شخصیت خاتم الدجالین کے ہاتھ پر ظاہر ہو کر بری طرح شکست نہ کھا جائیں۔

مقابلہ کی صورت

ہاں مگر مقابلہ کی اگر یہ صورت ہوتی کہ دجال اعظم کو حضور کے زمانہ خیر ہی میں ظاہر کر کے شکست دلادی جاتی تو ظاہر ہے کہ فتح و شکست کا یہ مظاہرہ ناقص رہجاتا کیونکہ نہ فسادات دجال ہی سب کے سب تدریج نمایاں ہو سکتے اور نہ کمالات نبوی ہی سب کے سب کھل کر انہیں شکست دے سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ خیر کے ہر ہر پہلو کی طاقت اور شر کے ہر ہر پہلو کی کمزوری کھلے بغیر ہی مقابلہ ختم ہو جاتا اور دنیا آخرت کی کشائے جا لگتی۔ حالانکہ خاتمیت سے مقصود تکمیل ہوتی ہے اور اسی لئے خاتم کو سب سے آخر میں لایا جاتا ہے مگر اس صورت میں کسی پہلو کی بھی تکمیل نہ ہوتی اور تمام تر کا آنا عبث ہو جاتا۔ اس لئے دجال اعظم کو بھی قیامت تک موقعہ دیا گیا کہ وہ ہر ہر پہلو سے چھپ کر اور کھلکر فساد پھیلائے۔

بواسطہ اور بلاواسطہ اپنی دجالیت سے دُنیا میں تلبیس حق بالباطل کا جال پھیلائے تاکہ ایک دفعہ یہ
ساری ہی شرور اپنی سطحی چمک دمک کیساتھ ظاہر ہو جائیں اور اپنا فروغ دکھلا کر بے وزن قلوب کو اپنی
طرف مائل کر سکیں۔ اور ختم نبوت کی طاقت کو بھی قیامت تک باقی رکھکر موقعہ دیا گیا کہ وہ اپنی
مخفی طاقتوں سے دجالی کر و فر کے پرخچے اڑاتی رہے اگر یہ دجل و فساد علوم نبوی میں فتنۂ شبہات کی
ظلمت پیدا کرے تو یہ حقانی طاقت نور یقین سے اُسے شکست دے۔ اور اگر اعمال میں فتنۂ شہوات کھڑا
کرے تو صبر و تحمل کے نبوی اخلاق سے اُسے پسپا کر دے اگر تمدنی لائن میں فتنے برپا کرے تو سیاست
نبوت آڑے آکر اُنہیں ختم کر دے۔ غرض جس رنگ میں بھی دجل و فساد ظاہر ہو اُسی رنگ میں کمالاتِ نبوت
اُسکو دفع کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ فساد کی استعداد کامل ہو کر گویا دجالِ اعظم کے ظہور کا تقاضا کرنے لگے
اور ادھر صلاح و کمال کی قابلیت بھی اپنا دورہ مکمل کر کے اس کی کھلی شکست کی طلبگار ہو جائے
تا آنکہ ختم نبوت اس خاتم دجالین کو شکست دیکر ہمیشہ کیلئے دجل کا خاتمہ کر دے۔

پس جبکہ خروج دجال زمانہ نبوی میں مناسب نہ ٹھہرا بلکہ خاتمہ دُنیا پر مناسب ہوا تو پھر اب
اُس کے مقابلہ کی ایک صورت تو یہ تھی کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو خروج دجال کے
وقت قبر مبارک سے تکلیف دیجاتی کہ آپ بنفس نفیس اس کے مفاسد کو مٹائیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ
یہ صورت شان اقدس سے فروتر تھی۔ اور آپ اس سے اعز و اکرم تھے کہ آپ پر دو موتیں طاری
کی جائیں یا ایک دفعہ قبر مبارک سے نکالکر پھر دوبارہ قبر دکھلائی جائے۔

پھر ایک شکل یہ تھی کہ حضور کو خروج دجال تک دُنیا ہی میں مقیم رکھا جاتا لیکن اس صورت کا
شان اقدس کے لئے نازیبا ہونا پہلی صورت سے بھی زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اول تو اس صورت میں

حضورؐ کی بعثت کا آخری اور اصلی مقصد محض مدافعتِ دجّال ٹھہر جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دوسرے دجّال کی اہمیت اسقدر بڑھ جاتی کہ گویا اُسی کے خوف کی خاطر حضورؐ کو دُنیا میں صدیوں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ نیز اُمّت کے کمالات بھی اِس صورت میں پردۂ خفا میں رہ جاتے۔ کیونکہ آفتابِ نبوّت کی موجودگی میں کس ستارہ کی مجال تھی کہ اپنا نور نمایاں کرسکے۔ اِس طرح تمام طبقاتِ اُمت کے جوہر چھپے رہ جاتے اور گویا عُلَماءِ اُمّتی کانبیاءِ بنی اسرائیل کا ظہور بھی نہ ہوسکتا۔ اور اِس سب کے علاوہ یہ صورت خود اصل موضوع ہی کے خلاف پڑتی ہے یعنی دجّال کا خروج ہی ناممکن ہو جاتا جس کیلئے مدافعت کی یہ صورتیں درکار تھیں۔ کیونکہ دجّال اور اُس کے مفاسد کا زور پکڑنا تو حضورؐ ہی کے زمانہ سے بُعد ہو جانے کے سبب سے ہوسکتا تھا۔ اور جبکہ آپ خود ہی قیامت تک دُنیا میں تشریف رکھتے تو اس کے یہ معنی تھے کہ عالم میں کوئی فتنہ ہی نہ پھیلتا کہ قلوب میں شر کی استعداد بڑھے اور خروجِ دجّال کی نوبت آئے پس اِس صورت میں خروجِ دجّال ہی ممکن نہیں رہتا چہ جائیکہ اُس کی مدافعت کی کوئی صورت فرض کی جائے۔ بہرحال اس صورت میں نہ اُمّت کے کمالات کھلتے نہ ختمِ نبوت کی بے پناہ طاقت واضح ہوتی جس سے یہ واضح ہوسکتا کہ ذاتِ بابرکات خاتمِ مطلق کی سب سے اکمل روحانیت اور بے انتہا مکمل نورانیت جس طرح اگلوں کو فیضِ روحانیت پہنچا رہی تھی اسی طرح وہ پچھلوں میں تکمیلِ کمالات کا کام کر رہی ہے اور وہ اُن محدود روحانیتوں کی سی نہیں ہے جو دُنیا میں آئیں اور گذر گئیں اور آج دُنیا میں اُن کا کوئی نقشِ قدم باقی نہ رہا۔

لیکن پھر سوال یہ ہے کہ جب خاتم الدجّالین کا اصلی مقابلہ تو خاتم النبیین ہی سے ہے مگر اس مقابلہ کے لئے حضورؐ کا دُنیا میں دوبارہ تشریف لانا مناسب نہ تھا اور نہ ہی باقی رکھا جانا تھا یا بشانِ زمانہ

تو وہی ہیں مقابلہ ختم کرا دیا جانا مصلحت اور تو پھر اس ختم دجالیت کے استیصال کے لئے چھوٹی
موٹی روحانیت تو کیا بڑی سے بڑی ولایت بھی کافی نہ تھی۔ عام مجددین اور ارباب ولایت
اپنی پوری روحانی طاقتوں سے بھی اس سے عہدہ برآنہ ہو سکتے تھے جب تک کہ نبوت کی روحانیت
مقابل نہ آئے بلکہ محض نبوت کی قوت بھی اس وقت تک موثر نہ تھی جب تک کہ اسکے ساتھ ختم نبوت کا
پاور شامل نہ ہو تو پھر شکست دجالیت کی صورت بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس دجال اعظم کو نیست
نابود کرنے کیلئے امت میں ایک ایسا خاتم المجددین آئے جو خاتم النبیین کی غیر معمولی قوت کو اپنے
اندر جذب کئے ہوئے ہو اور ساتھ ہی خاتم النبیین سے ایسی مناسبت تامہ رکھتا ہو کہ اس کا مقابلہ
بعینہ خاتم النبیین کا مقابلہ ہو۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ ختم نبوت کی روحانیت کا انجذاب اسی مجدد کا
قلب کر سکتا تھا جو خود بھی نبوت آشنا ہو محض مرتبہ ولایت میں یہ تحمل کہاں کہ وہ درجہ نبوت کی
بھی برداشت کر سکے چہ جائیکہ ختم نبوت کا کوئی انعکاس اپنے اندر اتار سکے۔ نہیں بلکہ اس انعکاس
کے لئے ایک ایسے نبوت آشنا قلب کی ضرورت تھی جو فی الجملہ خاتمیت کی شان بھی اپنے اندر رکھتا
ہو۔ تاکہ خاتم مطلق کے کمالات کا عکس اسمیں اتر سکے۔ اور ساتھ ہی اس خاتم مطلق کی ختم نبوت
میں فرق بھی نہ آئے اس کی صورت بجز اسکے اور کیا ہو سکتی تھی کہ انبیاء سابقین میں سے کسی نبی کو
جو ایک حد تک خاتمیت کی شان رکھتا ہو اس امت میں مجدد کی حیثیت سے لایا جائے جو طاقت
تو نبوت کی لئے ہوئے ہو مگر اپنی نبوت کا منصب تبلیغ اور مرتبہ تشریع لئے ہوئے نہ ہو۔ بلکہ ایک امتی
کی حیثیت سے اس امت میں کام کرے اور خاتم النبیین کے کمالات کو اپنے واسطے سے
امت تک پہنچائے۔

مگر جیسا کہ اُس نبی کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ایک خصوص توافق و تشابہ کی نسبت حاصل ہو تاکہ کمالات خاتمیت جذب کر سکے وایں دجالِ اعظم کیساتھ اُسے تضاد اور تقابل کی بھی وہی مخصوص نسبت حاصل ہو جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس سے تھی۔ کیونکہ اُس سے کامل مقابلہ تو نسبت تضاد کے کمال سے ممکن ہے اور اس کامل مقابلہ میں حضور کی کامل نمائندگی اس ہی وجہ کہ اس نسبت تضاد میں حضور کیساتھ مشابہت بھی کامل ہے۔

مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت	سو ان تمام خصوصیات کا حامل سارے ہی طبقۂ انبیاء میں بجز حضرت خاتم انبیاء بنی اسرائیل عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی دوسرا نہیں۔ کہ اُنکو حضور سے ایک قسم کی نہیں بلکہ

ظاہری و باطنی کتنی ہی مخصوص مناسبتیں ہیں جو دوسرے انبیاء علیہم السلام میں نہیں پائی جاتیں اخلاق و کمالات میں مناسبت۔ مقامات میں تناسب۔ مدارج میں تشابہ۔ خاتمیت میں توافق زمانہ کا قرب دونوں کی اُمتوں میں تشابہ دونوں امتوں کے نظام میں یکرنگی وغیرہ وہ اُمور ہیں کہ بالآخر اُن کے ہوتے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور کے ابن تمثالی ثابت ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن سے زیادہ کون مستحق تھا کہ حضور کے دور ...... میں بحیثیت ولی عہد آپ کی طرف سے آپ کے مخصوص دشمن دجالِ اعظم کی گوشمالی کرے۔

ادھر دجال کے ساتھ انہیں تقابل و تضاد کی وہ نسبت حاصل ہے کہ ظاہر دونوں میں اخلاق و خصائل اور آثار و احوال ہر ایک میں ایک دوسرے کی حقیقی ضد ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً دجال کا شرعی لقب اگر مسیح ضلالت ہے تو اُن کا مسیح ہدایت۔ یا مثلاً اگر دجال بقولِ حدیث تمیم داری پہلے سے پیدا کر کے خروج کے لئے محفوظ اور مخفی کر دیا گیا ہے تاکہ اُس کا آتہ

ضلال ہونا کھل جائے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پہلے سے پیدا کر کے نزول کے لئے محفوظ و مخفی کیا گیا ہے تاکہ وقت پر اُنکا ظہور ہو اور اُنکا آیت ہدایت ہونا خوب نمایاں ہو جائے۔

پھر جیسا کہ دجّال کی پیدائش بظاہر خارق عادت طریق پر کیگئی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی بطور خرق عادت بلا باپ کے ہی عمل میں لائی گئی۔

پھر اگر دجّال کو اُس کی خلقی مادیت و کثافت کے لحاظ سے زمین کے ایک تاریک کونے میں پابند کر کے محفوظ رکھا گیا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کی خلقی رُوحانیت و لطافت کے باعث آسمانوں میں اُٹھا کر محفوظ رکھا گیا۔

نیز دجّال کو شیاطین کی خصلتوں کا مظہر ہونیکے سبب اُنہی سے مناسبت ہو اور شیاطین کی تختگاہ سمندر ہے اسی لئے شیطان روزانہ اپنا تخت سمندر ہی پر بچھاتا ہے اس لئے دجّال کو سمندر ہی کے ایک ٹاپو میں قید رکھا گیا ہو تاکہ تختگاہ شیاطین اور خود شیاطین سے اُسے قرب رہے۔

تو اد ہر عیسیٰ علیہ السّلام کو بوجہ غلبۂ ملکیّت ملائکہ سے ہی مناسبت ہو سکتی تھی حتیٰ کہ وہ رحم مادر میں بھی نفخۂ جبرئیلی سے ہی پہنچائے گئے اس لئے اُنھیں تختگاہ ملائکہ یعنی آسمانوں میں محفوظ رکھا گیا۔ تاکہ ملائکہ سے اُنھیں قرب رہے۔ گویا ایک مسیح کا مستقر فضا و خلاء سے گذر کر آسمانوں کے پردے قرار پائے تو اُس کی ضد دوسرے مسیح کا مستقر زمین سے بھی گذر کر سطح سمندر قرار پائی ایک فوق بر فوق ہے اور ایک تحت در تحت ایک مسیح ثریا سے بھی اُوپر ہے اور ایک ثریٰ سے بھی نیچے ہے ایک جنّت کی بنیادوں پر ہے اور ایک جہنم کی اساس پر۔

پھر اگر دجّال کو بطور استدراج احیاء موتیٰ پر قدرت دیجائیگی اور وہ بعض مردوں کو زندہ کر دیگا تو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخصوص معجزہ ہی احیاء موتیٰ کا دیا گیا ہے وہ نظر فریبی ہوگی اور حقیقت
ہوگی۔ یا تقابل کو نمایاں تر کرنے کیلئے یوں کہو کہ اگر دجال کو دوسروں کے زندہ کرنے کی قدرت دیجاوے
گی تو حضرت عیسیٰ کو خود اس دجال کے ماردینے پر قدرت عطا ہوگی تاکہ اگر ان کے جمالی عہد میں احیاء
موتیٰ کا اُن سے صدور ہوا تھا تو اس جلالی دور میں اماتتِ احیاء کا صدور کرایا جائے اور تاکہ اگر
اُن کی قوم نے اُنہیں خدا ہونیکا شبہ کیا تھا تو وہ اِس بارہ میں اِسقدر غضبناک آئیں کہ خدائی کے
دعویٰ کرنے والوں کی گردنیں قلم کرکے اپنی بندگی کا ثبوت دیں۔

نیز اگر یہ خاتم الدجالین مدعیٔ الوہیت بنکر دنیا کو گمراہ کرنیکے لئے کچھ کرشمے دکھلائیگا اور یہود
عامۃً اُسے خدا تسلیم کریں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی شان بھی ایسی ہی خارق عادت بنائی گئی
ہے کہ دُنیا کی ایک عظیم قوم (نصاریٰ) کو اُن کے بھی خدا ہونیکا شبہ گذرا اور انہیں الٰہ کہا گیا۔ پس
اگر ایک مخلوق اُسے الٰہ کہے گی تو ایک مخلوق اُنہیں بھی الٰہ کہہ چکی ہوگی۔

پھر اگر خروج کے بعد دجال کی نگاہوں میں ایک خارق عادت تاثیر یہ ہوگی کہ وہ دہی سے
دلوں میں سے ایمان کھینچ لیگا تو بنص حدیث نزول کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نگاہوں میں بھی
تاثیر ہوگی کہ اُن کے دور ہی سے دیکھ لینے پر دجال موم کی طرح گلنا اور پگھلنا شروع ہو جائیگا۔

اسی لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بڑی شد و مد کیساتھ اس خاتم الدجالین سے ڈرایا ہے وہیں
ی زور شور سے حضرت خاتم المجددین عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی خوشخبری دیکر یہ تسلی بھی دی ہے کہ وہ
ی اُس کے قاتل بھی ہوں گے۔

ج علیہ السلام مع تجدید اسلام۔ غرض عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے توافق

تقارب کی وہ مخصوص نسبت ہی جو اور انبیاء کو حاصل نہیں اور دجّال اعظم سے تضاد و تخالف کی نسبت ہے جو اور کسی کو حاصل نہیں اس لئے شخصوں کی نیابت میں اگر دجّال کے مقابلہ کیلئے کوئی نبی منتخب کیا جاسکتا تھا تو وہ قدرتی طور پر عیسٰی علیہ السّلام کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

نیز ان دونوں نسبتوں کیساتھ اس حامل دہ اُمّت کیساتھ جیسے افساد کی نسبت صرف اسی دجّال کو ہو سکتی تھی اسی طرح اس اُمّت کیساتھ صلاح کی نسبت بھی صرف حضرت عیسوی ہی کو ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس امت میں دجّال کے اثرات قبول کرنیکی استعداد ظاہر ہے کہ تصویری اور ایجادی ذہنیت کے غلط استعمال کا ثمرہ تھا جیساکہ واضح ہو چکا ہے۔ اور یہ حقیقت کافی روشنی میں آچکی ہے کہ یہ تصویری اور مادی ایجادات کی ذہنیت درحقیقت مسیحی ذہنیت کا پرتو ہے پس اپنی ذہنیت کے غلط استعمال کی تصحیح قدرتی طور پر حضرت عیسوی ہی کے سپرد ہو سکتی تھی اور وہی اس کجی کی استقامت میں زیادہ سے زیادہ بصیرت کیساتھ مستعدی دکھلا بھی سکتے تھے۔ پھر جبکہ اس تصویری ذہنیت میں کجی کا سبب ہی تلبیس تھی جو دجّالی اثرات کے ماتحت خصوصاً عیسائی اقوام میں پہنچی گئی اور دجّال اعظم کے لئے اس نے راہ خروج کھول دی تو ظاہر ہے کہ قتل دجّال کی مہم عیسوی ہاتھوں ہی سے سرانجام پانی چاہیئے تھی تاکہ وہ اپنی قوم میں سے دجل و تلبیس اور ڈپلومیسی کے اثرات نکالکر خود اس قوم کو اور پھر دنیا کی ساری ہی اقوام کو اس گمراہی سے نجات دلائیں۔ پس جس نبی میں بھی ہیں صرف حضرت عیسوی ہی میں فطری طور پر وہ ساری نسبتیں مجتمع تھیں جو اس دین کی آخری تجدید کے لئے درکار تھیں یعنی خود موسے تقارب و تشابہ کی نسبت، دجّال سے تقابل و تخالف کی نسبت اور اس اُمّت سے تواصل و تسلسل کی نسبت، اس لئے انہیں کو ولیعہد حضرت خاتم الانبیاء بناکر

خاتم المجددین قرار دیا گیا۔

آج کل ان مادی ایجادات کے تصویری پہلو نے تو صورتوں کو ہمرنگِ حقیقت دکھلا کر قوم میں تلبیس و مکر کے مادے ہموار کئے جس سے مسیحِ ضلالت کے دجّالی آثار قبول کرنے کی صلاحیت اُستوار ہو گئی۔ اور پھر اُنہی ایجادات کے تمثیلی پہلو نے حقیقت شناسی کی لائن بچھا کر مسیحِ ہدایت کے اثرات قبول کرنے کی استعداد بھی ساتھ ہی ساتھ پیدا کر دی اور گویا صورت پسند اُمتِ مسیحیہ نے دو مسیحوں کیلئے راستے صاف کر دیئے۔ اور جبکہ یہ دونوں مسیح ایک دوسرے کی کاٹ ضد اور ایک دوسرے کی کاٹ پر تھے تو اس کے صاف معنی یہی نکل سکتے ہیں کہ اگر یہ مسیحی قوم اپنی تصویری ذہنیت کے غلط استعمالات کی بدولت بغیر محسوس طریق پر مسیح ضلالت کے فیضِ دجل سے برباد ہوئی تھی تو اس بگاڑ کی کاٹ۔۔ یہ دوسرا مسیح ہدایت ہی آ کر کر سکتا تھا۔ اور اُسی کے ذریعہ آخر اُمت کی اصلاح ہو سکتی تھی۔

عالم میں دینِ واحد ہو جانے کے ہم ذریعہ

پس یہ مادی ایجادات آج اگر دنیا میں عالمگیر مادیت، ہمہ گیر گمراہی اور عام تلبیسوں اور نظر فریبیوں کا جال بچھا رہی ہیں تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ یہی ایجادات اور یقیناً یہی مادی ترقیات بالآخر عالمگیر ہدایت، ہمہ گیر ذوقِ حق طلبی اور عامۃ اسلام دوستی کی راہ پر ساری دُنیا کو ڈال دیں اور دلوں کو حق شناسی کے لئے مجبور کر دیں چنانچہ ساری دُنیا کو ایک نقطہ پر جمع ہو سکنے اور ایک قدرِ مشترک پر متحد ہو جانے کے جس قدر اسباب ہو سکتے ہیں اُنہیں وہ ان ایجادات کے باعث مہیا ہو چکے ہیں۔

تیز رفتار وسائلِ سفر جیسے ریل۔ موٹر۔ ہوائی جہاز اور اگنبوٹ وغیرہ ایسے ذرائع ہیں جن سے

ایک اقلیم کا باشندہ دوسری اقلیم میں بجائے مہینوں اور برسوں کے چند گھنٹوں میں بے تکلف پہنچ جاتا ہے۔ اس ہمہ گیر اختلاط کا قدرتی اثر یہ ہے کہ دُنیا کی ہر ایک قوم اپنی اپنی خصوصیات کو چھوڑتی جارہی ہے اور مشترکہ خصوصیات پر جمع ہونیکا جذبہ عام ہوتا جارہا ہے تاآنکہ اُن میں دین واحد اور مسلک واحد یا یکسانی پیدا ہو جائے۔

پھر وسائل اطلاع اور آلات خبر رسانی ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور سب سے بڑھکر وائرلیس وغیرہ نے انسانی برادری کو اس حد پر پہنچادیا ہے کہ بلا سفر کئے ہی ایک انسان مشرق میں بیٹھکر مغرب کی اور مغرب میں رہکر مشرق کے سارے احوال پر سکنڈوں میں مطلع ہو سکے۔ یہانتک کہ ریڈیو کی ایجاد نے اس تکلیف اور وقفہ کو بھی درمیان سے ہٹادیا ہے کہ آدمی مشرق و مغرب کی خبریں لینے کے لئے گھر سے باہر خبر رسانی کے کسی سٹیشن تک بھی حرکت کرے بلکہ اپنے مستقر پر قائم رہتے ہوئے بلکہ گاڑیوں میں بیٹھے اور لیٹے ہوئے اور یہی نہیں بلکہ چلتے اور پھرتے چھتری لگائے ہوئے ساری دُنیا کے جلسوں کی تقریریں سُنتا ہے اور لیکچروں میں شرکت کرتا ہو اور بیک وقت عالم کے واقعات اُس کے سامنے چکر کھاتے رہیں۔

ظاہر ہے کہ معلومات عامہ کے اِس ایصال و وصول اور باہمی حالات کی اطلاع و وقوف کا قدرتی ثمرہ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی فرد اور کسی قوم کو اپنے خصوصی اور مخصوص معلومات پر جمود نہ رہے۔ خیالات میں وسعت ہو حقیقت طلبی کا ذوق قائم ہو تلاش و جستجو کی خُو پیدا ہو اور اِس طرح ساری دُنیا کی رایک نقطہ پر آنیکی خواہشمند ہو جائے۔ پس موجودہ وسائل سفر انسانی کیریکٹر کو مشترک بناتے جارہے ہیں اور موجودہ وسائل خبر رسانی علمی خیالات کو مشترک کرتے جارہے ہیں یہانتک کے

شدہ شدہ یہ اشتراکِ عام بالآخر ایک دن مہذب اور منضبط صورت اختیار کر کے تمام مختلف اقوام کو قوم واحد اور اُممِ شتّیٰ کو اُمّت واحدہ بنا کر رہیگا۔

عالمگیر دینِ اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا

ہاں مگر ابھی صورت و حقیقت کی باہمی نسبت اور دُنیا میں صرف انہی دو چیزوں کی حکمرانی دیکھتے ہوئے بھی یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصویری ایجادات پہلے ساری دنیا کو صورت پسند بنائیں گی اور پھر یہی صورتیں حقیقت کی طرف جھکائیں گی اور ظاہر ہے کہ صورت پسندی کی ذہنیت قومی طور پر مسیحی اقوام کا حصہ ہے اس لئے بالفاظ دیگر پہلے ساری دنیا مسیحی اقوام کے تصویری نظام اور اُن کے مادی کیرکٹر پر آئے گی نصرانی حسیات کا غلبہ عام ہوگا اور عالم میں محض صُورت آرائی اور جسم پرستی کا مذہب عامۃً رائج ہو جائیگا۔ ہاں پھر ان ہی صورت پرستیوں کے مادی مضار سے تنگ آ کر دُنیا حقیقت و اصلیت کی تلاش میں سرگرداں ہوگی اور ان تصویری تلبیسات سے غیر معمولی نقصانات اُٹھا کر آخر کار انہی صورتوں کے ذریعہ حقیقت آشنا ہوگی اور یہ ثابت ہی ہو چکا ہے کہ حقیقت رسی اور اصلیت دوستی کی ذہنیت قومی طور پر اُمتِ مسلمہ کا حصہ ہے اس لئے یہ کہنا ہرگز غیر طبعی نہیں کہ انجام کار یہ ساری اشتراکیافتہ قومیتیں بیکدم اسلامی اقوام میں مدغم ہو جائیں گی اور کلمۂ واحدہ اُن کی شیرازہ بندی کر دے گا۔ فَیَکُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

یہود کا حشر

ہاں نہ یہودی قوم جس نے اپنی ناہموار اور تخریبی ذہنیت کے ماتحت نہ صورت پسندی ہی کا ذوق پیدا کیا نہ حقیقت دوستی کا اور دُنیا کی دو بڑھتی ہوئی اقوام (مسلم و مسیحی) میں سے نہ اُسے عیسائی اقوام کی مادی ترقیات سے کوئی لگاؤ ہوا اور نہ مسلم اقوام کی روحانی ترقیات سے کوئی دلچسپی حتیٰ کہ اُس نے ایک طرف تو بنی نصرانیہ سے چڑ باندھ کر وہ تخریبی اسباب پیدا کئے کہ انہیں دُنیا سے

آسمانوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور یہی اسلام سے عداوت باندھ کر وہ تخریبی سامان کئے
کہ انہیں اپنے وطن مالوف مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ غرض تصویری امت نہ تحقیقی بلکہ تخریبی
رہی ظاہر ہے کہ اُسے اس آخری دورہ میں بھی نہ صورت آرا بننا چاہیے نہ حقیقت آشنا بھی
اقوام میں مدغم ہونا چاہیے اور نہ اُن مسلم اقوام میں جو مسیحی اقوام بحیثیت ساری ہی اقوام عالم کو بالآخر
اپنے اندر جذب کر لیں گی تو اس کے سوا اس قوم کا کیا انجام نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی تخریب عالم دجّال
کے ساتھ وابستہ ہو کر فنا کے گھاٹ اُتر جائے اور اُسے دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی پناہ نہ ملے۔ چنانچہ
بنقِ حدیث نبوی شجر و حجر تک کسی یہودی کو پناہ نہ دیگا اور دجّال کے ساتھ یہ ساری قوم بھی اُن
انفاسِ عیسوی سے موت کے گھاٹ اُتر جائے گی جس سے دوسری اقوام زندہ ہوں گی ظاہر ہے
کہ ایسی کج فہم قوم کا اس کے سوا انجام بھی کیا ہو سکتا تھا جس نے آج سے ۱۹ سو برس پہلے مسیح
ہدایت کو تو مسیح ضلالت سمجھ لیا اور اسلئے اُسے سولی چڑھانے کی فکریں کیں اور دُنیا کے اس آخری
دورہ میں مسیح ضلالت کو مسیح ہدایت سمجھ بیٹھے گی اور اس لئے اُس کے ساتھ ہو کر مسیح ہدایت کا
مقابلہ کرے گی جو صورتاً تو حضرت مسیح علیہ السّلام کا مقابلہ ہوگا اور حقیقتاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ
کا مقابلہ ہوگا۔ کیونکہ حضرت مسیح حضور ہی کی نیابت کرتے ہوئے تجدید دین محمدی کے فرائض انجام
دیں گے۔ پس اس قوم کے حق میں یہ اس ذلت و مسکنت اور مغضوبیت پر ایک آخری مہر ہوگی
جس کی اطلاع تیرہ صدی پیشتر قرآن میں دی گئی تھی۔

بہرحال ساری دُنیا کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانے کا وقت قریب ہوتا جا رہا ہے اور موجودہ
تمدنی وسائل ہی آخری تدین کے غلبہ و شیوع کا پتہ دے رہے ہیں۔

اسلام کی عالمگیری شروع ہو چکی ہے

چنانچہ موجودہ زمانہ کی رفتار عملاً اس آنے والی ہوا کا پتہ دے رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ تغیر کے اسباب بہت کچھ فراہم ہو چکے ہیں اسلامی تعلیمات نے تیرہ سو برس کی مدت میں اقوام عالم کی ذہنیت میں انقلاب عظیم پیدا کر کے بنی نوع انسان کے دل و دماغ پر اپنا پورا تسلط و اقتدار قائم کر لیا ہے۔ یورپ کے دہریوں۔ مغرب کے سائنس دانوں۔ چین و جاپان کے صناعوں اور ہندوستان کے اچھوتوں کا باوجود اپنی قومی اور آبائی مذہب رکھنے کے مذہب مذہب پکارنا اور مذہب حق کی تلاش میں سرگرداں جانا ذہنیتوں کا انقلاب نہیں ... تو اور کیا ہے؟ اور پھر اس انقلاب ذہنیت کے پردہ میں اسلام اسلام کی صدائیں لگانا اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اسلام کے دامن میں پناہ لینا اسلامی تعلیمات کا اثر نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ گویا تیرہ صدیوں کے مختلف قرنوں میں اسلام نے علیحدہ علیحدہ مختلف خطوں کو اپنی تعلیمات سے سیراب کیا اور اب دنیا کی ذہنیت میں عالمگیر استعداد و قابلیت پیدا کر کے اس نے یہ راستہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ ہمہ گیری کیساتھ اپنے فیوض کی بارش عامہ خلائق کے اوپر برسائے اور اپنے ہی وسیع دائرہ میں ساری خدائی کو اکٹھا کرے۔ پس یہ انقلابی ذہنیت جو آج نمایاں تر ہو گیا ہے کیا اسلامی تعلیمات اور اس کے منتشر شدہ اصول کے سوا بھی کسی چیز کا ثمرہ سمجھا جا سکتا ہے؟ ورنہ دنیا کی ذہنیت انقلاب کے بعد آخر مسیحیت۔ یہودیت۔ ہندویت وغیرہ کی طرف کیوں نہیں نکل چلتی؟ ان ملتوں کو اسلام اسلام پکارنے کی کون ضرورت داعی ہے؟ یقیناً اگر ان مذاہب کی تعلیمات سے ذہن بدلتے تو بد لگر انہی کی طرف مائل ہوتے لیکن جبکہ طبیعتیں اور قلوب کشاں کشاں اسلام کیطرف آ رہے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ انقلاب آفریں نتیجہ بھی اسلام ہی کا ہے

اور یا اُلٹا ان بدلے ہوئے قلوب پر قبضہ بھی اُسی کا ہونا ہے۔

مسلم اقوام کی کس مپرسی کی تکوینی مصلحت

آج جبکہ اسلام کی قوم سے شوکت رخصت ہوچکی۔ حکومتیں پامال ہوگئیں۔ تسلط واقتدار جاتا رہا۔ رعب کا نشان نہیں اور تمام وہ آثار فنا ہوچکے جو گرویدگی اور فریفتگی کا ذریعہ قرار پا سکتے تو ان حالات میں اُن ہی اقوام کا جو مسلمانوں سے مستغنی اور اُن سے بےخوف ہیں مسلمانوں پر کامل اقتدار رکھتی ہیں اسلام کی طرف جھکنا دلوں اور زبانوں سے اُس کا دم بھرنا اگر مسلمانوں کا نہیں تو یقیناً اسلامی تعلیمات ہی کا اثر کہا جائیگا اور بلاشبہ اسلام ہی کی ذاتی جاذبیت کا ثمرہ سمجھا جائیگا۔ پس اسلامی تعلیمات کی اسی ذاتی اثر کو واضح اور نمایاں کرنے کیلئے اِس آخری دور میں کلمہ حق نے مسلمانوں سے وہ تمام وسائل جاذبیت چھین لیے جن کے ذریعہ کسی قوم کا سکہ دلوں پر بیٹھ سکتا ہے تاکہ اسلام کی ذاتی محبوبیت کی شان عریاں ہو جائے۔

اسلام کے اول کو اُسکے آخر سے نسبت

بالکل اُسی طرح جیسا کہ اسلام کے اولین دور میں۔ اسلام اور محض اسلام کی ذاتی کشش نمایاں کرنے کیلئے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائی کار میں تمام دنیوی وسائل سے الگ رکھکر اسلام کی تبلیغ کرائی گئی۔ ذات اقدس کسی امیر گھرانے میں پیدا نہیں کیگئی کہ تبلیغ میں امارت کو مؤثر سمجھا جائے۔ ولادت سے پہلے یتیمی کے اسباب مہیا ہوگئے کہ اس بے یاری و بیکسی کے ہوتے ہوئے تبلیغ میں کوئی اُوپر کی حمایت مؤثر سمجھی جائے قبائل کو پہلی ہی تبلیغ سے دشمن جان بنا دیا گیا کہ اشاعت اسلام جتھے کی قوت کا ثمرہ نہ سمجھا جائے انتہائی مظلومیت کیساتھ ہجرت کرائی گئی وطن سے بےوطن ہونیکی محنت سر پر ڈالی گئی۔ کہ کہیں یہ تبلیغ مقامی اثرات کا حاصل نہ گنا جائے۔ پھر مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں تشدد ممنوع قرار دیدیا گیا کہ کہیں

اشاعت دین جبر اور دباؤ کا ثمرہ نہ گنا جائے۔ جاہلیت کی قرنہا قرن کی بداخلاقی اور بد اعمالی سے ملک کی شوکت و شائستگی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا کہ کہیں قبول دین کو قومی تہذیب اور جماعتی جاذبیت کا حاصل نہ سمجھ لیا جائے۔ ملک وہ منتخب کیا گیا کہ جس میں نہ زراعت کی قابلیت تھی نہ تجارت کی نہ صنعت و حرفت تھی نہ تمدن اور کسب معاش کی صورتیں تھیں، بے آب و گیاہ پہاڑیاں، ریگستان، کیکر اور خار مغیلاں (وادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ) غرض اس میں بھی خلقی طور پر کوئی مالی یا اقتصادی سرسبزی بھی نہ رکھی گئی کہ اقوام کے اس رجوع عام کو وطنی اور ملکی خصوصیات کا نتیجہ نہ سمجھا جائے۔ غرض ابتدا کار ہی میں ذات قدسی صفات کو زندگی کے تمام وسائل قوت و شوکت ظاہری جاہ و عزت اور خزائن مال و دولت سے الگ رکھ کر انتہائی بیکسی اور بے سروسامانی کی زندگی کے ساتھ تبلیغ کیلئے کھڑا کیا گیا اور انہیں خالی ہاتھوں سے بڑے بڑے گردن کشوں کی گردنیں جھکوائی گئیں تاکہ اسلامی تعلیمات کا ذاتی جوہر عالم پر آشکارا ہو جائے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ محض اسی کی ذاتی قوت سے پھیلتا ہوا نظر آئے جو کسی طرح بھی جاہ و مال کی عارضی قوتوں کا رہین منت نہ ہو ٹھیک اسی امر اول کی طرح آج آخر امر میں بھی اسلام کی ذاتی کشش و جاذبیت دکھانے کے لئے وہی سامان کیا گیا جو اس وقت کیا گیا تھا مسلمانوں کا باہمی اتحاد چھینا گیا کہ اسلام کی مقبولیت کہیں آپس داری کی قوت و شوکت کا ثمرہ نہ سمجھ لی جائے ملک و مال ضبط کیا گیا کہ ترویج اسلام فاتحانہ شوکت کا ثمرہ نہ سمجھا جائے۔ علم و اخلاق میں انتہائی کمزوری ڈال دی گئی کہ اشاعت اسلام میں ان کی دولت کی تاثیر نہ سمجھی جائے کتنے ہی مسلم طبقے آج وطن سے بے وطن کئے گئے۔ یا انہیں ایک منتظم کی بدولت لاکھوں ایرانی مسلمان بے خانماں ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ شریف گردی کے پیچھے ہی بطانوی مظالم

سے عرب کا لکتا بڑا حصہ اُجڑ کر شام وغیرہ میں پناہ گزیں ہوا حجاز و شام مصر و عراق اور مشرق و مغرب کے عام خطے عیسائیوں کی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں سے مفلوج ہو گئے۔ ہندوستان کے دیار کی اسلامی رونق انہی مسیحی بھیڑیوں کی بدولت ختم ہو گئی۔ جاپانی چیرہ دستیوں سے چینی مسلمان کسقدر بے اطمینانی اور خطرات میں گھر گئے یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تاکہ تبلیغ دین پر وطنی خصوصیات کا دھبّہ بھی نہ لگنے پائے نہیں بلکہ جو قومیں اسلام کیطرف آ رہی ہیں آج اگر شوکت و قوت کی مالک ہیں تو وہ خود ہیں اقتدار و تسلط کے وسائل اگر قبضہ میں ہیں تو اُن کے۔ جیساکہ مشرکین مکہ ہی کے قبضہ میں ہر شوکت و اقتدار تھا پس جس طرح اسوقت اسلام کو غریب بنا کر با اقتدار ہستیوں کو اُس کی بیکس جو شکست پر جھکایا گیا تھا تاکہ اسلام کی ذاتی شوکت کو اعتراف پر قلوب مجبور ہو جائیں اسی طرح اور بعینہ اسی طرح آج بھی اسلام کو غریب اور بے یار و مددگار بنا کر اُس کیطرف اُن اقوام کو جھکایا جا رہا ہے جو ہر غلبہ و تسلط کی مالک اور مسلمانوں کی اس بے بسی اور بے مقداری کو نگاہ نفرت سے بھی دیکھ رہی ہیں۔

بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاءِ۔

اسلام کی ابتدا ایسی حالت میں ہوئی کہ وہ بے یار و مددگار تھا اور وہ ویسی ہی حالت پر لوٹیگا۔ تو خوش خبری ہو بے یار و مددگار لوگوں کے لیے

پھر اگر ان حالات کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی تعلیمات اسلام کے عمیق اور گہرے اثرات کو نہ پہچان سکے تو اُسے دل ہی کا نہیں بلکہ آنکھوں کا بھی اندھا کہا جانا بے جا نہ ہوگا۔

خلاصہ بحث الحاصل ہمارا مقصود اس تمام تحریر سے یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو حق تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر تام بنایا آپ کی مقدس ہستی علم کا منبع اور سرچشمہ بنائی گئی اور

جبکہ اُمّت کی ذہنیت نبی کی ذہنیت کے تابع ہوتی ہے کہ اُس سے مستفید ہوتی ہے تو اُمّت کی ذہنیت میں بھی وہی تلاش جستجو اور علمی جذبات کا رنگ غالب ہوا اور یہ رنگ بالآخر مُطیعوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اُن کی تعلیمات عامّہ و خاصّہ اور ہمہ گیر خطبات تقریر و تحریر سے ہر اُس خطہ میں پہنچا جہاں مسلمان پہونچے اور بالآخر اسی رنگ نے تمام قدیم ذہنیتوں میں ہل چل ڈالی اقوام عالم میں تلاش جستجو کا مادہ پیدا ہوا اور باوجودیکہ تنگدل اقوام نے آبائی تقلید اور تعصب کے سلسلہ میں اپنی اپنی نام نہاد تہذیبوں اور ملتوں کے تحفظ کی خاطر حد بندیاں بھی کیں چھوت چھات بھی نا کہ بندیاں بھی کیں کہ اسلام کی رو اُدھر سے اُدھر ہی رُک جائے لیکن اسلام اور اُس کی تعلیمات کے عظیم سیلاب کو چھونس کی ٹٹیاں کب روک سکتی تھیں یہ رنگ گھس اور دلوں کے منفذوں میں غیر محسوس طریقہ پر سرایت کرتا رہا۔ عیسائیوں میں اُسی کے اصول نے توحید کی لہر پہنچائی تو پروٹسٹنٹ فرقہ قائم ہوگیا۔ بت پرستوں میں اُسکی لہریں دوڑیں تو آریہ ورت قائم ہوا۔ شمالی ہند کی قوموں میں پہونچا تو نئو دھرم سکھ قائم ہوئے متمدنوں میں پہونچا تو فلاسفر اور توحید وصانع بنے اور باطنیات کے منکروں میں گھسا تو صریح انکار کے بعد انہوں نے عالم غیب کا اقرار و اعتراف شروع کیا غرض اُصول پہنچکر دلوں میں غرکوز ہو گئے اور اُن کی ملل میں مخلوط ہوکر اثر انداز ہوئے پھر کسی نے تو اپنی ملت کی ظلمت اور تعلیمات اسلام کا نور صراحۃً محسوس کرکے کھُلم کھُلا ان ظلمتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اسلام کا نور قبول کرلیا اور کسی نے تعلیمات کو صرف علم کے درجہ میں قبول کرکے ان کا استعمال شروع کیا مگر اپنی ہی قومی فطرت کے مطابق اسی استعمال کو جاری رکھا اور دائرہ اطاعت وانقیاد میں کھُلم کھُلا داخل ہونے سے شرمائے مگر دونوں صورتوں میں قوموں کی اصل ملت کا وجود اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا۔ یہی انقلاب کا

پیش خیمہ ہے کہ جس نور نے ظلمتوں کا کچھ حصہ چاک کر دیا ہے اُس کی چمک بقیہ حصہ سے بھی غیر قوموں کو بیزار بنانے والی ہے۔ اور اسلام کا کلمہ ہر بیت وبر و مدر میں داخل ہو کر ساری دنیا کو اسلامی برادری میں شامل کرنے والا ہے اِنشاء اللہ تعالیٰ۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ملت اسلامیہ کی اس مقبولیت عامہ کی قدر کرتے ہوئے اپنی اس بے بہا دولت کی حفاظت کریں حقائق کے ہوتے ہوئے صورتوں کو مُونھ نہ لگائیں۔ تدین اور تمدن کی بنیاد صورت آرائی کے بجائے حقیقت شعاری پر قائم کریں۔ طبعی اور مادّی رغبتوں کو مغلوب کر کے شرعی رغبتوں کو دلوں میں جگہ دیں صورت پرستوں کو حقیقت پسند بنائیں نہ کہ خود حقائق کو چھوڑ کر صورتوں کی دلفریبی کا شکار ہوں اُمت اسلامیہ کی خصوصیات فنا نہ کریں۔ یہ اُمت علمی اُمت ہے اور اس کا اصلی علم علم ذات وصفات حق ہے نہ کہ ذات وصفات مادہ اس لئے تعلیم دین اور حقائق یقین کو علم ہیں عام دیں اور منظم ہو کر دنیا کو اپنے علوم سے آشنا بنائیں خواص کو تعلیم سے اور عوام کو تبلیغ سے دین کا شیدائی کر دیں۔

تمدنی مصائب سے بچاؤ کا پروگرام ہاں مگر یہ یاد رکھیں کہ صورت پسندیوں کا یہ یورپین مرض اُنہیں تشبہ کے راستہ سے آیا ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے نصرانیوں کی وضع قطع رہائش ومعاشرت، سلام وکلام، لباس و طعام اور اُن کے تمام شعبہ ہائے زندگی کی صورتوں کا پرجوش خیر مقدم کیا گویا جبکہ مسلمان صورتاً نصرانی اور غیر مسلم بنگئے اور اس بدنی تشبہ نے بالآخر قلوب تک بھی یہ زہر پہنچا دیا اور دلوں میں اُنہی کے سے جذبات صورت پرستی غیر محسوس طریقہ پر سرایت کر گئے یہانتک کہ آج اُن کے چہرے مہرے ہی نہیں زبان وقلم بھی اُنہی سا نقطۂ نظر لکھ صورتوں کی دلفریبیاں دکھلانے کیلئے وقف ہو گئے۔

ترک تشبہ پس تمدن کی ان ظاہر آرائیوں سے بچنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ مسلمان تشبہ بالکفار سے

عموماً اور تشبہ بالنصاریٰ سے خصوصاً کنارہ کشی اختیار کریں۔ ہم نے آج سے دس سال پیشتر ۱۳۴۲ھ میں مستقلاً اسی موضوع پر ایک ضخیم رسالہ التشبّہ فی الاسلام شائع کیا تھا جس کی پہلی جلد طبع ہو کر ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہے اس رسالہ میں تشبہ بالکفار کی حقیقت اور مضرت پر عقلاً و نقلاً بحث کر کے مسلمانوں کو تمدن کی صورت آرائیوں سے بچنے کی دعوت دی گئی تھی جو بحمد اللہ بہت حد تک نافع ثابت ہوئی۔ آج دس سال کے بعد پھر اُسی پہلے سبق کو رسالہ زیر نظر میں ایک دوسرے جامع عنوان سے یاد دلایا گیا ہے۔

صحبتِ صلحاء لیکن اسی کیساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ دلوں میں ان ظاہر پرستیوں کے خلاف جذبات نفرت محض تشبّہ کی بُرائی کا علم کر لینے سے مشتعل نہیں ہو سکتے جبتک کہ علم کیساتھ ایسے اہل صلاح اہل دیانت اور اصحاب علم و تجربہ کی صحبت و مجالست بھی میسّر نہ ہو جو اس غیر تشبّہ کی نفرت اپنے دلوں میں لئے ہوئے ہوں کیونکہ علم محض راستہ دکھلاتا ہے کسی عالم کو چلا نہیں سکتا۔ وہ چلتا خود ہی ہے جبکہ اُس کے قلب میں چلنے کا داعیہ موجزن ہو اور تجربہ شاہد ہے کہ دل میں داعی بغیر اہل دل کی معیت و صحبت اور مجالست کے ہرگز پیدا نہیں ہوتے اسی لئے قرآن حکیم نے اس کا پرزور حکم دیا ہے۔

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ — اے ایماندارو اللہ سے ڈرو اور سچوں کی صحبت اختیار کرو۔

پس مسلمانوں کو ایسی علمی مجالس اور ایسی سوسائٹیاں بنانیکی ضرورت ہے جنہیں شخصی اور قومی اصلاحات پر علمی مذاکرے ہوں ایک دوسرے کی زبان اور حال کی گرمی سے نفع اُٹھایا جائے قرآنی پروگرام سامنے ہو اور اُس پر چلنے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہوں کہ اس سے قوم کے علم میں بھی تازگی و ترقی

ہوگی اور جذبات عمل بھی بھڑکے ہوئے محسوس ہوں گے۔ نیز وقت کے مناسب عملی راستے بھی روشن ہو ہو کر سامنے آتے جائیں گے۔ ورنہ آج معاشرت مدنی کی سب سے بڑی مصیبت ہی یہ ہے کہ قوم کی علم کا تعلق ایک طبقہ سے ہے اور عمل کا اُس کی متضاد سوسائٹی سے اس لئے اگر ایک شخص کا قلب علم صحیح سے متاثر بھی ہوتا ہے تو اُس کی نامہذب سوسائٹی اور ماحول کے اثرات اُسے صحیح عمل کی طرف آنے نہیں دیتے۔ لیکن اگر عملی تاثرات کا مرکز بھی وہی صادقین کا طبقہ بنجائے جو علم صحیح کا محور تھا تو یہ علم و عمل کی کشمکش بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے اور اس حقیقت پسند اُمت مسلمہ کی یہ عارضی صورت پسندیاں بھی ختم ہو جائیں۔

بہرحال تشبُّہ بالکفار کی ظلمتوں سے بُعد اور مجالس خیر کی نورانیتوں سے قرب پیدا کر لینے کے بعد جبکہ اُمت مسلمہ کا قلب و قالب ان تمام ظاہر فریب رسمیات سے بے نیاز ہو جائے تو پھر اس وقت کے نازک اور فتنہ ساماں دور میں جبکہ دُنیا کی یہ صورت پرست قومیں یا خدا سے برسرپیکار ہیں یا اپنے نفس اور نفسانی تعیش کی خاطر لڑ مر رہی ہیں یعنی خدا کو چھوڑ کر ماسویٰ میں اُلجھ گئی ہیں صرف اسی حقیقت پسند اُمت کا حق ہے کہ وہ اپنے حق میں دعوے اور غیروں کے حق میں کوسنے چھوڑ کر خدا کے ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے کھڑی ہو۔ اور گرد و پیش سے قطع نظر کر کے اعلاء کلمۃ اللہ کو اپنا اولین اور آخرین مقصد بنائے صرف اللہ ہی سے مدد مانگے اور اسی کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اُسی کی نصرت اور غیبی مدد کی اُمیدوں کے ساتھ بڑھے اور بڑھتی ہوئی چلی جائے۔ دل یقین محکم کے ساتھ خوف و رجا سے لبریز ہو اور ہاتھ عملی پروگرام کے محکوم ہوں "دل بیار دست بکار" یعنی "ایمان و عمل صالح" اُنکا امتیازی شعار ہو جائے۔ اس پر پہلا وعدہ تو محبت باہمی اور اتحاد ذات البین کا ہے جو تمام اجتماعی اور قومی کاموں کی

اساس اوّل ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام
سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔	کئے اللہ تعالیٰ اُن سے لئے محبّت پیدا کر دیگا۔

جذبہ ارتباط اور دوسرا وعدہ تمکین و استخلاف یعنی خدا کی زمین پر غلبہ و شوکت دیدینے کا ہے جس کے بغیر کوئی اجتماعی اور ہمہ گیر کام نفاذ پذیر نہیں ہو سکتا چنانچہ ارشاد حق ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ	تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں اُن سے
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ	اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو زمین میں حکومت
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪	عطا فرمائے گا جیسا اُن سے پہلے لوگوں کو حکومت دی
وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی	تھی اور جس دین کو اُن کے لئے پسند کیا ہے اُس کو
ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	اُن کے لئے قوت دیگا اور اُن کے اس خوف کے بعد
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ	اُس کو مبدل بامن کر دیگا بشرطیکہ میری عبادت
لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ	کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں اور جو
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	شخص بعد اسکے ناشکری کریگا تو یہ لوگ بے حکم ہیں۔

اسمیں قلت و کثرت کا کوئی سوال نہیں کہ یہ سب یورپ کے صورت پرستوں کی لائی ہوئی ہے بلکہ صرف قوت یقین کا ہے جو "عمل صالح" سے مستحکم ہوتی ہے۔ اگر یورپ کے چند لاکھ فرنگی محض صورت یقین پر اپنے دل و دماغ اور اپنی تنظیم کے بل بوتہ پر ہندوستان کے اُن کروڑوں مسلمانوں کو جنہوں نے یقین اور ایمانداری کی دولت کھو دی تھی غلام بنا سکتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ یہ کروڑوں بندگان توحید حقیقت

یقین کو پھر واپس لاکر اس قضیہ کا عکس مستوی کر دیں؟

مسلمانوں کیلئے یہ مہم نہ کچھ اہم ہے اور نہ کوئی نئی بات ہے انھوں نے تو مشرق و مغرب کے طول و عرض میں ایسی ایسی مہمات سر کتنے ہی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ جن کے قلم اور تلوار نے دنیا کے تخت اُلٹ اُلٹ دیئے ہیں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیا ہے۔ پھر آج بھی جب کبھی وہ ان صورت پرستوں کی ٹیپ ٹاپ بیسویں صدی والی ٹیو کی لائن چھوڑ کر جس میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اپنی اُسی قدیم تیجانی حق پرستی۔ اخلاقی جرأت صفائی معاملہ نیک چلنی۔ یکرخی اور یکسوئی کیساتھ خدا کے نام پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ایسے ایسے انقلابات اُن کیلئے محض ایک کھلونے کی حیثیت میں آجاتے ہیں۔ آخر ٹرکی کا مرد بیمار جسکو یورپ کے عیار و نبض اپنی ریشہ دوانیوں سے بیمار بنا بھی رکھا تھا اور بچوا بھی رکھا تھا مصطفٰے کمال کی ایک ہی جنبش سے بھلا چنگا ہو کر دُنیا کے تندرستوں کو شرمانے بھی لگا اور یورپ کے تندوروں کو ڈرانے اور دھمکانے بھی لگا ہے۔ اسی طرح مصر عراق اور دوسرے ممالک کی بیداریوں پر بقدر بیداری وہی نتائج مرتب ہوئے جو وعدۂ الٰہی کے موافق ہو سکتے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نوبت پر خدا کا یہ قانون عادت بدل جائے؟

ہندوستانی مسلمان اُٹھیں۔ اندرونی اور بیرونی اثرات سے دلوں کو آزاد کرکے اُٹھیں غیروں کے سہارے سے نہیں بلکہ خود اُٹھیں اور اپنی طاقت کے سہارے بھی نہیں بلکہ اسلام کی طاقت پر اُٹھیں قومی لشکر بنکر نہیں بلکہ حزب اللہ بنکر اُٹھیں اور ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ ساری گمراہ دُنیا کا نقشہ بدل دینے کیلئے اُٹھیں۔ اپنی جاہ کی خاطر نہیں بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کے بجاہ کے لئے اُٹھیں حقوق مانگتے ہوئے نہ اُٹھیں کہ تعدد حقوق اور وہ بھی دوسروں سے مانگنا اُن کی مخلصانہ غیرت اور جذبۂ توحید کے منافی ہے بلکہ صرف ایک حق اور اُسی کے اعلاء اور شوکت کو اپنی آخری منزل مقصود ٹھہرا کر اُٹھیں

تو پھر کون ہے جو خدا کی مدد کو روک لے؟ اور کون ہے جو اُس کے وعدۂ تمکین و استخلاف میں آڑے آجائے؟
مسلمانوں کے اِن عزائم بلند سے نہ اسلام جھکنے والا ہے اور نہ ان عزائم پر نتائج شوکت مرتب کرنے
سے خدا کی مدد سست ہونے والی ہے۔

صلوٰۃ و جماعت | ضرورت ہے کہ مسلمان ایک ذمہ دار، مدبر، باتر اور مخلص جماعت بنکر مرکزیت کیساتھ اپنی
منتشر قویٰ کو جمع کریں اور یہی نہیں بلکہ حقیقی تنظیم عمل میں لائیں جسکا واحد ذریعہ مساجد اور جمعہ و جماعات ہیں
جس سے اگلوں کی تنظیم ہوئی تھی۔ یہی تنظیم اُن کی توحید و اخلاص کی اسپرٹ کے ماتحت مذہبی تنظیم بھی ہوگی
اور یہی تنظیم اُن کے جوش عمل کے ماتحت اُن کی فوجی تنظیم بھی ثابت ...... ہوگی۔ اُنہیں تنظیم کیلئے
کسی اختراعی سلسلہ کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں نہ انہیں کمیٹیاں قائم کرنے کی حاجت ہے انجمنوں
کے تسلسل کی حاجت ہے قدرت نے مذہبی اور دینی رنگ میں وہ نظام بخشا ہے جس میں خدا اور بندوں
کے ساتھ اپنی اپنی نوعیت کا تعلق خود ہی مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے دیانت اور سیاست ساتھ ساتھ
اپنے آثار کھولتی چلی جاتی ہے۔ گویا ہر محلہ کی مسجد اُس کا کمیٹی گھر ہے جہاں خدا کے لئے جائیں اور باطنی
برکات کے ساتھ بندوں سے ہموار ہو کر واپس ہوں۔ اگر محلہ کے سر برآوردہ ذی جاہ اور سب سے زیادہ ممتاز
افراد امام بنیں تو قدرتی طور پر چھوٹے لوگ حاضری مساجد کا شوق اپنے اندر محسوس کریں گے۔ پھر امام اپنے
مقتدیوں کو نگاہ میں رکھیں اور مقتدی امام کو تساہل سے بچاتے رہیں اس طرح ہر ہر محلہ ہر ہر شہر اور
ہر ہر گاؤں قدرتی طور پر باہم مربوط ہو جائے گا۔ اور مذہبی۔ معاشرتی۔ اور فوجی تنظیم بلا کسی قصد و
نیت کے خود بخود ہاتھ لگ جائے گی۔ جس کے ماتحت تمام اسلامی مقاصد بسہولت پورے ہو سکیں گے۔

زکوٰۃ اور بیت المال | پھر اس پروگرام کو باقی اور مستحکم رکھنے کے لئے مالی تنظیم کریں جس کی بہترین اسلامی

صورت بیت المال اور زکوٰۃ وصدقات کی فراہمی ہے۔ جو انہیں مصارف میں صرف کی جائے جن کو اسلامی پروگرام نے مقرر کیا ہے۔

تبلیغ ونصیحت | اور پھر ان ساری مساعی کو اسلامی آئین میں منتظم رکھنے کیلئے اِشاعت قوانین اور تبلیغ آئین کو ضروری سمجھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا شعار ہو۔ اپنے بھائی کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ منکر اور شرعی کوتاہی میں مبتلا دیکھکر خاموش نہ ہوجائیں بلکہ خلوت وجلوت اور خفیہ وعلانیہ انتہائی محبت وپیار بلکہ خوشامد وسماجت کیساتھ اس سے بچانے کی سعی بلیغ کریں تاکہ اسلامی مسائل کا گھر گھر چرچا ہوجائے اور ہر خورد وکلاں محبت حق میں سرشار ہو کر محض اسلئے ساری دنیا کو فتح کرنے کا خواہشمند ہوجائے کہ سارے عالم میں یہی چرچا پھیل جائے اور بندے خدا کے ہو رہیں۔ انفرادی طور پر اور جماعتیں بن بن کر تبلیغ احکام کے لئے نکلیں مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں بھی اس فرض سے غافل نہ رہیں بلکہ اپنی ساری تنظیموں کا مقصد اصلی اسی تبلیغ حق کو سمجھ لیں۔ اور مسلم وغیر مسلم سب کو ان احکام سے آشنا بنادیں۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ خدا کی زمین پر قابو پانے کا جذبہ اپنی ضرورت سے نہ ہو بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے ہو صرف ایک خدا کے تخت عدالت بچھادینے کیلئے ہو اور محض اسلئے ہو کہ الٰہی قانون کی شوکت کے سامنے تمام انسانی دساتیر کی شوکتیں پامال نظر آئیں۔

خاتمۂ کلام | پس جو قوم تشبہ بالاغیار ترک کرکے خوددار بنجائے۔ مجالست باہمی سے قوی القلب اور بااعتماد ہوجائے جمعہ وجماعات اور حاضری مساجد سے اُدھر اللہ سے واصل اِدھر باہم متحد ومنظم ہوجائے۔ زکوٰۃ وصدقات کی مالی تنظیم سے غنی اور غیر محتاج ہوجائے پھر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ ضروریات مذہب کی عالم نصیحت میں بے جگر اور ایک دوسرے کی ہم مجلس اور صحبت نشین

ہو جائے۔ گویا خدا سے بھی رابطہ درست۔ مخلوق سے بھی رشتہ صحیح خزانے بھی پُر، اخلاق و کیریکٹر بھی اعلیٰ اور پھر غرض صرف اعلاء کلمۃ اللہ، تو پھر خود ہی سوچو کہ انجام کی خوبیوں کا پالا آخر اس قوم کے سوا اور کہیں کسے ہاتھ لگ سکتا ہے؟ اگر یہی مختصر پروگرام ہر ایک مسلمان کا پروگرام قرار پا جائے تو حقیقتاً پھر کسی اور پروگرام کی اسے حاجت ہی نہ پڑے حق تعالیٰ نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی مختصر پروگرام کو مسلمانوں کی شوکت کا آخرین مقصد ٹھہرا دیا ہے جو درحقیقت حصول شوکت کا اولین ذریعہ بھی ہے کہ اگلوں نے اسی ذریعہ سے شوکتیں حاصل کیں۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

یہ لوگ (مسلمان) ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں (جس سے تعلق مع اللہ بھی استوار ہوتا ہے اور حاضری مساجد و جمعہ و جماعات سے خود بخود اتحاد و تنظیم بھی پیدا ہو جاتی ہے) اور زکوٰۃ دیں (جس سے بیت المالی تنظیم خود بخود عیاں ہے) اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں (جس میں نیک کو نیک اور بد کو بد سمجھنے کی طرف بھی اشارہ ہے جو علم ہے اور اس مناصحت میں ایک دوسرے کی محبت بھی قدرتی ہے جس سے صحبت و ہمنشینی مفہوم ہوتی ہے اور اس مجموعہ کی خاصیت ترک تشبہ بالکفار و اختیار تشبہ بالاخیار ہے) اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

پس یہی وہ شخصی و قومی اصلاح و تمکن کی طاقت ہے جو ان تمام مادی و صوری نظاموں اور ان تمدنی گمراہیوں کے فریب سے نجات دلا سکتی ہے جنھوں نے دنیا کے روحانی خرمنوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے اور پھر

یہی اخلاقی و تنظیمی قوت ان تمدنی صورت آرائیوں کے ان مہلک نتائج سے ہمیں بچا سکتی ہے جن تک پہنچکر خود یورپ کے ناعاقبت شناس آج چیخ چیخکر رو رہے ہیں لیکن انھیں کوئی مفر اور مخلص نظر نہیں آتا۔ غرض خاتمۂ کلام یہ ہے کہ مسلمان سنبھلیں اور قرآن کے اس پروگرام اور اس جیسے اور دوسری آیاتِ الٰہیہ کے عملی نظاموں کو ہاتھوں سے مضبوط پکڑیں۔ قدرت کی طرف سے سامان سب مہیا ہو چکے ہیں۔ صرف ہماری جدوجہد کے امتحان کا وقت ہے۔ تاکہ جو چیز منجانب اللہ ہونے والی ہے اس میں ہمارے اجر و ثواب کا حصہ بھی قائم ہو جائے۔

وَاللّٰہُ الْمُوَفِّق وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

اَحْقَرُ الْعِبَاد

محمد طیب غفرلہٗ ولوالدیہ

مہتمم دار العلوم دیوبند۔ ضلع سہارنپور

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ

(یوم پنجشنبہ)